Ayub Khawar is one of the most renowned contemporary poets from Pakistan, his family name is Muhammad Ayub Khan. He was born in District Chakwal (Punjab) on 12th October, 1948. He did his Master Degree in Urdu Literature from Karachi University in 1974. He worked as Producer, Director and Playwright of drama serials, series, and long plays. He also produced quiz shows, talk shows, musical shows; reality shows and literature based programs. He has authored 5 poetry books. In reward of his huge contribution he was bestowed several awards including Pride of Performance Award of Govt. of Pakistan and several international awards from different military forums.

..... دبستانِ فلم کے نعت نگار .....

دنیائے ادب میں اکرم کنجاہی نے تہلکہ مچا رکھا ہے ان کی ہر کتاب انفرادیت کی حامل ہے۔انھوں نے تحقیق وجستجو اور تنقید میں اپنی بصیرت کا اظہار کر کے لوگوں کو متحیر کر دیا ہے۔ان کا تخلیقی وتحقیقی سرمایہ ملک بھر میں دادِ وتحسین حاصل کر رہا ہے وہ نت نئے مضامین اور موضوعات تلاش کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔خیال آفرینی ایک رویہ ہے جو ہمہ وقت تغیر وتبدل کا شکار رہتا ہے۔یہ ایک ایسا وصف ہے جو کم لوگوں کو نصیب میں ملتا ہے۔اکرم کنجاہی ایک مدت سے لفظوں کے خواب حقیقت میں بدل رہے ہیں۔تحقیق ہماری تہذیبی زندگی کی عکاس ہوتی ہے۔اکرم کنجاہی نے تخلیق اور تحقیق میں حیات وکائنات کے سب رنگ یکجا کر رکھے ہیں۔اُن کے ہاں اسلوب کا نیا پن بہار دکھاتا ہے۔وہ وسیع الظرف انسان ہیں۔فکری، فنی اور تخلیقی سفر میں وہ اکیلے محوِ پرواز نہیں رہتے بلکہ دوسروں کی صلاحیتوں کا دونوں ہاتھوں سے استقبال کرتے ہیں۔ادبی جریدہ ''غنیمت'' اہل سخن کے لیے غنیمت رہا جس میں مختلف موضوعات پر سیر حاصل مقالات منظرِ عام پر آئے۔انسانی زندگی میں طرح طرح کے طوفان آتے ہیں۔شب وروز ہمارے سامنے ایک تماشا ہوتا رہتا ہے۔ایک کامیاب تخلیق کار اور محقق وہی ہے جو سماجی مدوجزر پر نظر رکھتا ہو۔اکرم کنجاہی نے کلاسیکیت اور تجریدیت کی بساکھیوں کا سہارا لینے کے بجائے اپنا راستہ خود تراشا ہے۔

عملی تنقید اگرچہ مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں ہے۔اکرم کنجاہی کا قلم کسی ایک مرکز پر نہیں رکا۔وہ مسلسل عمل میں ہیں۔اب تک ان کی رشحات قلم سے جو شاہکار منظرِ عام پر آئے ہیں ان میں شعری مجموعوں میں ''ہجر کی چتا''، ''بگولے رقص کرتے ہیں''، ''محبت زمانہ ساز نہیں''، ''دامن صد چاک''، ''شاہ کونین! کرم'' شامل ہیں۔تحقیق وتنقید میں ''راغب مرادآبادی''، ''نسائی ادب اور تانیثیت''، ''لفظ، زبان اور ادب''، ''غزل کہانی (پاکستان رائٹرز گلڈ ایوارڈ یافتہ) ''معاصر متغزلین''، ''محاسنِ فکر وفن''، ''پس جدیدیت: لہجے اور اسلوب''، ''غنیمت کے اختصاریے''، ''لاشعور سے شعور تک: شاعری''، ''افہام وتفہیم''، ''تصریحاتِ نعت''، ''دبستانِ فلم کے نعت نگار''، ''معروضات'' (زیرطبع) شامل ہیں۔فن تقریر میں ''اصولِ تقریر''، ''فن خطابت'' شامل ہیں۔تصانیف کے علاوہ تالیف وتدوین کے حوالے سے بھی ان کی کئی کتب منظرِ عام پر ہیں جن میں ''امن وامان اور قومی یکجہتی (دیگر شعرا کی نظموں کا انتخاب)'' ''رضیہ فصیح احمد کے افسانوں کا تجزیاتی جائزہ''، ''جوہرِ عروض'' شامل ہیں۔وہ چونکہ بینک میں ملازم تھے اور اس حوالے سے پیشہ ورانہ کتب بھی تحریر کیں ان میں ''Internal Audit in Banks'' اور ''An Insight into the Banking Frauds'' شامل ہیں۔اس کے علاوہ سہ ماہی ادبی جریدہ ''غنیمت'' بھی شائع کرتے رہے ہیں۔زیرتبصرہ کتاب ''دبستانِ فلم کے نعت نگار'' میں انھوں نے اُن شاعروں کا نعتیہ کلام، اُن کے تعارف اور تبصرے کے ساتھ شائع کیا ہے جو فلمی دنیا سے وابستہ ہیں۔اس تحقیقی کام کے لیے وسعتِ مطالعہ، تجربے اور مشاہدے کی ضرورت پیش آتی ہے۔

فلموں میں وجد طاری کرنے والی نعتوں کو تلاش کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔بلاشبہ یہ ایک بڑا کام ہے جو انھوں نے نہایت عمدگی سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے۔اکرم کنجاہی نے کمال محنت اور جستجو سے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔موبائل اور نیٹ کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے فلم بینی عام تھی۔عوام الناس تفریح کے لیے سینما گھروں کا رخ کرتے تھے۔گیت نگاروں کا طوطی بولتا تھا۔فلمی دنیا سے وابستہ گیت نگاروں نے تاجدارِ حرم ﷺ سے اپنی محبت کے اظہار میں ہدیۂ نعت کے گل ہائے عقیدت نچھاور کیے۔فلموں میں نعتیہ کلام اور قوالیوں نے شائقین پر مثبت اثرات مرتب کیے۔یہ کتاب ''دبستانِ فلم کے نعت نگار'' ایک منفرد نوعیت کی ہے جس کے بارے میں جمیل احمد عدیل نے لکھا ہے:

''اکرم کنجاہی کے پیہم تفحص اور مطالعے نے جو فکری ترفع عطا کیا ہے، اسی کو وہ یہاں بروئے کار لا کر سرخرو ہوئے ہیں۔اس مناسبت سے: صہبا اختر کا مدینہ نعت'' بار بار پڑھے جانے کا لائق مضمون ہے۔اس اعلیٰ تحریر میں اعتقاد اور انتقاد کا امتزاج قاری کے لیے دردکشا کی حیثیت رکھتا ہے لکھنے والے نے زمام شوق نقد کو تھامنے کی بجائے اعتدال وتوازن سے معمور اظہار کو منور نظیر بنا دیا ہے۔''

شاعری من کی دنیا کا اظہار ہے۔زندگی کا ہر شعبہ شعر وسخن کا رنگ قبول کر لیتا ہے۔شاعر بسا اوقات معاشرتی تغیر وتبدل سے خیالات کشید کر لیتا ہے۔رب العالمین اور رحمت للعالمین ﷺ کا ذکر انسان کو روح کی بالیدگی عطا کرتا ہے۔خلوت ہو یا جلوت غیب سے آنے والے مضامین کسی نہ کسی طور شاعر کے داخلی جذبات کی عکاسی کرتے ہیں۔غزل وسعتِ موضوعات کی آئینہ دار ہے۔غزل نے شاعری کی پیشانی پر صد ہار نگوں سے ادب کو منور کر رکھا ہے عصر حاضر میں غزل کے کئی اشعار نعت میں ڈھل جاتے ہیں۔بہت سی غزلیں گیتوں کا روپ دھار لیتی ہیں اور تقدیسی اشعار بھی گیتوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ بہت سی غزلیں اور نظمیں حمد وثناء کے پیرہن میں پہلے گیت اور پھر قوالی کے سانچے میں اپنا رنگ دکھاتی ہیں۔ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے شکوہ جواب شکوہ ہی لیجیے دونوں نظمیں آج قوالی کی صورت میں گائی جا رہی ہیں۔

زندگی کے ساتھ ساتھ

چہارسُو

جلد۳۲، شمارہ: ستمبر، اکتوبر ۲۰۲۳ء

بانی مدیر اعلیٰ

سید ضمیر جعفری

مدیر مسئول

گلزار جاوید

○☆○

مدیرانِ معاون

بینا جاوید

فاری شا

محمد انعام الحق

عروب شاہد

آمنہ علی

مجلسِ مشاورت

○☆○

قارئین چہارسُو

○☆○

زرِ سالانہ

○☆○

دلِ مضطرب نگاہِ شفیقانہ

رابطہ: 537/D-1، گلی نمبر 18، ویسٹرج-III، راولپنڈی، 46000، پاکستان۔

فون: (+92)-51-8730633-8730433

موبائل: (+92)-336-0558618

ای۔میل: chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com

متاعِ چہارسو

سرِورق، پسِ ورق ------ شعیب حیدر زیدی
تزئین ------ عظمیٰ رشید
کمپوزنگ ------ محمد عبداللہ

قرطاسِ اعزاز

حبیب ربِ سحر (نعتیہ قوالی) ------ ایوب خاور ۶
امن کا پھول ------ اعجاز رضوی ۸
وحشت بے نام ------ ایوب خاور ۱۰
خود کلامی ------ ایوب خاور ۱۳
دھڑکتی ہوئی محبت ------ ایوب خاور ۱۴
براہِ راست ------ گلزار جاوید ۱۷
لہو کا مون سون ------ ایوب خاور ۲۴
گلِ موسمِ خزاں ------ احمد ندیم قاسمی ۳۰
آئینے کا عکس ------ ڈاکٹر انور سجاد ۳۱
باقی سب ہوس ------ شکیل عادل زادہ ۳۲
بہت کچھ کھو گیا ہے ------ گلزار ۳۳
خوبصورت خیال کا شاعر ------ عطاء الحق قاسمی ۳۵
خوشبو کے کاغذ ------ انور انصاری ۳۶
گلِ موسمِ خزاں ------ عاصی کرنالی ۳۸
ایوب خاور کی شاعری ------ ڈاکٹر ناہید قاسمی ۴۰
موت کی جمالیات کا شاعر ------ امجد طفیل ۴۲
محبت کی کتاب ------ عارف وقار ۴۴
بادلوں کے رتھ پر سوار ------ ایوب خاور ۴۵

بولتے چہرے

عکسی منظرنامہ ۵۰

افسانے

دوپٹہ ------ محمد بشیر مالیرکوٹلوی ۵۱
چمکیلی روشنی کا منظرنامہ ------ سیمیں کرن ۵۵
الاؤ ------ قمر جمالی ۵۶
پتی ورتا ------ شاہد رضوان ۵۹
چاند رام کی لگائی ------ دیپک کنول ۶۳

اعترافِ عشق

حبیب جالب، محمود شام، نسیم سحر، پنہاں، ڈاکٹر ریاض احمد، اشرف جاوید، ڈاکٹر نبیل احمد نبیل۔ ۶۷

افسانے

دیوی ------ سلمیٰ صنم ۷۱
مزدور کا دن ------ فرخندہ شمیم ۷۳
آن لائن جنازہ ------ مشتاق احمد وانی ۷۴
بغاوت سے پچھتاوے تک ------ افتخار بلوچ ۷۶
حسرت ------ تابش خانزادہ ۸۰

صبح کے آثار

نوید سروش، عنبر نظام، شا کوثر، جواز جعفری، اصغر شمیم، عبدالعزیز، تبسم انوار، حیدر فاروق، ڈاکٹر رینیشا قمر، تیمور حسن، حنیف نجمی، مہناز انجم۔ ۸۱

ناول

خاکِ شفا ------ پیرزادہ آلِ انوار ۸۵

اُفق کے اُس پار

قرض ------ جاوید بسام ۹۶

سرما کے موسم میں

سرمد صہبائی، محمود شام، ثروت زہرا، مدیحہ مغل، رفیق سندیلوی، ثاقب ندیم، تبسم ملیح آبادی۔ ۱۰۰

آئینۂ فن

لولاک ------ انتخاب حمید ۱۰۴

نشانِ راہ

آخری سیلوٹ ------ ڈاکٹر رئیس افضل ۱۱۲

ایک صدی کا قصہ

بابو راؤ پینٹر ------ دیپک کنول ۱۱۴

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین ------ وجیہ الوقار ۱۱۸

☆

قرطاسِ اعزاز

ایوب خاور

کے نام

''حبیبِ ربِ سحر''

نعتیہ قوالی

(راحت فتح علی خاں کے لیے)

ایوب خاور

ابتدائیہ:

یہ کس مقام سے روشن ہوا کہاں تیرا نام
چراغ اور اندھیرے کے درمیاں تیرا نام
ازل مقام سے پہلے ابد مقام کے بعد
جہاں جہاں پہ خدا ہے وہاں وہاں تیرا نام
دلوں کے قفل کھلیں، آنکھ پر کھلیں منظر
حبیبِ ربِ سحر جب بھی لے زباں تیرا نام
میرا جواز فقط یہ کہ اُمتی ہوں تیرا
تیرا جواز کہ ہے وجہِ دو جہاں تیرا نام

استھائی:

در پہ تیرے آ بیٹھا ہے
میرا عشقِ خانقاہی
در پہ تیرے

استھائی کی بڑھت:

تیرے در پہ
بسم اللہ کر کے
فرشِ رحمت پہ بڑی نرمی سے، زانو دھر کے
سرِ تسلیم و رضا کو بھی ذرا خم کر کے
در پہ تیرے آ بیٹھا
میرا عشقِ خانقاہی

گرہ:

اس خانقہہِ دل میں جو یہ عشق کی لَو ہے
اللہ کی قسم صرف ترے نام کی ضَو ہے
در پہ تیرے آ بیٹھا ہے
میرا عشق خانقاہی
در پہ تیرے۔۔۔

بڑھت:

یا رسولؐ اللہ، بنائے لا الٰہ الا اللہ
اے امام الانبیاء، شمس الضحیٰ، بدر الدجیٰ، صدر العلیٰ
نور الہدیٰ، کہف الوریٰ
دھرتی سے تا سات آسماں، سات آسمانوں سے اُدھر، تیرا سفر
تیرا سفر لا انتہا، صلّی علیٰ، خیر الوریٰ
ختم الرسل، مولائے کل اے رہبرِ دنیا و دیں
مسکن تیرا عرشِ بریں، اے وارثِ دنیا و دیں
در پہ تیرے۔۔۔

انترا:

ہونٹوں پہ لرزتی ہوئی بخشش کی دعائیں
دل ہاتھ میں اور آنکھوں میں اشکوں کی جھڑی ہے
در پہ تیرے آ بیٹھا ہے
میرا عشقِ خانقاہی
در پہ تیرے۔۔۔

بڑھت:

تیرا ہی در ہے کہ جس در کے ہم ہیں سارے گدا
یہ چاند اور ستارے، یہ آسماں، یہ زمیں
حجر، شجر، یہ ہوا، سبز جنگلوں کی ہوا
خزاں، بہار، یہ ساون کے بادلوں کی گھٹا
یہ لامکاں، یہ مکاں اور یہ یقین و گماں
یہ آسمان کی چھلنی سے پھوٹنے والی
سنہری دھوپ میں بھی سبز بارشوں کی ردا
فلک کی گود میں لیٹی ہوئی یہ قوسِ قزح
یہ دل

یہ دل بھی تیرے ہی در کا سوالی ہے مولا
اسے بھی ہو تیری نظرِ کرم کا لمس عطا

استھائی:

در پہ تیرے آ بیٹھا ہے
میرا عشق خانقاہی
در پہ تیرے۔۔۔

بڑھت (مختلف وزن کی):

تیرے کرم کی حدیں کائنات سے بڑھ کر
درِ نجات ہے، تیری جناب میرے لیے
عطا ہو سایۂ رحمت کا ایک ہی لمحہ
کہ ایک لمحہ بھی ہے بے حساب میرے لیے

استھائی:

در پہ تیرے آ بیٹھا ہے
میرا عشق خانقاہی
در پہ تیرے۔۔۔

بڑھت:

تیرا جمال، جمالِ خدا کا مظہر ہے
تیری حیات، خدا کی کتاب میرے لیے
کھلے کہیں تیری رحمت کا باب میرے لیے
میں تیرہ بخت ہوں، تو آفتاب میرے لیے

استھائی:

در پہ تیرے آ بیٹھا ہے
میرا عشق خانقاہی
در پہ تیرے۔۔۔

انترا:

میں خاک نشیں، خاک ثمر، بندۂ خاکی
رکھ میرا بھرم، شاہِ امم، جاں پہ بنی ہے
در پہ تیرے آ بیٹھا ہے
میرا عشق خانقاہی

استھائی کی بڑھت کی Repeat:

فرشِ رحمت پہ بڑی نرمی سے، زانو دھر کے
سرِ تسلیم و رضا کو بھی ذرا خم کر کے
در پہ تیرے آ بیٹھا ہے
میرا عشق خانقاہی

انترا:

میں ابنِ غلام، ابنِ غلام، ابنِ غلاماں
تو رروزِ ازل سے سبھی نبیوں کا نبی ہے
در پہ تیرے آ بیٹھا ہے
میرا عشقِ خانقاہی
در پہ تیرے۔۔۔

بڑھت:

حبیبِ ربِ عظیم۔۔۔ مولا
میں جس تماشائے آب و گل سے گزر رہا ہوں
وہ عرصۂ انجماد میں ہے
وہ عرصۂ انجماد جس میں دلوں کی دھڑکن بھی بے صدا ہے
حبیبِ ربِ عظیم مجھ کو خبر نہیں یہ قیام کیا ہے
سجود کیا ہے
سجود کی منزلوں سے آگے وجود کیا ہے
میرے معطل حواس کے روبرو خلا ہے
خلا نے میرا وجود بے وزن کر دیا ہے

انترا:

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقتِ دعا ہے
امت پہ تیری وقت بڑا سخت کڑا ہے
ہے جان بہ لب پھر بھی یہ ٹکڑوں میں بٹی ہے
در پہ تیرے آ بیٹھا ہے
میرا عشقِ خانقاہی
در پہ تیرے۔۔۔

''امن کا پھول''

اعجاز رضوی

(لاہور)

نام : محمد ایوب خاور
قلمی نام : ایوب خاور
پیدائش : ۱۲۔جون ۱۹۴۸ء
مقام پیدائش : چکوال (پنجاب)
ابتدائی تعلیم : گورنمنٹ ہائی اسکول چکوال
میٹرک : مقبول عام ہائی اسکول شرف آباد، کراچی
بی۔اے : نیشنل کالج، کراچی
ایم اے اردو لٹریچر: کراچی یونیورسٹی

ملازمت:

پروڈیوسر، ڈائریکٹر پاکستان ٹیلی ویژن
(۱۹۷۶ء سے ۲۰۰۴ء تک)
جیو ٹی وی ۲۰۰۵ء سے تا ۲۰۱۲ء
(بحیثیت ہیڈ آف دی ڈرامیٹک پروڈکشنز)
ایگزیکٹو ڈائریکٹر، دنیا ٹیلی وژن
(فروری ۲۰۱۳ء سے تا حال)

یادگار پروگرام

۱۔ماہ نامہ:

اردو ادب کا بصری جریدہ، زیرِ ادارت احمد ندیم قاسمی اور اشفاق احمد صاحب

۲۔دانش کدہ:

علامہ اقبال کی طویل نظموں پر مبنی پروفیسر محمد منور صاحب کے لیکچرز اور مشہور مصور اسلم کمال کی تصاویر پر مبنی اُن نظموں کی Visual Interpertation

۳۔ڈراما سیریلز (ڈائریکٹر کی حیثیت سے):

فشار (امجد اسلام امجد)
دن (امجد اسلام امجد)
گرہ (امجد اسلام امجد)
حصار (مرزا اطہر بیگ)
دلدل (مرزا اطہر بیگ)
نشیب (کہانی عبداللہ حسین، ڈرامائی تشکیل مرزا اطہر بیگ)
غریب شہر (اصغر ندیم سید)
کانچ کے پَر (آصف علی پوتا)
ریڈ کارڈ (ایوب خاور)
علی بابا اور چالیس چور (عطاالحق قاسمی)
خواجہ اینڈ سنز (عطاءالحق قاسمی)
اپنے پرائے (عطاءالحق قاسمی)
انکار (امجد اسلام امجد)
پاتال (مرزا اطہر بیگ)

۴۔ڈراما سیریز:

قاسمی کہانی (احمد ندیم قاسمی کی منتخب کہانیوں پر مبنی ڈراما سیریز)
کہانی گھر (معروف افسانہ نگاروں کے افسانوں پر مبنی ڈراما سیریز)
گل زار کلاسیک (فلم ساز، ہدایت کار، شاعر، افسانہ نگار، گل زار کے افسانوں پر مبنی ڈراما سیریز)

۵۔انفرادی ڈرامے:

خرمن (کہانی خدیجہ مستور، ڈرامائی تشکیل خالد احمد)
خوب صورت (منو بھائی)
بازگشت (امجد اسلام امجد)
کیٹ واک (مرزا اطہر بیگ)
چور (کہانی اشفاق احمد، ڈرامائی تشکیل ایوب خاور)
سن سیٹ بلیوارڈ (کہانی، گلزار، ڈرامائی تشکیل ایوب خاور)
مانوس اجنبی (اصغر ندیم سید)
پہلی سی محبت (ڈاکٹر انور سجاد)
کلو (بانو قدسیہ)
امر بیل (بانو قدسیہ)

۶۔بطور ڈراما نگار:

ریڈ کارڈ (سیریل)
چور (اشفاق صاحب کی کہانی پر مبنی)
سن سیٹ بلیوارڈ (گل زار کی کہانی پر مبنی)
بادشاہت کا خاتمہ (منٹو کی کہانی پر مبنی)
دشتِ تنہائی (طبع زاد)
ایھا الناس (طبع زاد)
پہلا چاند (سیریل)
گل زار کلاسک (گل زار کی کہانیوں پر مبنی سیریز)
جو زف نہیں مانتا (طبع زاد)
جیو تو ایسے (طبع زاد)

اہم ایوارڈ:

پی ٹی وی نیشنل ایوارڈ (۷۔بار)
گریجویٹ ایوارڈ (۸۔بار)

نگار ایوارڈ (ایک بار)
بولان ایوارڈ (۳۔بار)

شاعری:

۱۔ گل موسم خزاں (پہلا مجموعہ)
۲۔ تمہیں جانے کی جلدی تھی (دوسرا مجموعہ)
۳۔ بہت کچھ کھو گیا ہے (تیسرا مجموعہ)
۴۔ محبت کی کتاب جو فلم/ ٹیلی ویژن ڈرامے کے انداز میں شاعری کی کتاب ہے جس میں ہدایات بھی شعری پیرائے میں درج کی گئی ہے۔
۵۔ Symphony
۶۔ Love

دس بارہ افسانے بھی لکھے ہیں جو ابھی تک کتابی شکل میں نہیں آ پائے۔ایک فلم کی کہانی لکھی جو کامیاب فلموں میں شمار کی جاتی ہے۔

گیت:

- بہت سارے گیت لکھے خاص طور پر نصرت فتح علی خاں صاحب کے لیے فلم بینڈٹ کوئن کا گیت ''سجنارے''
- فلم ''پلکوں کی چھاؤں میں'' کے لیے ایک دوگانا جو اُس سال کا بہترین گیت کہلایا
- ''میری پلکوں میں اک سپنا تھا''
- فلم ''دل تو پاگل ہے'' کا بہت کامیاب اور مشہور گیت ''تو ہے چاند اور میں ہوں چاندرات''
- اور فلم ''میں اک دن لوٹ کے آؤں گا'' کا تھیم سونگ ''میں اک دن لوٹ کے آؤں گا''
- فلم ''سلاخیں'' کا گیت ''ممکن ہی نہیں'' اور تھیم سونگ ''سلاخیں'' بہت مقبول ہوئے۔

ٹیلی ویژن کے ڈراما سیریلز کے بہت سارے تھیم سونگ جو کافی تعداد میں ہیں اور ڈراما دیکھنے والوں میں بے حد مقبول ہیں۔خاص طور پر پہلی سی محبت، نشیب، دھند، مانوس اجنبی، غریبِ شہر، یہ بھی کسی کی بیٹی ہے، کاجل، آسمان چھونے دو، پہلا چاند، گل زار کلاسیکس، تنویر فاطمہ (BA)، ملکہ ماسی، کہی ان کہی، تھوڑی سی وفا چاہیے، دیا جلے، کچرا کنڈی جیسے معروف ڈرامے شامل ہیں۔

حالیہ ملازمت:

جیو ٹی وی (ہیڈ آف دی ڈرامیٹک پروڈکشنز) جوزف نہیں مانتا اور جیو تو ایسے، دو لانگ پلے ڈائریکٹ بھی کیے اور لکھے بھی۔اس کے علاوہ ''پہلا چاند'' سیریل کا اسکرپٹ بھی لکھا جسے لکس ایوارڈ مل چکا ہے۔جیو میں انگریزی فلم ''دی میسیج'' کی اُردو ڈبنگ کر کے دنیا بھر کے دیکھنے والوں کو یہ مقدس فلم دکھانے کا اہتمام کیا جب کہ یہ فلم دنیا کے تمام مسلم ممالک بشمول پاکستان میں ممنوع ہے۔

☆

عالمِ بیداری

ایوب خاور اپنا شعری تجربہ خارج میں موجود معاشرتی تضادات اور شعورِ ذات کے اُن مضافات سے کشید کرتا ہے جہاں آج کا انسان اپنے آپ کو اندرونی سطح پر کئی حصوں میں بٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔یہ مضافات وجود کی دوئی اور عدم اور وجود کی باہم ستیزہ کاری کے مضافات ہیں تاہم فکر کی یہ عمیق رَو اور زندگی کے بارے میں اس کا حکیمانہ طرزِ عمل اُسے اس شعری غنائیت Poetic Lyricism کے قرب و جوار سے دور نہیں لے جاتا جو کسی بھی زبان کی شاعری کا ایک بنیادی اور اہم جزو متصور ہوتی ہے۔

عصری اعتبار سے ایوب خاور کسی دیومالائی عہد کا متلاشی نہیں۔وقت کی حیثیت اُس کے شعری عمل میں ادکتاوَپاز کی زبان میں ساعت سیّار کی نہیں، ساعتِ مطلق کی ہے۔عصر کا تصور اس کے ہاں اپنی کلیت میں ایک ایسے لمحے، ایک ایسے پَل کی صورت میں ملتا ہے جہاں تمام ابتدائیں اور انتہائیں مل کر اُس کے لیے ایک نئی شعری معنویت تخلیق کرنے کا سبب بنتی ہیں، جہاں صداقت اپنے وجود کی نفی سے اپنا اثبات پیدا کرتی ہے۔یہ ایک ایسا خواب آمیز عالمِ بیداری ہے جہاں انسان خود اپنا وجود ہو کہ ذات یا پھر اپنی کوئی تازہ لکھی ہوئی نظم خود اپنے سوادِ حیات میں رکھ کر بھول جاتا ہے۔یہ احساسِ خود فراموش، یا برونِ وجود میں زندگی کو یاد رکھنے کا سلسلہ ایوب خاور کے ہاں ملارمے کی تقلید میں اردو نظم لکھنے والے ان شعرا سے یکسر مختلف ہے جن کی علامتیں محض ذاتی اور اردو شاعری کی مستند عمومی روایت سے منقطع ہونے کے ناتے ایک طرح کے احساسِ تنہائی کا شکار نظر آتی ہیں۔

درونِ ذات کا فساد ہو کہ خارج میں موجود کوئی عصری تضاد، ایوب خاور غیر ضروری مرصع کاری سے اجتناب کرتے ہوئے ایک انقلابی نوعیت کی شعری منطق (Syllogistics) کی بنیاد رکھتا ہے اور اپنے نو بہ نو موضوعات کے صغریٰ، کبریٰ اور نتائج کی منطقی اشکار کو انتہائی فنی مہارت سے آشنا کرتا ہے اور اس طرح نظمِ جدید کی اس عمارت کی تکمیل میں مصروف دکھائی دیتا ہے جس کے بام و در سے گزرتی ہوئی تازہ ہوا میں خود اُس کے اپنے انفاس کی رَو شامل ہے۔

اختر حسین جعفری

"وحشتِ بے نام"

ایوب خاور

ضبط کرنا نہ کبھی ضبط میں وحشت کرنا
اتنا آساں بھی نہیں تجھ سے محبت کرنا

تجھ سے کہنے کی کوئی بات نہ کرنا تجھ سے
کنجِ تنہائی میں بس خود کو ملامت کرنا

اک بگولے کی طرح ڈھونڈتے پھرنا تجھ کو
روبرو ہو کے تو نہ شکوہ نہ شکایت کرنا

جمع کرنا تہہ مژگاں تجھے قطرہ قطرہ
رات بھر پھر تجھے ٹکڑوں میں روایت کرنا

کام ایسا کوئی مشکل تو نہیں ہے خاور
مگر اک دست حنا رنگ پہ بیعت کرنا

..... ○ .....

☆

کس موج میں ہے راہ سے بھٹکا ہوا دریا
صحرا کی طرح دل میں اُترتا ہوا دریا

اے حسنِ دلِ آرا کبھی تُو نے بھی ہے دیکھا
پلکوں تلک آ آ کے پلٹتا ہوا دریا

ہم جس کی بپھرتی ہوئی موجوں میں رواں تھے
دیکھا ہے پھر اِک بار وہ دیکھا ہوا دریا

اِک دن تیری آنکھوں کے کناروں سے بہے گا
بادل کی طرح دل سے لپٹتا ہوا دریا

اِک وحشتِ بے نام نہیں چھوڑتی دل کو
اک ہجر ہے اور ریت کا اُڑتا ہوا دریا

کیا جانئے، کس رنگ میں، کس گھاٹ لگے گا
یہ سنگ و شجر روند کے جاتا ہوا دریا

پھر حرفِ رگِ دل کی تہوں میں سے نکل کر
آیا ہے سرِ چشم اُمڈتا ہوا دریا

○

☆

پوچھتے ہو کہ یہ کیا رکھا ہے آئینے میں
ایک جادو سا جگا رکھا ہے آئینے میں

یہ جو میلہ سا لگا رکھا ہے آئینے میں
کون مہمان بلا رکھا ہے آئینے میں

ایک صحرا تو مرے سینے میں بَل کھاتا ہے
دوسرا لا کے بچھا رکھا ہے آئینے میں

ایک فتنہ جو ستاتا تھا بہت پہلو میں
تھپکیاں دے کے سُلا رکھا ہے آئینے میں

اک دِیا رات کی چوکھٹ سے لگا بیٹھا ہے
اک دِیا ہم نے جلا رکھا ہے آئینے میں

نیند تعبیر کے جھونکوں میں اُڑی جاتی ہے
خواب کو ہم نے جگا رکھا ہے آئینے میں

آ کے دیکھو تو سہی جانِ جہاں! جہانِ جہاں!
ہم نے اک پھول کھلا رکھا ہے آئینے میں

○

زوالِ شب ہے ستاروں کو گرد ہونا ہے
پسِ نگاہ ابھی ایک غم کو رونا ہے

اب اس کے بعد یہی کارِ عمر ہے کہ ہمیں
پلک پلک میں تیری یاد کو پرونا ہے

یہی کہ سلسلہ نارسائی ختم نہ ہو
سو جس کو پا نہ سکے ہم، اسی کو کھونا ہے

جو لفظ کھل نہ سکیں آئینے پہ، مٹی ہیں
جو بات دل پہ اثر کر سکے، وہ سونا ہے

تو اس کو توڑنا چاہے تو توڑ سکتا ہے
کہ زندگی ترے ہاتھوں میں اک کھلونا ہے

بس ایک چشمِ سیہ بخت ہے اور اک تیرا خواب
یہ خواب، خواب نہیں اوڑھنا بچھونا ہے

سفر ہے دشت کا اور سر پہ رختِ تنہائی
یہ بار بھی اسی عمرِ رواں کو ڈھونا ہے

.....○.....

☆

کوئی تو ساز ہونا چاہیے تھا
جو ہم آواز ہونا چاہیے تھا

کسی روز ایک صبحِ صندلیں میں
سفر آغاز ہونا چاہیے تھا

قدم رکھ کر دلِ بے مدعا پر
نہیں ناراض ہونا چاہیے تھا

بلندی کی طرف اُٹھنے سے پہلے
پرِ پرواز ہونا چاہیے تھا

خیال آیا ہے اب جا کر، ہمیں بھی
زمانہ ساز ہونا چاہیے تھا

اب اِس بے مہر تنہائی میں خاورؔ
کوئی دَم ساز ہونا چاہیے تھا

○

☆

عشاق بہت ہیں ترے بیمار بہت ہیں
تجھ حسن دل آرام کے حق دار بہت ہیں

اک سنگ صفت! آ کے سرِ بام ذرا دیکھ
اک ہم ہی نہیں، تیرے طلب گار بہت ہیں

بے چین کیے رکھتی ہے ہر آن یہ دل کو
کم بخت محبت کے بھی آزار بہت ہیں

ڈھونڈو تو کوئی سچ کا پیمبر نہیں ملتا
دیکھو تو یہاں صاحبِ کردار بہت ہیں

لکھیں تو کوئی مصرعہ تر لکھ نہیں پاتے
اور غالب خستہ کے طرف دار بہت ہیں

خاور اسے پا لینے میں کھو دینے کا ڈر ہے
اندیشہ وحسرت کے میاں خار بہت ہیں

○

سات سروں کا بہتا دریا تیرے نام
ہر سر میں ہے رنگ دھنک کا تیرے نام

جنگل جنگل اڑنے والے سب موسم
اور ہوا کا سبز دوپٹہ تیرے نام

ہجر کی شام، اکیلی رات کے خالی در
صبح فراق کا زرد اُجالا تیرے نام

تیرے بنا جو عمر بتائی، بیت گئی
اب اس عمر کا باقی حصہ تیرے نام

اب شاعر آنکھوں نے جتنے رنگ چنے
ان کا عکس اور مرا چہرا تیرے نام

دکھ کے گہرے نیلے سمندر میں خاورؔ
اس کی آنکھیں ایک جزیرہ تیرے نام

.....○.....

☆

آئینے میں عکس ڈھل رہا ہے
پانی میں چراغ جل رہا ہے

آنکھوں میں غبار منزلوں کا
قدموں میں سراب چل رہا ہے

ہم اس کے مزاج آشنا ہیں
جو بات کا رخ بدل رہا ہے

اے لذت ہجر یاد رکھنا
یہ لمحہ وصل گھل رہا ہے

اک تم کہ ہو بے خبر سدا کے
موسم ہے کہ ہاتھ مل رہا ہے

خاورؔ کوئی یاد آ گیا کیا!
سینے میں یہ کیا پگھل رہا ہے

○

☆

کوئی کیا دیکھ پائے گا یہ پامالی مرے دل کی
سخن سازی مرے دل کی، بھری خالی مرے دل کی

یہ زخمِ نارسائی گرچہ گہرا بھی ہے، کاری بھی
بچائے گی مگر مجھ کو، کہن سالی مرے دل کی

ابھی تو صورتِ مجنوں سرِ صحرا بھٹکتا ہے
تم آؤ گے تو لوٹ آئے گی خوش حالی مرے دل کی

یہ عشق و آگہی کم بخت بھی اک مستقل شے ہے
بہت بوجھل سی رہتی ہے سبک سالی مرے دل کی

ابھی تو سانس چلتی ہے، یہ آنکھیں نَم بھی رہتی ہیں
اب آگے کیا دکھائے گی زبوں حالی مرے دل کی

یہ ضربِ درہم و دینار کی ہے کار فرمائی
کئی نسلوں کے دل تک جائے گی لالی، مرے دل کی

○

خودکلامی

ایوب خاور

پچھلے کئی دنوں سے سوچ رہا ہوں اور اس وقت بھی بہت دیر سے قلم ہاتھ میں لیے اپنے آپ سے الجھ رہا ہوں۔ بات اپنے بارے میں کہنی ہو تو اپنے بارے میں کم بولنے والے بہت ہی کم بولنے والوں کا یہی حال ہوتا ہے جو اس وقت میرا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہم جیسے لوگوں کے لیے ''اظہارِ ذات'' ہمیشہ ہی سے ایک مسئلہ رہا ہے۔ کیا کہنا ہے اور اسے کیسے کہنا ہے، کہنا بھی ہے کہ نہیں، اسی پیش و پس میں وقت کا بیشتر حصہ گزر جاتا ہے اور دل کی دل میں رہ جاتی ہے۔ ورنہ تو یار لوگ ایک ایک ہفتے میں پورے کے پورے شعری مجموعے بازار میں لے آتے ہیں، پتا نہیں کیسے بہرحال یہ ان کا مسئلہ ہے۔

میرے اندر جو تخلیقی انسان ہے وہ بہت سارے ٹکڑوں میں بٹا ہوا ہے، میرے اندر کا شاعر اور ڈراما پروڈیوسر، ڈائریکٹر ہر لحہ ایک دوسرے سے گتھم گتھا رہے ہیں، بیچ میں ایک محبت ہے جو ہر دو فریقوں کے مساموں سے پھوٹتی ہے اور میری نظموں اور غزلوں کے ساتھ ساتھ میرے ڈراموں کے کرداروں، کیمرے کے فریموں میں اور جذبات و احساسات کی Visual Interpetations کی مختلف سطحوں میں کارفرما نظر آتی ہے۔

پاکستان ٹیلی ویژن نے خدا کے فضل و کرم سے مجھے بہت نام دیا ہے۔ یہ میری محنت، مسلسل محنت، لگن اور خود احتسابی کا ثمر ہے۔ میرے ڈائریکٹ کیے ہوئے مشہور ڈرامے، سیریلز اور لانگ پلیز کا Impact ٹیلی ویژن دیکھنے والوں کے دلوں میں ہے۔ جن میں ڈراما دن، حصار، فشار، خواجہ اینڈ سن، قاسمی کہانی، دلدل، کہانی گھر اور نشیب جیسے سیریلز ہیں جو میرے لیے باعثِ افتخار ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر ایک ڈائریکٹر اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ایک اچھا سیریل پروڈیوس کرتا ہے تو وہ دراصل ایک اچھی کتاب تخلیق کرنے کے برابر ہے اگر آپ یہ مان لیں تو میری کئی کتابیں آ چکی ہیں جن کو دیکھ کر میرے ویورز نے بارہا میری تخلیقی اپج کی داد دی ہے۔ یوں دیکھا جائے تو ٹیلی ویژن نے میرے Creative Self کو زیادہ اپنے تصرف میں رکھا اور شاعری۔۔۔ حقیقت تو یہ ہے کہ شاعری میری محبت ہے لیکن میں اس سے محبوب جیسا نہیں محبوباؤں جیسا سلوک کرتا ہوں۔ شاعری کو میں نے اس وقت تک گلے نہیں لگایا جب تک اس نے ضدّی بچے کی طرح نوچ نوچ کر اور لپٹ لپٹ کر مجھے اپنے جیسا نہ کر ڈالا۔ چنانچہ میں نے جو کچھ لکھنے کی کوشش کی اس میں ''شدت اظہارِ ذات'' ہی کا مسئلہ رہا۔ کم لکھ پاتا ہوں کیوں کہ اظہار کی شدت لفظوں کے خول توڑ کر ان میں سناٹا بھر دیتی ہے۔ پھر دیر تک خشک جنگل کی طرح گونجتا رہتا ہوں۔ ایسے میں کوئی کیا لکھے اور کیسے لکھے۔

میری پہلی کتاب ''گلِ موسمِ خزاں'' بہت دیر میں چھپی اور اگر خالد احمد میرا دوست نہ ہوتا تو پتا نہیں کب چھپتی، کبھی نہ چھپتی۔ بہ ہر حال یہ خالد احمد کا کمال ہے کہ اس نے ''گلِ موسمِ خزاں'' کو ترتیب دیا اسی کی طعن و تشنیع کے نتیجے میں کئی نظمیں اور غزلیں مجھ سے سرزد ہوئیں، میں بے حد شکر گزار ہوں خالد احمد کا کہ وہ مجھے جب بھی ملا، کہیں بھی ملا، مجھے اپنی شاعری اس کی انگلی تھامے مجھ سے ناراض ناراض، منہ بسورتے ہوئے نظر آئی۔ یہ اکثر مجھ سے ٹی وی ڈراموں کے ہجوم میں کھو جاتی ہے لیکن خالد احمد نے اسے کبھی اِدھر اُدھر بھٹکنے نہیں دیا۔ کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے میرے پاس ہی لے آتا ہے، پھر مجھے ڈانٹتا ہے کہ سنبھالو اسے، بہت ظالم ہیں لوگ، چرا لیتے ہیں اگر کسی نے لمبا ہاتھ مار لیا تو کیا بچے گا تمہارے پاس۔ ندیم صاحب کو کیا منہ دکھاؤ گے۔ گل زار صاحب کو اور منصورہ کو کیا جواب دو گے۔ میں شکر گزار ہوں خالد احمد کا اس کی سرزنش مجھے لکھنے کی طرف مائل کرتی ہے۔

اس کتاب کا دیر سے آپ تک پہنچنا میری لاپرواہی کا دوسرا واقعہ ہے۔ اس کتاب کا کتابت شدہ مسودہ صفدر حسین نے ایک سال پہلے میرے حوالے کیا اور اس کے پروف پڑھنے کے باوجود یہ میرے پاس پڑا رہا اور میں ٹیلی ویژن میں ڈرامے تخلیق کرتا رہا۔ بھلا ہو صفدر حسین کا کہ میرے پیچھے پڑ پڑ کے مسودہ اس نے دوبارہ اپنے قبضے میں کیا، ورنہ میں نے تو اس کے نہ چھپنے کے سارے اسباب پیدا کر دیے تھے۔ اندازہ لگا لیجیے کہ اس نے مجھے یرغمالیوں کی طرح اپنے دفتر میں بٹھا کر یہ صفحے مجھ سے لکھوائے اور چائے کے زور پر فہرست بنوائی اور کتاب چھاپ کر آپ تک پہنچانے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے ہاتھ تو خالی کر دیئے نا اس لے۔۔۔ بھلا ہو اس کا۔۔۔

یہاں پہنچ کر جی چاہتا ہے کہ خالد احمد کے اخلاص، مروّت اور وفا کو اپنے الفاظ میں خراج پیش کروں:

ترے بنا جو عمر بتائی بیت گئی
اب اس عمر کا باقی حصہ تیرے نام

ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں

متاعِ جاں بس اک خوشبو ہے اس کے نام کی خاور
اب اس خوشبو کے پیچھے زندگی بھر بھاگتے رہنا

☆

"دھڑکتی ہوئی محبت"

ماریہ میرا گلیا (اٹلی)
ترجمہ: ایوب خاور

میدان جنگ

تم محبت کو مسترد کر سکتے ہو
نہ زندگی کو الوداع کہہ سکتے ہو
اور نہ اُسے پھینک سکتے ہو، استعمال شدہ کسی غیر ضروری شے کی طرح
محبت نہیں چھوڑے گی
چاہے کسی نقصان کا خدشہ تمہیں اس سے دور ہو جانے ہی کی
ترغیب کیوں نہ دے
بے شک آزما لو
چھو کر دیکھو اپنے دل میں دھڑکتی ہوئی محبت کو
پتہ چل جائے گا کہ یہ کتنی ضدّی ہے
غور سے دیکھو اپنے چاروں طرف
یہ تمہیں ہر طرف نظر آئے گی
یہ آئے گی تمہیں صبح بخیر کہنے اور رات کو تمہارے ماتھے پر
بوسہ دینے کے لیے بھی
محبت ایک بے تکان جنگجو ہے جو اعلان جنگ کرتی ہے
ہر دلیل اور ہر منطق کے خلاف
سوچ سمجھ کر تیار کرتی ہے حکمت عملی، اپنی جیت کو یقینی بنانے کے لیے
محبت خود پسند بھی ہوتی ہے، خود پرست بھی اور خود سر بھی
محبت ایک نرم و نازک تتلی جیسی ہے
مگر یہ ایک عظیم جنگ کا آغاز بھی کر سکتی ہے، پہاڑ جیسے ہاتھی کے خلاف
موسم گرما کے حبس بھرے دنوں میں بے تاب کر دیتی ہے اچھے بھلے
صحت مند جانور کو
اور موسمِ بہار میں
بھنورے کی طرح۔ پھولوں کا امرت رس چوسنے کا منظر تو دیکھا ہوگا
میری جان تمہارا دل از خود ایک میدان جنگ ہے
تم سے بہتر کون جانتا ہے

میرے لیے محبت کی نظم لکھو

میرے لیے لکھو
محبت کی ایک نظم
جب چاند آسمان کے گنبد میں ستاروں کے بٹن ٹانک رہا ہو
جب ہوا کے نرم جھونکے
درختوں کی اونچی شاخوں میں جھوم جھوم کر محبت کا گیت گا رہے ہوں
میرے لیے محبت بھرے لفظوں سے ایک نظم لکھو
جب جذبات کی موجیں پھولوں جیسے معصوم بچوں کے ہجوم کی طرح
خوشی سے کھلکھلا رہی ہوں
لکھو
ایک ایسی نظم، جیسے صبحِ صادق کی پہلی کرن
چڑیوں کی دھیمی چہچہاہٹ کا لمس پا کر آنکھ کھولتی ہے
ایسی نظم جس کا رسیلہ پن دستک دیے بغیر
دلوں کی کھڑکیاں کھول دے اور محبت کی تاثیر میں
ڈوبے ہوئے سُروں کو ہماری دھڑکنوں کی لے میں
ایسے شامل کر دے، جیسے صبح صادق کی شبنم کے قطرے
نیند بھری پھولوں کی پتیوں پر
دور تک پھیلے میدان میں آئینوں کی طرح دمکتے ہوں
بس لکھتے رہو
محبت کے رس میں گوندھے ہوئے لفظوں سے
میرے لیے ایک نظم
ایک بوسے کی طرح طویل
جیسے آسمان اور زمین ازل سے آج تک افق کی گولائی میں
ایک دوسرے کے ہونٹوں پر ہونٹ رکھ کر
ازل سے ابد تک پھیلی سانسوں کی صدیاں بتائے چلے آ رہے ہیں

موجود سے لاموجود تک

آئینے کی طرح چمکتے ہوئے بلوریں گلاس
شفاف ٹیبل پر پھولوں سے سجے گلدانوں کے درمیان
سلیقے سے رکھے ہیں
معزز مہمان نفیس لباسوں میں ملبوس، دھیمے لہجے میں گفتگو کر رہے ہیں
باغ میں ہلکی پھلکی کومل سروں سے سجی موسیقی نے
فضا کو خوابناک بنا رکھا ہے
تم بیٹھی ہو کسی حد تک الگ ایک کرسی پر
اور دیکھ رہی ہو، دور خلا میں کہیں کسی اَن دیکھی اور غیر مجسم شے کو
تمہاری آنکھیں کبھی شفق رنگ، کبھی سرمئی، کبھی نیلگوں اور کبھی
خزاں رنگ ہو رہی ہیں
تمہاری روح تمہارے وجود میں تنہا
وقت اور زمانے سے اُس طرف
موجود سے لاموجود کے خواب میں اوپر کی طرف محوِ پرواز ہے
بادل تمہیں راستہ دیے جا رہے ہیں
اور پرندے تمہیں تمہاری منزل کا پتہ دے رہے ہیں
لاموجود میں موجود، جنت تمہاری منتظر ہے
اور تم نے اپنے ہونٹ ناقابل بیان نرمی سمیت
اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے
اور چھو لیا ہے اس کے ماروائی چہرے کے ان دیکھے نقوش کو

○

مٹی کی گڑیا

تم چلے گئے مجھے چھوڑ کر
اگست کی ایک اداس شام کی ملگجے میں
چاند کی کرنیں سلگ رہی تھیں، تمہارے بالوں کی سیاہ شام میں
جب میری آنکھیں تعاقب کر رہی تھیں، تمہیں ایک جانے پہچانے
راستے پر جاتے ہوئے
تمہارے سیاہ بال اور نرم و نازک مہین لباس
دونوں
ہوا کے جھونکوں میں گھُل مِل کر محوِ رقص تھے
تم ایک مضبوط ارادے کے ساتھ جا رہے تھے، آنے والی دنیا میں
قدم رکھنے کے لیے
اور میں اُن یادوں میں کھو گئی جو تمہاری آنکھوں کے سیاہ سمندر کی
لہروں پر ٹمٹمایا کرتی تھیں

وہ محبت سے بھری راتیں معدوم ہو گئی ہیں، موسمِ گرما کی ایک شام میں
کیا تم محبت کرتے تھے مجھ سے؟
تم کیوں رہنا چاہتے تھے میرے ساتھ؟
تم نے محبت کو جذبات سے لبریز صرف ایک انگڑائی سمجھا
مگر زندگی صرف ایک انگڑائی کے جتنی طویل تو نہیں ہوتی
تم نے پھر بھی مجھے ایک میٹھی اور خوابناک تھکن سے لدی انگڑائی سے
زیادہ کچھ نہ جانا
اور ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا
تنہائی کے صحرا میں
کیا میں تمہاری اس سرد خاموشی کو کبھی سمجھ پاؤں گی
جو مٹی سے بنی ایک خوبصورت گڑیا کی طرح خاموش
دکھوں کی دہکتی ہوئی انگیٹھی کے سامنے بے نیاز بیٹھی ہے!
جو راکھ کر رہی ہے میرے اندر کو لمحہ بہ لمحہ

تم کیسی الجھن میں ہو
کیا تم مجھے مار دینا چاہتے ہو
پلٹ کر واپس آنے کی خواہش کا اظہار کیے بغیر
یکجا ہو کر ایک نئی صبح کا سورج طلوع ہوتا دیکھے بغیر
ایک بے زبان سائے کی طرح دھیرے دھیرے مدھم ہوتے ہوئے
پھول کی پتیوں سے رنگ کی طرح اڑ جانا چاہتے ہو

آسمان سے اُس طرف

میں آئینوں کی طرح جھلملاتے ہوئے
ستاروں سے بھرے آسمان کو دیکھ سکتی ہوں
روشن ستارے
حدنگاہ تک پھیلے ہوئے نیلے آسمان کی چادر پر
ایک طوفانی رات میں، جب ہوا کے پاگل ہوتے جھونکے
ٹھٹھرتے ہوئے درختوں کی شاخوں کے پتوں سے
شبنم کا لڑھکتا ہوا آخری قطرہ بھی مٹی میں ملادیں
اُس وقت میں واپس بجانا چاہتی ہوں
اندھے اندھیرے میں لپٹی ہوئی رات کی اُس گہری خاموشی میں
اب بھی تمہاری آنکھوں میں سلگتے ہوئے جذبات کو
اگر میں دیکھ سکوں
تو ننگے پاؤں، یادوں کے دور تک پھیلے ہوئے کھنڈرات کو
پار کرتے ہوئے پہاڑوں کی چوٹیوں تک کو میں چھوسکتی ہوں
اگر تم بھی میری جستجو میں ایک بہادر جنگجو کی طرح
وہاں میرے منتظر ملو
وصل کا پیالہ پینے کے لیے
میری محبت کو جیت کر مجھے واپس لوٹانے کے لیے

○

اے میری ماتا بھری ماں

کچی اور اونچی نیچی گلی میں
میرے پاؤں ریت میں دھنس رہے ہیں
میں بڑی ہمت کر کے کچھ روشن اور کچھ نیم اندھیرے راستوں پر
جارہی ہوں
اپنے کاندھوں پر اپنا ہی بوجھ لادے
زندگی بھر کا دکھ سمیٹے
ہمیشہ کے لیے بچھڑ جانے والوں کا دکھ سمیٹے،
جنہیں میں کبھی بھلا نہیں سکتی
یادوں بھری رات کے سایوں کی طرح
ناقابلِ گرفت اور غیر مرئی خیالات دیکھ رہے ہیں راستہ،
کسی انجانے سچ کا
پیاری ماں، کہیں بہت دور
ہوسکتا ہے کوئی اور بچہ دوبارہ پیدا ہو ایک نئی زندگی لے کر
بھولے، بھٹکے راستوں پر نہ ختم ہونے والے سفر کے لیے
اے میری ماتا بھری ماں، کیا تمہاری پاکباز روح
بجھ جانے والے شمع دانوں کے آس پاس
اڑتے ہوئے دھوئیں میں تحلیل تو نہیں ہوگئی
کیونکہ ہوا کی سانس، تمہاری سانس کی مہک سے خالی ہورہی ہے!

○

براہِ راست

ایوب خاور کو صحیح معنوں آرٹ لور (Art Lover) کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ایک ایسا آرٹ لور (Art Lover) جو فنونِ لطیفہ کی اَن گنت اور لاتعداد اصنافِ ادب پر نہ صرف قدرت رکھتا بلکہ اُن کی نفاست، نزاکت، ترتیب وپیشکش میں بھی کمال وتمام کا حامل ہے۔

ادارۂ چہارسو کے لیے یہ امر باعث صد افتخار ہے کہ ہم اپنے دور کے نامور شاعر، ڈرامہ نگار اور ڈرامہ ساز کی خدمت میں قرطاسِ اعزاز پیش کر کے طمانیت حاصل کر رہے ہیں۔ایک طرح سے ہماری یہ کوشش اور کاوش آپ کی ذوقِ طبع اور ذوقِ لطیف کی ضیافت کا اہتمام بھی ہے جس کی قبولیت اور پسندیدگی، ہمیں اور ہمارے رفقائے کار کو نئے حوصلے، نئے عزم سے سرشار کرسکتی ہے بقول ایوب خاور:

پوچھتے ہو کہ یہ کیا رکھا ہے آئینے میں
ایک جادو سا جگا رکھا ہے آئینے میں

.....گلزار جاوید

☆ اسے اتفاق بلکہ حسن اتفاق کہیے کہ راولپنڈی میں مقیم ہونے کے باوجود ہم نے آج تک چکوال نہیں دیکھا، شاید اس لیے کہ آپ کی اُنگلی تھام کر چکوال کے وہ تمام گلی کوچے دیکھنے اور محسوس کرنے کا موقع نصیب میں لکھا تھا جہاں آپ نے نہ صرف آنکھ کھولی بلکہ بچپن کے سہانے دن بھی گزارے؟

☆☆ میرے لیے بھی یہ حسنِ اتفاق ہے کہ آپ کے پہلے سوال ہی نے مجھے اپنے آبائی گاؤں جو اس زمانے کی تحصیل چکوال سے آتے ہوئے، دو ڈھائی میل دور اوڈھروال تھا جہاں میں ملیں وہ سڑک جو مرید، تلہ گنگ اور پھر اس سے کچھ اور آگے کے قصبوں کو چھوتی ہوئی آگے نکل جاتی تھی۔ کہاں جاتی تھی میں اس لیے ٹھیک سے نہیں بتا پاؤں گا کہ اُس طرف جانے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ چکوال سے اوڈھروال آتے ہوئے میجر صاحب کا بنگلہ جو مقامی ریٹائرڈ فوجیوں اور دور پار سے آئے مہمانوں کی آماجگاہ بھی تھا۔

حسنِ اتفاق کہ میرا گھر لب سڑک تھا، میرے والد صاحب جو لانس نائیک کے عہدے سے فارغ ہو کر کراچی جا چکے تھے اور ہمارے تایا حوالدار کے عہدے سے ریٹائر ہوئے وہ ان ان کی فیملی مل جل کر زندگی بسر کر رہے تھے۔ گاؤں کے اسکول سے پھر چکوال کے ہائی اسکول پانچویں اور چھٹی کلاس میں نے پاس کی تو والد صاحب جن کا نام محمد یعقوب خان اور میں ان کا پہلوٹی کا بیٹا محمد ایوب خان اپنے والد صاحب کے بلانے پر کراچی بھیج دیا گیا۔ یہ ایک بہت ہی پُر امن زمانہ تھا، سردیوں کی ''دیگر ویلے'' والی بال کی گیم ہمارے بڑے شوق سے کھیلا کرتے تھے اور مجھ جیسے بچے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ اُس وقت تک جب تک شام کے دھندلکے کو چیرتی ہوئی میری ماں غلام فاطمہ کی آواز مجھے گھر کے صحن تک کھینچ نہ لاتی۔ سردی کے موسموں میں ہمارے گاؤں کا داستان گو (نام یاد نہیں) اکثر ہمارے گھر کے بڑے کمرے میں بیٹھ کر ہم سب کو کہانیاں سنایا کرتے تھے۔

ہمارے گاؤں کے بیچ میں سے نیلا دُلاّ جانے والی ایک کچی سڑک ہمارے گاؤں کے قبرستان کو چھوتی ہوئی اگلی منزلوں کی دھول میں گم ہو جایا کرتی تھی۔

ہمارے گاؤں کی جامع مسجد میں ہمارے علاوہ آس پاس کے دوسرے گاؤں کے بچے بھی درسِ قرآن لیتے تھے اور اُن میں سے چند بچے اپنے کاندھوں سے کپڑے کے جھولے لٹکائے اپنے اپنے منتخب محلوں میں جا کر اپنے لیے کھانا اکٹھا کرنے کا فرض بھی ادا کرتے تھے۔

کبھی کبھی چکوال اور راولپنڈی کی طرف سے سماج سدھار کی ٹیمیں بھی آیا کرتی تھیں جو معلوماتی فلموں کے علاوہ اُس وقت کی بڑئی فیچر فلمیں بھی دکھانے آجایا کرتے تھے فلم کا پردہ ایک ایسی جگہ نصب کیا جاتا کہ ہم سب بھی اور بڑے بوڑھے بھی لطف اندوز ہوا کرتے مجھے نہیں معلوم تھا کہ برسوں بعد میں بھی اس کام کے فروغ کے لیے کراچی والد صاحب کی طرف سے بلایا جاؤں گا۔

میں اپنے گاؤں میں پیدا تو جون ۱۹۴۸ء میں ہوا لیکن بہت بعد میں شناختی کارڈ پر جون کا مہینہ لکھ دیا گیا تھا۔ میرا گھر چونکہ لب سڑک تھا اس لیے گاؤں کی مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے زمین داروں کی بیل، گائیں اور بھینسوں کے گلے میں لٹکی ہوئی گھنٹیوں کی گونج بھی صبح کے آغاز کا اعلان کرتی تھیں پھر فصلوں کی کٹائی کے دوران میلوں ٹھیلوں کا بھی ایک سلسلہ ہوا کرتا تھا۔

چکوال، مرید، پنڈ دادنخان، چکوڑا اور نیلا دُلاّ کے علاوہ کئی گاؤں اور قصبوں سے بلا کے فنکار کبڈی کے کھلاڑی کٹائی کے اس موسم کے ساتھ ایک طرح سے جشن منایا کرتے تھے۔

☆ اُمید بلکہ یقین ہے کہ چکوال کے بعد کراچی کی ہمراہی میں بھی آپ کی زندگی کے نئے دریچے، نئے مرحلے اور معرکے دریافت ہوں گے؟

☆☆ میرے بچپن کے زمانے میں خصوصاً پنجاب کے بے شمار باسیوں نے کراچی کا رخ کیا تھا۔ میرے والد صاحب فوج کی ملازمت سے ریٹائر ہوئے

تو انہوں نے بھی کراچی ہی کا رخ کیا۔ ہمارے گاؤں میں پہلے ہی کئی لوگ وہاں شفٹ ہو چکے تھے۔ اس زمانے میں پنجاب کے لوگوں کے لیے کراچی شہر ایک ایسی جگہ تھی جہاں غریب سے غریب تر لوگ بھی بھوکے پیٹ نہیں سویا کرتے ہیں۔ کراچی ایک غریب نواز شہر تھا۔

میں چھٹی جماعت میں تھا تو والد صاحب نے مجھے اپنے پاس بلا لیا وہاں کے ہائی اسکول سے میٹرک، پھر نیشنل کالج سے بی۔اے اور کراچی یونیورسٹی سے ایم۔ اے کیا۔ نیشنل کالج میں ایف ۔اے ، بی۔اے کے دوران ریڈیو پاکستان کراچی کے بزمِ طلبہ میں ایک ڈرامہ فیسٹیول کے لیے میں بھی آڈیشن کے لیے بندر روڈ پر واقع ریڈیو پاکستان کی عمارت کے گیٹ سے صحن پھر سیڑھیوں سے ہوتے ہوئے اوپر کی منزل پر اسٹوڈیو تک پہنچ گیا اُس دن تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ اُس ہجومِ بیکراں میں خاکسار بھی تھا جس کو پچیس منٹ کے ڈراموں کے مقابلے میں Best Voice کا ایوارڈ ملا۔ اُس دن کے بعد ریڈیو پاکستان کی عمارت، کینٹین اور اسٹوڈیو میں میری صبح و شام اور رات ہوا کرتی تھی۔ بزمِ طلبہ کی ٹیم کا میں بہت جلد ایک نمایاں کردار بن گیا۔

ریڈیو پاکستان کراچی کے پروڈیوسر یاور مہدی نے باپ کی طرح اپنی مختصر ٹیم کے ساتھ بزمِ طلبہ کے ڈرامہ فیسٹیول، میوزک فیسٹیول کے ذریعے ریڈیائی دنیا کو پوری کراچی کے کالجز اور یونیورسٹیوں کے مختلف تخلیقی اپج رکھنے والے نوجوانوں کو یاور مہدی صاحب اور محمد نقی جو میری طرح بزمِ طلبہ میں شامل ہوا تھا اور بعد میں یاور مہدی صاحب نے اپنے ساتھ باقاعدہ Attach کر لیا تھا۔ خواب کبھی پورے نہیں ہوتے مگر اُن کے جو دن رات محنت کرنے کے عادی ہوں اور ربّ العزت ان کا حامی و ناصر ہو۔

☆ آپ کے قاری کے لیے یہ بات باعثِ تعجب بلکہ باعثِ تکلیف ہے کہ ایک خلاق ذہن کے مالک نوجوان کو کراچی آ کر جسمانی مشقت سے گزرنا پڑا، بارِ خاطر نہ ہو تو کچھ احوال اُن دنوں کا بیان فرمایئے؟

☆☆ کسی شخص یا طالب علم کو جسمانی مشقت سے گزرتے ہوئے دیکھنا اور افسوس کرنا جب کہ وہ صحت مند ہو عام طور پر عام لوگوں کی نظروں میں قابلِ رحم نہیں ہوتا۔ حضورِ اکرمؐ اگر اپنی جوتیاں خود گانٹھ سکتے ہیں تو ایک میٹرک، ایف اے کا طالب علم مزدوروں کے ساتھ مل کر اُنہیں کی طرح کام کرتا دیکھنے والے کو قابلِ رحم نہیں محسوس ہوتا جب تک اس کے چہرے پر لاچاری اور جسم کے اعضا بے جان نہ محسوس ہوں۔

☆ دورانِ تعلیم فیس جمع نہ ہونے کی صورت میں آپ کے اُستاد محمد حنیف صاحب کے حوالے سے کہیں پڑھا تھا۔ قارئین چہارسو کی دلچسپی کے لیے کچھ تفصیل اُس واقعہ کی بیان بتلا دیجیے؟

☆☆ میں ایک ذہین طالب علم تھا۔ میرے اساتذہ ہی نہیں میرے ہم جماعت بھی مجھے عزت دیتے تھے۔ اور سر حنیف صاحب کو دیکھئے انہوں نے جس طرح اپنی کرسی کے ساتھ مجھے کھڑا کر کے میرے لیے جو الفاظ استعمال کیے انہوں نے نہ صرف مجھے سر نہیں جھکانے دیا بلکہ میرے ہم جماعت ساتھیوں کی تالیوں کی گونج نے مجھے بھی سر اٹھا کر ان کو دیکھنے کا حوصلہ دیا تھا۔

☆ دورانِ تعلیم آپ کا تعلق ریڈیو سے جڑ جاتا ہے۔ یہاں بھی آپ کی مدد کے بغیر آگے بڑھنا ہمارے لیے مشکل بھی ہے اور دشوار بھی؟

☆☆ ۶۵۔۱۹۶۰ء کا زمانہ کراچی کے تعلیمی ماحول اور ثقافتی سرگرمیوں میں وہ ملاوٹ نہیں تھی جو اب عروج پر ہے۔ یاور مہدی صاحب نے بزمِ طلبہ ریڈیو پاکستان کراچی کو باپ، دادا کی شفقت جیسی محبت کے سائے میں رکھا اور شاہ صاحب جو ریڈیو پاکستان کراچی کے R.D تھے اور باقی سینئر اسٹاف میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جس کے دو چہرے ہوں۔ آواز، تلفظ اور لب و لہجہ صرف اور صرف یہ تین سفارشیں ہوا کرتی تھیں ریڈیو پاکستان کے اسٹوڈیو کے مائیک تک پہنچنے کے لیے۔

☆ یہی وہ موقع ہے جب جشنِ تمثیل پر بہترین آواز کا انعام جیتنے کی روداد سے قاری کو باخبر کیا جائے؟

☆☆ جشنِ تمثیل اُس زمانے میں دو طرح کے ہوا کرتے تھے ایک سینئر صدا کاروں اور ڈرامہ نگاروں اور پروفیشنل ریڈیو پروڈیوسرز کا جس میں طلعت حسین اور اُن جیسے کئی اور صدا کار اور رضی اختر شوق جیسے بہترین شاعر اور ریڈیو کے ڈراموں ڈائریکٹر کراچی ریڈیو کی تاریخ کے ناقابلِ فراموش لوگ ہیں (اور کئی اعلیٰ درجے کے لوگ بھی میرے ذہن میں ہیں مگر گنتی بڑھانے کی ضرورت نہیں) ایسے ہی لوگ اُس زمانے میں بزمِ طلبہ کے جشنِ تمثیل کے نگران ہوا کرتے تھے۔

ایک سال میں نے پچیس منٹ کے ڈرامے میں اور دوسرے سال پچاس منٹ کے دورانیے والے ڈرامے میں مجھے Best Voice کے ایوارڈ ملے۔

☆ اسی دوران آپ ڈرامہ ''سمندر'' تحریر کرتے ہیں۔ یقیناً کوئی مہربان ہاتھ آپ کی پیٹھ پر ضرور ہونا چاہیے؟

☆☆ آپ کا سوال بظاہر بڑا دلچسپ ہے مگر میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا کہ میں نے کسی کے سامنے زانوئے تلمذ نہیں رکھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ ریڈیو ڈرامہ بنیادی طور پر سننے کی چیز ہے یہ سننے والے پر منحصر ہے کہ سننے والے کے کانوں میں صرف آواز ہی پہنچ رہی ہے یا اُسے آوازوں میں متعلقہ سین کا منظر نامہ بھی دکھائی دے رہا ہے۔ بالکل ایسا ہی کہ کسی خاص کردار کے لیے آپ صدا کار کس طرح کا سلیکٹ کرتے ہیں اور وہ ساؤنڈ Effects جو ماحول کے منظر نامے کو سننے والوں کے کانوں کے ذریعے دماغ اور پھر آنکھوں تک کیسے منتقل ہوتا ہے۔ جس طرح آپ لکھنے سے پہلے منظر نامہ کو اپنے دماغ سے Create کرتے ہیں فلم کا اسکرپٹ ہو، ٹی وی کا ڈرامہ ہو یا ریڈیو کا لکھنے والا، کرنے والا اور ہدایت کار جب تک تخلیقی اپج ایک جیسی نہ ہو کمیونیکیشن ناممکن ہے۔ فلم اور ٹی وی کے ڈراموں

میں کئی ذرائع ہوتے ہیں مصنف، ہدایت کار، اداکار یا صدا کار اور ڈائریکٹر یہ تینوں مل کر کیمرہ مین سیٹ ڈیزائنر، ڈریس ماسٹر، رات دن صبح یا شام کا منظر Create کرتے ہیں۔ ریڈیو میں ایک رائٹر، ایک ساؤنڈ افیکٹ ماسٹر اور ایک ڈائریکٹر جن کے پاس کوئی اور ٹھوس ہتھیار نہیں ہوتا بس ایک آواز ایک ساز اور تیسری صوتی اثرات۔ یہ سب معاملہ ریڈیو میں آپ کے قدرتی آلہ سماعت پر منحصر ہے کہ جو آپ نے تصور کی آنکھ سے دیکھا وہ سننے میں بھی دکھائی دے رہا ہے۔ چنانچہ ریڈیو کی دنیا منظر دکھاتی نہیں سناتی ہے۔

میں نے بچپن سے کالج تک پہنچنے کے دوران ریڈیو کے ڈرامے سننے کا ڈھنگ سیکھا تھا اور اپنے حواس کی ٹریننگ کی۔ دکان سے سودا لے کر جاتے ہوئے اپنے کان پر ہاتھ رکھ کر اپنی آواز کو سننا میرا مشغلہ تھا۔ ریڈیو پاکستان کراچی، میں یقین سے کہتا ہوں کہ سب سے زیادہ موثر اسٹیشن تھا۔ ڈرامہ سننے اور اُسے اپنا بنانے کے لیے کیا کیا ڈھنگ ہیں سو میں بہت اطمینان سے آپ کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہوں گا کہ ڈرامہ سمندر کے پیچھے میرا یہ سارا ریاض کارفرما تھا۔

☆ ابتدا آپ نے ایم۔اے شاد کے نام سے کی بعد میں اُس نام یا تخلص کو ترک کر دیا۔ کوئی خاص وجہ یا سبب اس کا بھی رہا ہوگا؟

☆☆ خاص وجہ یہی تھی کہ ایم۔اے شاد ایک ٹیپیکل سا تخلص تھا نام کا کوئی حصّہ میری بنیادی شناخت نہیں تھا۔ سوایوب کے ساتھ خاور لگالیا۔

☆ سقوطِ ڈھاکہ پر لکھی گئی نظم کی اشاعت کی غرض سے فنون کا انتخاب اور قاسمی صاحب کے ردِعمل کی بابت اشتیاق فطری ہے؟

☆☆ میری شاعری آہستہ آہستہ بلوغت تک پہنچنے کے لیے کئی ادب سراؤں سے ہوتے ہوئے فنون تک پہنچی۔ پہلے کراچی کے رسائل کالج کے میگزین ہر سال کراچی کے مختلف کالجوں اور یونیورسٹی کے سالانہ مشاعرے، ظاہر ہے میرے ساتھ میرے کالج کے ساتھی ان مشاعروں میں بھیجے جاتے تھے اور اسی دوران کراچی کے کتاب گھروں میں فنون پر جب بھی نظر پڑتی تو وہیں کھڑے کھڑے فنون کی ورق گردانی بھی ہو جایا کرتی تھی۔ جب ہمت بندھی تو نظمیں اور غزلیں ڈرتے ڈرتے بھیجیں مگر قاسمی صاحب ہماری ادبی تاریخ کے وہ ملنسار، شاعر وادیب شناس شخصیت رہے ہیں وہ ادب وشعر سے منسلک نوجوانوں کو حوصلہ دیتے تھے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ پہلی غزل پر انہوں نے مجھے غزل کی وصولی کا خط لکھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری شعری زندگی کو مضبوط بنیادیں احمد ندیم قاسمی صاحب نے عطا کی ہیں۔

☆ بھٹو صاحب اور بے نظیر صاحبہ کی آخری ملاقات پر نظم کی تحریک کیونکر پیدا ہوئی، احباب اور حکومتی ارباب بسط وکشاد کا ردِعمل کس نوعیت کا تھا؟

☆☆ یہ وہ زمانہ تھا جب میری شعری شخصیت کی داڑھی مونچھیں نکل آئی تھیں پاکستان ٹیلی ویژن میں ایک پروگرام پروڈیوسر کے طور پر میرا کام سر اُٹھا چکا تھا۔ سیاست کاری اور فنکاری کندھے سے کندھا ملا رہی تھیں مگر مجھے سیاست کی گود میں بیٹھنے کی کوئی تمنا نہیں تھی۔ بھٹو صاحب سے متاثر ضرور تھا ان کی شخصیت مختلف تھی۔ یہ ہم آپ کے شعور کا زمانہ تھا ان سے پہلے کے سیاست دانوں سے مختلف تھا ان کے جلسے جلوسوں کا رنگ ڈھنگ۔ بھٹو صاحب سے پہلے بھی زوال تو آتے رہے مگر ہمارے ملک نے اس سے پہلے اتنی درد بھری اور خوفناک چیخ کبھی نہیں سنی تھی شاعر تھا۔۔۔ نظم نے منظم تو ہونا ہی تھا۔ کیوں کہ ٹی وی اسکرین اُن دنوں کئی قدم آگے جا چکا تھا پہلے کے مقابلے میں۔

فنون کا انتخاب کسی خاص پوائنٹ آف ویو سے نہیں تھا۔ قاسمی صاحب کی محبت کی وجہ سے جو کچھ لکھتا اکثر وبیشتر فنون کو بھیج دیتا تھا دوسری اہم وجہ یہ بھی تھی کہ ٹی وی کی مصروفیات بہت سارا وقت ہڑپ کر لیا کرتی تھی اور پھر میں زود گو بھی کبھی نہیں رہا۔

حضور شاعر یا کسی بھی تخلیق صنف سے متعلق شخصیت اتنے بڑے واقعے کو نظر انداز کر دے تو آپ اس کے بارے میں کیا فرمائیں گے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ اس واقعے کے ردّعمل میں جس ادیب وشاعر نے لکھا ان میں سے میری طرح کسی کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔۔۔ یہ بات میں ان لوگوں کے لیے کہہ رہا ہوں جنہوں نے اپنے لب ولہجے کو نعرہ بازی کا پرچم نہیں بنایا۔

☆ اس کے بعد تو آپ باقاعدہ سیاسی شاعر ہو گئے ''پاکستان کی کہانی اُس کی زبانی'' کے چرچے آج بھی اکثر سنے جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ہمارے دل میں مزید تفصیل جاننے کا اشتیاق ہے؟

☆☆ میں اُس کے بعد باقاعدہ شاعر کب ہوا؟ بے نظیر اور بھٹو صاحب کی آخری ملاقات سے پہلے ہی سے میں ادبی رسائل میں چھپ رہا تھا۔ سیاست تقریباً شروع ہی سے میری نظموں میں جھلکتی آ رہی ہے۔ اب بھی ہے۔ ''پاکستان کی کہانی اس کی زبانی'' کمال ہے آپ نے مجھے دلا دی اگر ہو سکے تو مجھے اس کی کاپی ضرور عنایت کیجیے گا۔

☆ اب آتے ہیں پاکستان ٹیلی ویژن سے آپ کی وابستگی اور آپ کے استاد قاسم جلالی کے بارے آپ کے تاثرات، احساسات اور تجربات کی جانب؟

☆☆ میں نے پاکستان ٹیلی ویژن ۱۹۷۶ء میں جوائن کیا اور میرے ساتھ شامل ہونے والے مختلف شہروں سے آئے ہوئے ٹرینی پروڈیوسرز کو چکلالہ ٹی وی اسٹیشن میں تربیت دی گئی۔ پھر مجھے کراچی ٹی وی سینٹر پر بھیج دیا گیا جہاں کراچی ٹی وی کے جنرل منیجر صاحب نے مجھے قاسم جلالی صاحب کے ساتھ منسلک کیا۔ قاسم جلالی بہت دبنگ، خوش مزاج اور پان خور پروڈیوسر تھے۔ ان کے نام سے بے شمار سیریلز مشہور ہوئے۔ میں نے اُن سے بہت سیکھا۔ انہوں نے پہلے ہی دن ریکارڈنگ شروع ہوتے ہی پینل پر بٹھا دیا اور باہر چلے گئے میرے اعتماد کو پختہ کرنے کے لیے انہوں نے اپنا ایک خاص انداز اختیار کیا۔۔۔ اور بہت بہترین انسان آؤٹ کلاس پروڈیوسر رہے ہیں۔

☆ ایک نہیں، دونہیں، پورے سات بار آپ کو پی ٹی وی کے نیشنل ایوارڈ کا حقدار ٹھہرایا گیا۔ کچھ تفصیل خدمات اور کارناموں کی ضروری ہے جن کے عوض آپ کو سرفراز کیا گیا؟

☆☆ دیکھئے محنت اور مسلسل محنت اور دیانتداری اور اپنے کام سے عشق آپ کے کام کو اور آپ کو بھی سونے سے ہیرا بناتا ہے۔ جتنی گہری دوستی اپنے کام سے رکھیں وہ آپ کی خدمات کو کارناموں میں بدل دیتا ہے۔ آپ اپنے کام کی عزت کریں لوگ آپ کی عزت کریں گے۔

☆ کسی بڑے تخلیق کار پر بلا رنگ و نسل اور ملک و ملّت کام ہونا اردو ادب کی روایت کا حصہ ہے مگر بعد از مرگ جبکہ آپ نے گلزار صاحب کے افسانوں پر اُن کی زندگی میں سیریز بنا کر نئی روایت کی داغ بیل ڈالی؟

☆☆ یہ کوئی ایسی بات نئی نہیں ہے پاکستان میں بھی اور ہندوستان میں بھی کئی ایسی شخصیات کے بارے میں مفصل کتابیں چھپی ہیں اور چھپ رہی ہیں۔ پاکستان میں سب سے پہلے گلزار صاحب کی محبت نے ہمارے احمد ندیم قاسمی صاحب اور ان کی منہ بولی بیٹی یہ مقدس رشتہ قائم کیا تیسرے نمبر پر میں تھا۔ اُن سے خط و کتابت بھی اور فون پر بھی اکثر و بیشتر گفتگو ہوا کرتی تھی۔ یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ وہ جہلم کے تھے میں بھی ضلع جہلم اور تحصیل چکوال کا ہوں، مٹی کی گواہی بھی کوئی کم شے نہیں۔ میں ان کی دوستی اور محبت کو اپنے لیے باعث افتخار سمجھتا ہوں۔ انہوں نے میری شاعری پر بھی اپنے محبت بھرے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ میں نے ان کی فرمائش پر ان کے افسانوں پر مبنی ایک ڈرامہ سیریز بھی بنائی جو ٹیلی ویژن پر ٹیلی کاسٹ ہوئی اور مشہور بھی ہوئی۔ اس سے پہلے میں نے پاکستان کے منتخب افسانہ نگاروں کی کہانیوں پر مبنی کئی سیریز بنا چکا تھا اور ٹی وی سے نشر بھی ہو چکی تھی۔

☆ پاکستان ٹیلی ویژن پر آپ نے جس قدر علمی، ادبی اور فنی پروگرام کیے اُن کا مزاج، معیار اور انداز سامنے رکھتے ہوئے ''مذاق رات'' کو دیکھ کر دل کو ایک دھکا لگتا ہے اور صوفی غلام مصطفےٰ تبسم کا مشہور شعر مزاحیہ انداز میں پڑھنے کو جی چاہتا ہے؟

☆☆ آپ نے وہ شعر کہاں لکھا ہے جو مذاق رات کے حوالے سے آپ کا جی پڑھنے کو چاہتا ہے۔

اگر آپ کو برا نہ لگے تو میں عرض کروں گا کہ ٹی وی Behind the Screen بھی اور On the Screen بھی بدل چکا ہے اور آپ کو شاید یہ بھی معلوم ہے میرے پروگرام مذاق رات میں صرف مذاق نہیں ہوتا بلکہ سیاسی صورتِ حال، اس صورتِ حال کے اندر اور باہر کیا ہوتا ہے ہم اُسے ٹچ کرتے ہیں دوسری میرے نزدیک اہم بات یہ ہے کہ سیاست دان اس پروگرام میں پُر لطف گفتگو بھی کرتا ہے اور مخالف جماعتوں کے خلاف غصّے اور نفرت میں چلاّتا نہیں اور کبھی کبھی ہمارے کامیڈینز کے ساتھ بھی ہنستا کھیلتا ہے۔

☆ وطنِ عزیز میں کئی درجن ٹی وی چینل کی موجودگی میں، ملک اور قوم کے نوجوانوں کا اخلاق اور کردار سنوارنے کے بجائے بگاڑنے کا ذمہ دار آپ کے خیال میں کون ہے؟

☆☆ ٹی وی اسکرین اب ایک ایسی مارکیٹ بن چکی ہے یوں سمجھئے کہ وہ بغیر لائسنس کے بے شمار امپورٹڈ مال بیچے جا رہی ہے اور پوچھنے والا کوئی نہیں۔

☆ آپ نہیں سمجھتے جس طرح محکمہ ڈاک، ریلوے، پی آئی اے اور دیگر سرکاری اداروں کو جان بوجھ کر بڑے سیٹھوں کے ہاتھوں دیوالیہ کیا گیا عین اُسی طرح پی ٹی وی کو بھی پرائیویٹ چینل کے مالکان نے تباہ و برباد کر ڈالا؟

☆☆ میں ہر طرح سے آپ کے سوال کے جواب میں آپ کے خیال سے متفق ہوں۔

☆ سفر ہے دشت کا اور سر پہ رختِ تنہائی
یہ بار بھی اسی عمرِ رواں نے ڈھونا ہے

کس بار کی جانب اشارہ فرما رہے ہیں آپ؟

☆☆ سفر ہے دشت اور سر پہ رختِ تنہائی
یہ بار بھی اسی عمرِ رواں نے ڈھونا ہے

جناب عالی سفر دشت و صحرا کو ہوا اور حدِّ نظر تک قیام کی توقع نہ ہو اور سر پر رختِ تنہائی ہو تو میرا یا آپ کا کیا حال ہوگا۔ تنہائی کا بوجھ نظر نہ آنے کے باوجود اس قدر بھاری ہوتا ہے کہ نہ اُسے سر سے یا کاندھوں سے اتارا جا سکتا ہے نہ اپنے وجود سے کاٹ کر پھینکا جا سکتا ہے۔ سو جب تک جان میں جان ہوتی ہے سہنا پڑتا ہے۔

☆ دنیا میں آنے کے بعد آدمی روزانہ کی بنیاد پر کچھ نہ کچھ سیکھتا، سمجھتا اور حاصل کرتا ہے اور اس کا کوئی نہ کوئی وسیلہ بھی ہوا کرتا ہے۔ سرِ دست آپ ہمیں علامت اور استعارے کے حوالے سے بتلائیے کہ اس فنِ لطیف و سلیس میں مہارت و یکتائی کا منبع و ماخذ کیا ہے؟

☆☆ وسیلہ اللہ کی دین ہے کچھ ذہین لوگوں کو ربّ کائنات قوّتِ اظہار عطا کرتی ہے، کچھ کو خدائے بزرگ و برتر قوّتِ تفہیم عطا کرتی ہے اور یہ دونوں طبقے ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کر دیئے ہیں ربّ کائنات نے۔ ان دونوں طبقوں کی بلوغیت کا انحصار ان کے دل و دماغ پر ہوتا ہے جو اظہار و ابلاغ کے اوصاف کو اپنی اپنی طاقت کے مطابق ایک لیول تک پہنچا دیتا ہے۔ رہی بات مہارت اور یکتائی کی تو بھائی یکتائی صرف اللہ ہی کے پاس ہے مگر مہارت ایکسپرئنس، آبزرویشن کے ساتھ ساتھ پریکٹس پر منحصر ہوتی ہے۔

☆ آزاد نظم کے حوالے سے ایک رائے یہ ہے کہ یہ تن آساں لوگوں کا مشغلہ ہے جو بحور و اوزان سے لاعلمی کے سبب شوقِ آوارگی پر مائل ہوا کرتے ہیں؟

☆☆ آزاد نظم کے لیے ایک رائے یہ ہے کہ تن آسان لوگوں کا مشغلہ ہے اگر آپ بُرا نہ مانیں تو یہ میں نہیں مانتا۔ آزاد نظم کے لیے بڑے بڑے شعراء نے

ایک خاص وزن میں رہ کر چار چار سطروں کا خیال مقررہ وزن میں اس طرح روانی کے ساتھ لکھی ہیں کہ نظم کے قاری کی سانس ٹوٹ جاتی ہے مگر نظم کی طویل، لائن کا وزن نہیں ٹوٹتا۔ اور نثری نظم جو تن آسانی کے ساتھ لکھنے کا رواج ہے وہ اکثر شعریت سے محروم رہتی ہے۔ بحور سے لاعلم لوگ نثری نظم نہیں صرف نثر لکھتے ہیں جبکہ نثری نظم کی لائنوں کے بیچ شعریت اپنا رنگ ضرور دکھاتی ہے۔

☆ یہی ہی سوال نظم معریٰ کی نسبت کیا جائے تو آپ کا فرمان کیا ہوگا؟

☆☆ نظم معرّیٰ غزل کی طرح ایک مخصوص بحر میں کہی جاتی ہے۔

☆ غزل کے رمزیاتی حسن سے جی بھر کے کام لینا اور Naration سے پہلو تہی کرنا کسی قدر جوکھم کا کام نہیں؟

☆☆ شاعر اگر پہلو تہی کرتا ہے یا جان جوکھم میں ڈالتا ہے تو اس کے لیے یہ مزدوری کرنا مناسب نہیں اس عظیم کام کے لیے انیس اور دبیر اور اُن کی پیروی کرتے ہوئے ہمارے عہد کے کچھ شعراء کی مثالیں موجود ہیں۔

☆ مصرعوں کو توڑ کر کہیں سے کہیں پہنچانے کی بات خوبی کے زمرے میں شمار ہوتی ہے یا خامی کے زمرے میں آتی ہے۔ اس کا کوئی معقول سبب اور جواز آپ کے پاس یقیناً ہونا چاہیے؟

☆☆ اوّل تو دیکھنا یہ چاہیے کہ شاعر نے اپنی آزاد نظم کس بحر میں شروع کی ہے لکھنے اور پڑھنے والا اُس کو اگر توڑتا ہے تو وہ قابلِ قبول نہیں لیکن جو بات وہ کہہ رہا ہے اس کے لیے ایک لمبی سانس کی ضرورت ہے تو بحر کے وزن کا بہاؤ صفحے کی دو تین سطروں تک بھی جاسکتی ہے جسے پڑھتے ہوئے قاری کی سانس ٹوٹ تو سکتی ہے مگر نظم کی طویل ترین لائن نہیں ٹوٹے گی۔ اس کی مثالیں میں کوشش کروں گا کہ آپ تک پہنچا سکوں کسی نہ کسی طرح۔

☆ قاسمی صاحب نے آپ کے مفکرانہ مزاج و انداز کو سراہتے ہوئے گمبھیرتا سے گہرائی میں اُترنے کی جو بات کی تھی، قاری اس کے معنی و مفہوم جاننے کا آرزومند ہو تو اُسے کیا کرنا چاہیے؟

☆☆ قاسمی صاحب نے میری جس کتاب کی نظموں کے بارے میں یہ فرمایا ہے اس کی تفہیم اُس کتاب کی نظموں کو دیکھا جائے تو بات یقیناً سمجھ میں آنی چاہیے چلیں میرے دوسرے مجموعے ''تمہیں جانے کی جلدی تھی'' کی ایک نظم کا مصرع شاید آپ کو ٹھیک لگے کیونکہ میں بہت جلدی میں سوالنامہ مکمل کرنا چاہتا ہوں۔

اور تمہیں معلوم ہے کپڑوں کی الماری ہمیشہ سے کھلی،
سیف کی چابی تو تم نے خود ہی گم کی تھی سو وہ
تب سے کھلا ہے اور اُس میں کچھ تمہاری چوڑیاں
اک آدھ آنگوٹھی اور اُن کے بیچ میں کچھ زرد لمحے
اور اُن لمحوں کی گرہوں میں بندھی کچھ لمس کی
کرنیں، نظر کے زاویے، پوروں کی شمعیں اور
سنہرے رنگ کی ٹوٹی ہوئی سانسیں ملیں گی اور
وہ سب کچھ جو میرا اور تمہارا مشترک سا اک
اثاثہ ہے، سمٹ پائے تو لے جانا، مجھے
جانے کی جلدی ہے
گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

☆ اداسیوں، بے کیفیوں اور شکستوں کا فاتح گردان کر بھی قاسمی صاحب نے ہمارے لیے گویم مشکل وگرنہ گویم والی کیفیت پیدا کر دی ہے؟

☆☆ میں نہیں سمجھ پایا کہ ایک سیلف میڈ نوجوان زندگی کے جن سنگین نشیب و فراز سے گزر کر ایک ایسے مقام پر فائز ہے جس کی زندگی، کام کاج اور تخلیقی دنیا کے کام پر آپ نے ایک زبردست سوال نامہ بھیجا ہے۔ اُس نے گویم بمشکل میں آپ کو کیوں مبتلا کر دیا ہے۔

☆ مزاحیہ خاکوں اور ڈراموں کا کردار، سامنے والے کی رائے سن کر اکثر دریافت کرتا ہے ''آپ نے میری تعریف کی ہے یا۔۔۔'' ملارمے کے حوالے سے سوادِ حیات اور احساسِ خود فراموشی کا ذکر کر کے جناب اختر حسین جعفری نے صورتِ حال کو کسی قدر گنجلک بنا دیا ہے؟

☆☆ گلزار بھائی! میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آپ نے اس سوال میں مزاحیہ خاکوں اور ڈراموں کا ذکر ضروری کیوں جانا اور شاید اس پر بھی میرے لیے کچھ کہنا مشکل ہوگا کہ جعفری صاحب محترم نے سوادِ حیات اور احساس فراموشی کے حوالے سے ملارمے کو کس سبب کوٹ کیا او کیوں کیا۔ واللہ اعلم الثواب

☆ آگے چل کر جونہی جعفری صاحب نے غیر ضروری مرصع کاری کے بعد انقلابی نوعیت کی شعری منطق Syllogistics کا ذکر فرمایا، ذہن فوری طور پر کارل مارکس کی جانب متوجہ ہو گیا؟

☆☆ آپ نے چند سوالات کو جان بوجھ کر گنجلک بنایا ہے یا خود بہ خود یہ صورت حال دَر آئی ہے۔ مجھے تو تخلیقات کو بنانے، سنوارنے کی فرصت ہے اور نہ میں اس کو ضروری خیال کرتا ہوں۔ جہاں تک سوال لفظ انقلابی کا ہے تو میرے خیال میں یہ روانی میں برتا گیا ہے کسی طرح کے انقلاب یا کارل مارکس سے اس کا قطعی کوئی تعلق نہیں۔

☆ ''محبت کی کتاب'' کو ہمارے عصر کے دانشور نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے جس طور سراہا اور ستاشا ہے اُسے دیکھ کر تو یقین ہو چلا ہے کہ ہو نہ ہو اس رودادِ محبت کا مصنف کی ذات سے گہرا تعلق ہے؟

☆☆ جناب عالی! آپ کے اس سوال کو پڑھنے اور سمجھنے کے دوران مجھے لگا کہ جیسے شاعر، ادیب، پینٹر، موسیقار، گلوکار ہر حال میں کسی نہ کسی کے عشق میں مبتلا ہو کر تخلیق کار کے عہدے پر فائز ہوا ہے میرے بھائی میری رائے میں اعلیٰ درجے کے تخلیق کار کی آبزرویشن، ایکسپرئنس کے لیول کو بھی چھوتی ہے۔ ورنہ

حقیقت نگار کی اصلاح شاید معرضِ وجود میں نہ آتی۔

☆ لگے ہاتھوں اُن غزلوں اور نظموں کی بابت بھی بتلا دیجئے جنہیں آپ نے اخفا میں رکھا ہوا ہے؟

☆☆ آپ یقین کریں نہ کریں میں نے اخفا میں کچھ نہیں رکھا ہوا۔

☆ گلزار صاحب نے ''محبت کی کتاب'' کو تین تہوں والی تخلیق ڈرامہ، ڈائریکشن اور شاعری کی بنیاد پر ہی کہا ہوگا، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص ایک وقت میں ایک ہی کام سے انصاف کرنے کا اہل ہوتا ہے۔ آپ تین تین کاموں سے ایک ساتھ انصاف کرنے پر بضد ہیں؟

☆☆ حضور یہ تین کام بیک وقت ہی انجام کبھی نہیں ہو سکتے اگر قدرت نے مجھ پر مہربانی فرمائی ہے تو یہ تینوں کام اپنے اپنے وقت پر ہی سرانجام ہوتے رہے ہیں۔ اس سوال کے آخر میں ''بضد'' کا لفظ مجھے تھوڑا سا کھٹکا ہے اسے ذرا دیکھ لیجیے گا۔ بضد وہ ہوتا ہے جو کام نہ کر سکنے کے باوجود بضد ہے چھوٹے بچے کی طرح کہ ''نہیں میں نے یہ ضرور کرنا ہے'' (مسکراہٹ)

☆ بھائی عطاالحق قاسمی نے آپ کے ڈکشن کو منفرد بتلا کر دل میں ایک لہر سی پیدا کر دی ہے؟

☆☆ میں سمجھ نہیں پایا کہ یہ لہر مثبت ہے یا منفی۔ میں جان نہیں پایا۔

☆ جناب شکیل عادل زادہ آپ کو مضطرب انسان بتلا کر سوال کا موجب بن رہے ہیں، یہ بے کلی، بے چینی اور بے قراری کب سے آپ کے طواف میں ہے اور کیوں ہے؟

☆☆ آپ پریشان نہ ہوں آپ خود ایک زبردست تخلیق کار ہیں اگر آپ صرف اور صرف تخلیق کار نہیں چوبیس گھنٹے والی ملازمت، گھر، گھر والوں کی ذمہ داریاں، شاعری، ڈرامہ لکھنا بھی اور پروڈکشن بھی۔ گویا اگر آپ کی زندگی تہہ دار ہے تو ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے ادھر کا سفر مسلسل ہی ہوتا ہے۔ اس صورتِ حال کے لیے آپ کے یہ تین الفاظ بے کلی، بے چینی اور بے قراری میری مصروفیتوں کے غماز نہیں ہیں یہ الفاظ کسی بے چارے ناکام عاشق کی نشان دہی کرتے ہیں جس سے میں اللہ کے فضل سے بچا رہا ہوں۔

☆ امجد طفیل صاحب نے آپ کی نظموں کو موت کا مظہر گردان کر عجب مخمصے میں ڈال دیا ہے؟

☆☆ میرا خیال ہے امجد طفیل کے مضمون نے میری ذات کے حوالے سے بہت مغموم کیا ہے حالانکہ موت کے حوالے سے ان دو تین منظر ناموں کو ہم اپنے بچپن کے زمانے سے دیکھ رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ زندگی سے زیادہ انسان کی موت بڑی حقیقت ہے۔

☆ آگے چل کر طفیل صاحب موت کے اسرار کو تخلیق کا جواز بتلا کر صورت حال کو سنجیدہ بلکہ پیچیدہ بنا رہے ہیں؟

☆☆ درج بالا سوال ہی شاید کافی ہے موت اور زندگی کے فلسفے میں الجھنے سے فائدہ اس لیے نہیں کہ ان دونوں سوالوں کی ڈوریاں ربّ العزت کے ہاتھ میں ہیں۔

☆ آپ خود بھی ویرانی، سناٹا، سکوت، حبس کے استعاروں کو اس کثرت سے استعمال کرتے ہیں کہ قاری کو موت کا منظر یاد آ جاتا ہے؟

☆☆ میرے پیارے بھائی ملال تخلیق کار کا سرمایہ ہوتا ہے۔ اگر میں غلط نہیں تو خاص طور پر اردو شاعری برس ہا برس سے ملال کی پوشاک ہی میں سنواری جا رہی ہے۔

☆ احباب کی اکثریت آپ کے بطون میں جس ہجر کی نشان دہی کرتی ہے وہ بھی اس افسردگی اور ملال کی وجہ تسمیہ کو جاننے اور اس کا سدِ باب کرنے پر اکساتی ہے؟

☆☆ میری شاعری میں سب حزن و ملال میری ذات سے رونما نہیں ہوا بلکہ برصغیر میں اردو شاعری کے بڑے بڑے شعرا نے جس ہجر اور ملال کو خاص طور پر اردو غزل اور نظم کے چند بنیادی ارکان کا حصّہ بنایا۔ بنیادی طور پر یہ اُس روایت کا تسلسل ہے۔ چنانچہ اس کا سدّ باب ضروری نہیں بلکہ ہمارے خاص طور پر غزل کی روایت کے اجزا کا یہ حصّہ غزل کو دلآویز بناتا ہے۔

☆ آپ کے گرد کم فہم اور خود غرضی کو قابل رحم گردانتے ہوئے صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آرزوؤں اور تمناؤں کی مہین چادر کب اور کیونکر تنی اور اس چادر سے آپ کب کب اور کس طور آزاد ہوتے ہیں؟

☆☆ میرے اردگرد کوئی نہ کم فہم ہے نہ خود غرض بلکہ قابلِ رحم کوئی بھی نہیں ہے۔ غزل ہماری روایت کی ایک ایسی اہم کڑی ہے جس کے اجزا میں محبت کو بنیادی عنصر بنا دیا گیا تھا۔ حالانکہ بہت عرصہ پہلے ہی سے غزل کو سماجی زندگی کی جھلکیوں سے بھی آراستہ کیا جا رہا ہے اس لیے اگر کسی کی غزل میں محبت، ہجر و وصال کے معاملات زیادہ پائے جاتے ہوں تو وہ غزل زیادہ سے زیادہ روایتی غزل کہلائے گی شاعر بیچارے سے کوئی ہمدردی کا معاملہ سامنے نہیں آئے گا۔ محبت اور ہجر و وصال کے مضامین اب اکثر و بیشتر روایت نبھانے کے کام آتے ہیں۔

☆ تخلیق اور تنقید کے تعلق کو دامن اور چولی سے تشبیہ دی جائے تو غلط نہ ہوگا مگر جب ہم آپ کے کام کی جانب دیکھتے ہیں تو نظروں میں نہیں سماتا اور جب تنقید پر توجہ مرکوز کرتے ہیں تو دور دور تک کچھ دکھائی نہیں دیتا؟

☆☆ گلزار بھائی یہ سوال میری سمجھ میں نہیں آیا، یا میں سمجھنا نہیں چاہتا۔ یعنی میرے کام کو دیکھتے ہیں تو نظروں میں نہیں سماتا اور تنقید پر توجہ دیں تو کچھ نظر نہیں آتا۔ اس سوال کا لُبِّ لباب کیا میں سمجھوں کہ میرے کام کو دیکھیں تو نظروں میں نہیں سماتا اور تنقید پر نظر مرکوز ہو تو دکھائی کچھ نہیں دیتا۔۔۔ براہِ کرم اس کی وضاحت ضرور کر دیجیے گا میں سمجھ نہیں پایا۔

☆ آپ کے احتجاجی کام اور مزاج کی ایک دنیا معترف ہے مگر وہی دنیا

آپ سے گلا مند ہے کہ جس طرح وطن عزیز اپنوں اور غیروں کے ہاتھوں تار تار ہو رہا ہے، جس طرح بنی نوع انسان عالمی ہوس کے پجاریوں کے مفادات کی بھینٹ چڑھ رہا ہے اس کڑے وقت میں آپ اور آپ کا احتجاجی قلم مخول اور ٹھٹھول کے کارِ فضول میں مشغول و مصروف ہے؟

☆☆ سرکار اس سوال کے جواب میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ آدمی کی توانائی میں کمی آجاتی ہے۔ شاید میں اس توانائی کے ساتھ آواز بلند نہ کر سکا ہوں جس طور ابتدائی سفر میں کرتا رہا یا اس طریقے پر قاری کو اپروچ نہ کر سکا۔ اس سب کے باوجود آپ کے سوال کا کسی نہ کسی طور جواب میرے مہربان ناقدین پر بھی واجب ہوتا ہے۔

☆ آخری سوال بجائے خود ان گنت اور بے شمار سوالات کو سموئے ہوئے ہے۔ ہمارے خیال میں ورلڈ آرڈر، نیو ورلڈ آرڈر، نئی ورلڈ آرڈر اور اسمارٹ ورلڈ آرڈر جیسی ہولناک اصطلاحوں نے کرۂ ارض اور اس پر بسنے والے سات سو کروڑ بے گناہ انسانوں کو جس قدر خطرات سے دوچار کر دیا ہے اُس کی بابت سب سے زیادہ ذمہ داری اہلِ قلم پر عائد ہوتی ہے۔ کیا اہلِ قلم اس ذمہ داری کو احسن طریق پر نبھا رہے ہیں گر نہیں تو کیوں؟

☆☆ میرے پیارے بھائی! کس قدر دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا آپ نے۔ یہ سوال نہیں آج کے وقت کا نوحہ ہے جس کے جواب میں سرِ دست میں آپ کی خدمت میں رازالہٰ آبادی کا یہ شعر ہی پیش کر سکتا ہوں:

اور کچھ دن یہ دستورِ مے خانہ ہے، تشنہ کامی کے یہ دن گزر جائیں گے
میرے ساقی کو نظریں اٹھانے تو دو، جتنے خالی ہیں سب جام بھر جائیں گے

تدبر کے چراغ

ایوب خاور عصرِ نو کے رویوں اور تقاضوں کو جس طرح اپنی شاعری میں سموتا ہے اُس سے اُس کے کمالِ فن اور لفظی قرینے اور سلیقے کا پتا چلتا ہے کہ وہ لفظ کی نزاکتوں اور باریکیوں کو کتنی ژرف نگاہی سے چکھتا ہے مثلاً:

اس قبیلے میں سبھی سردار ہیں
اور میں تنہا ہوں دستاروں کے بیچ

پلٹ پلٹ کر تیری نگاہِ مفارقت نے
خبر نہیں مجھ کو یا مرے حوصلے کو دیکھا

انسانی فکر، قرینوں اور نظری سلیقوں سے باخبر اور شناسا اُسی وقت محسوس ہوتی ہے جب اُسے دوسرے کے ساتھ ساتھ اپنا بھی ادراک ہو۔ اپنے اندر جھانک لینا اور دوسروں کے باطن کے کنویں میں جھانک کر اپنے باطن کو تلاش کرنا ادق کام ہے مگر ایوب خاور اس دقیق فن کے امام محسوس ہوتے ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں:

تیری آنکھیں میری آنکھیں لگتی ہیں
سوچ رہا ہوں کون یہ تجھ سا مجھ میں ہے

یا پھر۔۔۔

دھاگوں کی طرح اُلجھ گیا ہے
اک شخص مری برائیوں میں ہے

ایوب خاور کے فکر اور تدبر سے جلے ہوئے چراغ مایوسیوں کا سراغ لگاتے ہیں مگر اس زاویے سے دیکھنے میں جو لطف ہے اس کا بیان نہیں کیا جا سکتا۔

پھر اک مسافت گریہ کا سامنا تھا ہمیں
جلے چراغ تو پھر انجمن میں تنہا تھے

گفتار خیالی

''لہو کا مون سُون''

ایوب خاور

اے حریمِ وقت

امن، ریزہ ریزہ ہو کر
معبدوں کی سجدہ گاہوں، سڑکوں اور بازاروں کی گنجان گلیوں
درسگاہوں اور شاپنگ سینٹروں، چوراہوں
جلسوں اور جلوسوں اور گرجوں کی مقدس گھنٹیوں
کے سائے میں
ہر روز اپنے ہی لہو میں ڈوب کر قبروں کی مٹی اوڑھتا ہے
کیا کبھی ایسا بھی موسم آئے گا
جب دنیا والے اس زمیں کی خاک پر کِھلتی ہوئی سُرخی
فقط پھولوں کی کلیوں ہی میں دیکھیں گے!
حریمِ وقت
اے حریمِ وقت!!!
تیری کھوہ میں ایسا کوئی لمحہ بھی ہے
جو اس زمیں پر زندگی کو راکھ کے اک ڈھیر میں
تبدیل کرنے والوں کے ذہنوں میں امن و آشتی
کا نور بھر دے؟؟
ہے کوئی ایسا بھی لمحہ تیرے دامن میں
جو دہشت گرد ملکوں کی تجارت کو ہڑپ کر لے!
ہے ترے دامن مین ایسا کوئی لمحہ!
جو لہو کے مون سُونی بادلوں کی دہشوں پر اس طرح پھیلے
کہ اس بے خانماں اور بے اماں دنیا کے ہر گوشے میں
پھر سے پیکرِ رنگِ سحر بھر دے؟
حریمِ وقت۔۔۔کیا
کیا ہے ترے دامن میں ایسا کوئی لمحہ۔۔۔؟
کوئی اک آدھ لمحہ تیری آنکھوں سے بھی ٹپکے۔۔۔
حریمِ وقت، چُپ کیوں ہے
بتا۔۔۔کیا تیری آنکھوں کا بھی پانی مر گیا ہے؟؟؟

اے میرے نقش گر

تمہارے جانے کے بعد
گم ہو گئی تھی، میرے دل کی دھڑکن
میرے وجود کی وادیوں میں
کسی انہونی کا خوف میرے خیمۂ دل کی رگوں میں سرائیت کر رہا تھا
میری آنکھوں کے پانیوں پر
اب بھی وہ منظر تیر رہا ہے
جب تم ڈبکیاں لے رہے تھے میرے وجود کے سمندر میں
زینہ در زینہ اتر رہے تھے میری رگوں میں
اور اب
جب تم زینہ در زینہ نکل رہے ہو میری ذات کے حصار سے
تنہائی نے مجھے اپنی بانہوں میں بھر لیا ہے
مری خواب گاہ کے در و دیوار
میرے بستر کا ریشم اب بھی تیری سانسوں کی لو میں سلگ رہے ہیں
میں نے کھڑکیوں کے پردے نیم وا کر دیے ہیں
خواہش کا غم
اور ہجر کا غم گڈمڈ ہو گئے ہیں
پلٹ آؤ
پانی سے بھرے ہوئے بادلوں کی طرح
برس پڑو میرے سلگتے ہوئے وجود پر ساون کی طرح
کرو میری تکمیل ایک سنگتراش کی طرح
میری وحشت میں محبت کی شدّت بھر دو
میرے حواس کو اپنی گرفت میں لے لو
آسیب کی طرح
اپنے ستاروں سمیت چاند کی طرح روز میری نیم وا
کھڑکی میں اترو
اور ڈھانپ لو میری برہنگی کو اپنی ہلکی نیلی روشنی کی شال میں
اے میرے نقش گر

قدر و قیمت

نظر انداز کر دو
گرم دنوں کی ہوا کو
دیکھو۔۔۔نظر اٹھا کر، آسمان پر مسکراتے ہوئے چاند کو
اس کی چاندنی اگرچہ کچھ دیر کے لیے ہے
مگر تسکین آمیز ہے
جذب ہو جاتی ہے، صبحِ کاذب کے بے آواز قدموں سے
سورج کی زرد نرم روشنی میں
جو مٹا دیتی ہے اس کی قدر و قیمت کو
جیسے قیمتی لباس کا دمکتا رنگ معدوم ہوتا چلا جاتا ہے
دوپہر کی دھوپ کی شدت سے
شام ہونے سے پہلے پہلے
جیسے کوئی قدیم زمانوں کا نغمہ
اپنی دلکشی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے،
یاداشت کی دھول میں دفن ہونے سے پہلے
جیسے کوئی غلام اپنے مالک
اور کوئی ٹیلا کسی بلند پہاڑ کے قدموں میں
اپنی پہچان کھو بیٹھتا ہے
خاص طور پر جون، جولائی کے دنوں میں
نظر انداز کر دو
گرم دنوں کی ہوا کو
اور صدا دو اپنی کھوئی ہوئی شناخت کو
جو تمہارے اندر ہی کہیں گم صم ہے
شائد!!!

○

ملال کی ایک رات

کچھ نہیں ہے
میرے آئینہ و مہتاب و سبو خالی ہیں
صفحۂ دل کسی معتوب شہنشاہ کی مسند کی طرح
حرمتِ لفظ و معانی بھی گنوا بیٹھا ہے
خطۂ عمر معطل ہے وجود
عالمِ ہجر میں زنجیر ہے یہ خلوتِ ذات
آئینہ بابِ ندامت ہے اور اس بابِ ندامت سے گریزاں
میرا عکسِ متروک
عرصۂ وقت کے دامن میں کوئی شاخِ سحر ہے نہ کوئی شامِ جمال
مگر اک رنگِ ملال
اے دیارِ رُخِ آیندہ کی مجذوب ہوا
لوحِ مہتاب سے اُترے کوئی صبحِ تحریر
مگر اِس دشتِ شبِ رزم کے سنّاٹے میں
وہ اندھیرا ہے کہ ان ہاتھوں سے گرتے ہوئے لمحے
نہیں دیکھے جاتے
چشمِ حیراں پہ برستے ہوئے نیزے نہیں روکے جاتے
ایک اندوہِ مسلسل کے سوا
برزخِ جاں میں کوئی سنگ سزا ہے نہ کوئی ساعتِ اجر
سطرِ آیندہ!
تجھے حرفِ ملامت سے کیا ہے آغاز

○

جاگتی آنکھوں کا خواب

ایک رستہ جسے کلیوں نے سرِ دشت پرویا ہو ہماری خاطر
ہم کہیں دور سے آتے ہوں کسی خواب میں گم
ہاتھ میں ہاتھ لیے
سطحِ آئینہ پہ چلتی ہوئی خوشبو کی طرح
سبک انداز ہوا کی صورت
وادیٔ گُل کی طرف بہتے ہوئے جاتے ہوں
مگر اے جانِ جہاں اس کے لیے
ہمیں گردابِ زمانہ سے نکل آنے کی فرصت بھی تو ہو
وقت کے دشتِ بلا خیز میں کلیوں کو چٹکنے کی اجازت بھی تو ہو

○

خزاں کو کیا ہوا ہے

خزاں کو کیا ہوا ہے
یہ مرے دل کی رگوں میں سے نکل کر
شہر کی گلیوں، محلّوں، شاہراہوں اور سڑکوں پر
بھلا کیوں دندناتی پھر رہی ہے!
میں نے تو اس کو بہت مشکل سے
اپنی دھڑکنوں کی چپ میں کس کے باندھ رکھا تھا
اور اب یوں ہے کہ میری آرزوئیں
اور سارے خواب، پتّوں کی طرح سوکھی ہوا کے ہاتھ میں
لاوارثی کی گرد میں لپٹے، بگولہ وار اُڑتے پھر رہے ہیں
کوئی کھڑکی، کوئی دروازہ، دریچہ، کھل نہیں سکتا
مقفّل ہے
یہ شہر اندر سے باہر سے مقفّل ہے
خزاں کو کیا ہوا ہے۔۔۔!

معلوم و نامعلوم

دنیا زاد!
کون بتائے گا
ایسے نامعلوم مقام کے بارے میں
جہاں پکڑے جانے والے دہشت گردوں کو پناہ دی جاتی ہے
کسے خبر ہے
پوچھ گچھ کرنے والوں کے سامنے اب تک
کس نے کیا کیا اُگلا ہے
کیا کوئی تفتیش ہمارے سامنے آئے گی
کون ہیں وہ اور کس کے کہنے پر وہ خودکش حملے کرتے ہیں
کیوں معصوم، جوانوں، بچوں اور بوڑھوں کے خوابوں کے ٹکڑے
ٹکڑے کرتے ہیں اور خود بھی مرتے ہیں
دل کی جگہ ان کے سینوں میں
کون سے پتھر جڑے ہوئے ہیں
کن ماں باپ کے بیٹے ہیں
کیا ہمارے اس ملک میں کوئی ایسی عدالت ہے
جس میں
کبھی وہ ابنِ زیاد اور شمرِ لعیں کے ہوتے سوتے پیش کیے جائیں گے
کیا اس صدی کا سورج اُن دیکھے کو دیکھ سکے گا
یا وہ بھی اک نامعلوم مقام کی صورت
نامعلوم رہیں گے!!!

○

ہاں۔۔۔میں ہوں سیاہ فام

ہاں۔۔۔سیاہ فام ہے میرا رنگ
اور مجھے فخر ہے اپنی سیاہ فامی پر
اگرچہ میرا رنگ سیاہ ہے
مگر اس رنگ میں
ساری دنیا کے رنگ ہیں
کیا تم جانتے ہو؟
بہار، خزاں، سرد اور گرم
سارے موسموں کے رنگ
خوابوں کی طرح میرے آنکھوں میں جھلملاتے ہیں
اور میرے اندر کے صحرائی سرابوں میں سبز وادیوں کی مانند سلگتے ہیں
میں مارٹن لوتھر، نیلسن منڈیلا، باراک اوباما اور کوفی عنان کا رنگ ہوں
میں رنگ ہوں جدوجہدِ آزادی کا
میرا رنگ نشان ہے حریت کا
میں مائیکل جیکسن اور باب مارلے کا رنگ ہوں
میرے رنگ میں میرے عزم کی عظمت جھلملاتی ہے
میں رنگ ہوں محمد علی کا
جسکا ایک مکّہ تمام دوسرے رنگوں کو بے چہرہ کر دیا کرتا تھا
میں رنگ ہوں مارگن فریمن، ولیم سمتھ اور بل کا سبی جیسی شہرہ آفاق شخصیتوں کا
جنہوں نے فلم کے پردے پر، لاکھوں پردے والیوں کے دلوں میں
گھر بنائے ہیں
سب سے بڑھ کر
میں ہوں رنگِ بلال اور رنگِ نجاشی
میں تاریخ ساز مثال ہوں وفاداری کی
تمام رنگ ڈھل گئے ہیں میرے رنگ میں
شہنشاہ ہوں میں تمام رنگوں کا
میں رنگ ہوں، خدائے بزرگ و برتر کا

○

ایک منجمد وداعی لمحہ

میں نے جُوں ہی کمرے کا دروازہ کھولا
دیکھتا کیا ہوں!
کمرے کی جو چیز جہاں تھی
ویسی کی ویسی دھری ہوئی ہے
ڈریسنگ ٹیبل کے کونے پر
سیفٹی پن کے ڈبے کا ڈھکنا بس یوں ہی گرا پڑا ہے
ہیئر برش کے دانتوں میں
کچھ بال ہیں تیرے پھنسے ہوئے
سینٹ کی شیشی کھُلی ہوئی ہے
تیرے پرس کے اندر سے اک شخص کی فوٹو اُس کے اُوپر گری ہوئی ہے
میری چپلیں
بالکنی کے دروازے کی اوٹ میں اُلٹی پڑی ہوئی ہیں
میری گھڑی
اور تیرا کنگن
تکیے کے نیچے سے ہو کر فرش پہ اوندھے پڑے ہوئے ہیں
کین کے سنگل سیٹر کے اک بازو پر
میری بیلٹ کے ہُک میں تیرے سبز دوپٹے کا ایک کونا اُڑا ہوا ہے
بستر کی چادر اور تکیے
اک دوبے سے گتھم گتھا ہو کر گہری نیند کے تھل میں دھنسے ہوئے ہیں

تُو نے جانے سے پہلے
جو منظر جامد کیا تھا، اُس میں
کمرے کا دروازہ کھول کے میں بھی شامل ہوا کھڑا ہوں
کاش!۔۔۔اچانک دھم سے آ کر
تُو اس جمے ہوئے منظر کو
اپنی آہٹ کے Suspended Chords کی آنس تو دے
مجھ سے باہر
مجھ میں شامل
اس منظر کا کوئی حصہ سانس تو لے۔۔۔!

اماوس

رقص کرنا تھا سمندر نے
مگر یہ چاند!
اس کو کیا ہوا۔۔۔
اس چودھویں کے چاند کو کس کی نظر کے
کالے بادل گھیر کر اپنی گپھا میں لے گئے
اے رات!
آنکھیں کھول
اک لمحے کو دیکھ
اپنے ساحل سے پرے
بوڑھا سمندر
رقص کے اک زاویے میں منجمد ہے
منتظر ہے
چاند کو اپنی گپھا سے نکال
تاروں سے کہہ
بادلوں کی اوٹ سے نکلیں
ذرا سی دیر کو
اپنی جھلمل کی۔۔۔تلک، ترکٹ، تتہ، دھا، تک، سے
کتھک کی لے دکھائیں
آنکھ بھر اس آسماں پر
کہکشاں ترتیب دے کر تال دیں
بوڑھا سمندر
رقص کرنے کو بہت بے تاب ہے

○

کون ہیں وہ بد بخت

کون ہیں وہ بد بخت
جو کلی کو پھول بننے سے پہلے
پتی پتی کر کے
ملا دیتے ہیں حبس بھری فصلوں کی بے بس مٹی میں
بے آباد مکانوں کی اندھی دیواروں کے بیچ
سسکتے ہوئے سناٹے میں
کون ہیں وہ پتھر دل لوگ جو ریزہ ریزہ کر دیتے ہیں بچپن کی
معصومیت کو
جہنم کی اذیت سے زیادہ گہرے دکھ کے اندھیرے میں
جھونک دیتے ہیں
ایک بے گناہ بچپن کے وارثوں کو
کون ہیں وہ پتھر دل انسان نما لوگ
کون ہیں۔۔۔
اے میرے خدا
کون ہے تجھ سے بڑا۔۔۔ایسا گواہ
تجھ سے زیادہ کون جانتا ہے
جو ہماری بیٹیوں کا قتل ہوتے ہوئے دیکھتا چلا آ رہا ہے
یہاں اس دنیا میں
یہ دنیا جس کی عدالتوں میں جج سی سی ٹی وی کی گواہیوں کو دیکھنے کے باوجود
کسی چشم دید گواہ کے منتظر رہتے ہیں
کیا قلم کی سیاہی کی طرح ان کے دل بھی سیاہ ہوتے ہیں
کہاں ہے تُو
کیا تیری عدالت محشر ہی کے دن بپا ہوگی!!!
اور وہ محشر، جو تیری دنیا میں تیرے بندوں نے مسلسل برپا کر رکھی ہے
کیا اس سے بڑا بھی کوئی ہوگا عرصۂ محشر!!!

○

بیگم کی طرف سے ایک نظم

نیند نہیں آتی
اندھی، بہری، کالی رات میں
نیند کہاں آتی ہے
نیند اور خواب کے بیچوں بیچ
بستر کی ہر سلوٹ میں
عمر گزشتہ کے ہر کھٹے میٹھے لمحے کی سرگوشی
چھوڑ نہیں پاتی ہے
نیند نہیں آتی ہے
نیند کہاں آتی ہے
خالی گھر کی دہشت بھری سہولت میں
شاخ سے ٹوٹے پتوں جیسے
زرد دنوں کی روکھی پھیکی فرصت میں
نیند کہاں آتی ہے
ہاتھ سے گر کر ریکھاؤں کے دریا سوکھتے جاتے ہیں
آتے جاتے لوگ تمہارے بارے پوچھتے رہتے ہیں
گھر کی ہر اک شے اور بچے
چپ کی بکل مار کے میرے سامنے بیٹھے رہتے ہیں
نیند آ جائے تو اپنے کمروں میں جا کر سو جاتے ہیں
میں صوفے پر رات گئے تک
اک بے وجہ سے بوجھ کی صورت گھنٹوں بیٹھی رہتی ہوں
بیٹھے بیٹھے اونگھ آ جائے تو
تنہائی کی ٹھنڈی سل کی ٹھنڈک میں
گھل جاتی ہوں
اندر ہی اندر اک جھرنا
درد ہجر کا نیلا جھرنا رگوں میں بہتا رہتا ہے
آنے والی عمر کا پل پل
کھلے ہوئے دروازے کی دہلیز کو تکتا رہتا ہے

○

''جگر کے ٹکڑے''

یہ جگر کے ٹکڑے بکتے نہیں
تُو ڈھونڈتی پھرے بازار کُڑے
یہ دین ہے میرے داتا کی
نہ یُوں ہی ٹکریں مار کُڑے
یہ جگر کے ٹکڑے بکتے ہیں
یہ لختِ جگر بکنے کے نہیں
دے کے دام وورم جھولی بھر لیں
یہ اتنا سستا مال نہیں
کہیں سے بھی مانگ کے لے آئیں
یہ سودا تو نقد بھی ملتا نہیں
تُو ڈھونڈتی پھرے ادھار کڑے
یہ جگر کے ٹکڑے بکتے ہیں
یہ شیر بہادر غازی ہیں
یہ کسی سے بھی نہیں ڈرتے ہیں
انہیں دشمن سے بھلا کیا ڈرنا
یہ موت سے بھی کبھی ڈرتے نہیں
یہ اپنے دیس کی عزت پر
جان اپنی دیتے ہیں وار کڑے
یہ لختِ جگر
خوش قسمت ہیں وہ مائیں بھی
جن ماؤں کے دل کے یہ ٹکڑے ہیں
خوش قسمت وہ، بھائی بہنیں بھی ہیں
یہ جن کی گود میں کھیلتے ہیں
یہ ممتا کی ساری رمزیں ہیں
کر اتنا نہ سوچ وچار کڑے
یہ جگر کے ٹکڑے بکتے نہیں

○

(صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کے لازوال پنجابی گیت کا ترجمہ)

''گل موسم خزاں''

احمد ندیم قاسمی
(●)

علامت اور استعارے سے جو بھرپور فائدہ ایوب خاور نے اُٹھایا ہے، اس کی توفیق نئی نسل کے کسی بھی دوسرے اہم شاعر کو نہیں ہوئی۔ یوں سمجھئے کہ ایک ایسے دور میں جب علامت، عدم ترسیلِ معانی کا شکار ہو رہی تھی اور جب استعارے کا تناظر ابہام کی لپیٹ میں جا رہا تھا۔ ایوب خاور نے اپنی اپج، ذہانت اور تخلیقی وفور کے بل پر علامت اور استعارے کو حیاتِ نو بخشی اور شعر و ادب کے ان امکانات کو نہ صرف زنگ خوردہ ہونے سے بچا لیا بلکہ انہیں نئی وسعتوں اور رسائیوں سے روشناس کرایا۔ میں ایوب خاور کی شاعری سے اس زمانے سے متعارف ہوں جب وہ کراچی یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔ چنانچہ میں اس کے شعری سفر کے بیشتر مقامات و حالات سے واقف ہوں۔ اس لیے میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ خاور کے فن میں جو تدریجی ارتقا ہوا ہے اس سے ان نوجوان اہلِ قلم کو بہت کچھ سیکھنا چاہیے جو یکا یک ہائی جمپ یا لانگ جمپ لگا کر معروف و نمایاں ہونے کے درپے رہتے ہیں۔ دوام صرف تدریجی ارتقا سے ملنے والی شہرت کو حاصل ہے اور اس کی ایک جیتی جاگتی اور بلیغ مثال ایوب خاور کی شاعری ہے۔

اُردو میں نظم معریٰ اور نظم آزاد کے رواج کے بعد جن شعرا نے اس صنفِ سخن کو مقبول بنایا ہے ان میں ن۔م۔راشد، اختر الایمان، ظہور نظر اور مجید امجد کے ساتھ ہی دیگر چند شعرا کے علاوہ مجھے ایوب خاور کا نام بھی ہمیشہ یاد آتا ہے۔ ہمارے اس نوجوان اور تازہ گو شاعر نے جس سلیقے اور آسانی اور روانی کے ساتھ آزاد نظمیں لکھی ہیں وہ اسی کا حصہ ہے۔ اس کی قریب قریب ہر نظم کے مطالعے سے مجھے آزاد نظم کے آفاق، حدِ نگاہ تک پھیلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ایوب خاور کی نظموں کے مطالعے سے ہر ذہین قاری کا یہ یقین پختہ ہوگا کہ نظم آزاد کے امکانات اتنے لامحدود اور اتنے بے پناہ ہیں کہ جب تک شاعری ان سبھی امکانات کو مسخر نہیں کر لیتی۔ نام نہاد نثری نظم کا کوئی ابتدائی جواز بھی پیدا نہیں ہوتا۔ آخر انسان کے پاس پھر سے غاروں میں اترنے اور درختوں پر چڑھ جانے کا کوئی تو جواز چاہیے۔

ایوب خاور اپنی آزاد نظموں میں مصرعوں کو کہیں کہیں سے توڑ کر انہیں مصنوعی طریقوں سے پڑھنے والے کو چونکاتا یا صدمہ نہیں پہنچاتا بلکہ وہ دریا کی طرح رواں دواں رہتا ہے۔ اس لیے اگر اس کا کوئی مصرع بہت طول کھینچ جاتا ہے تو وہ اس سے گھبراتا نہیں بلکہ جانتا ہے کہ جو ''روم'' اس نے منتخب کیا ہے وہ اگر برقرار رہے تو ایک مصرعے کو ایک صفحے تک کھینچا جا سکتا ہے بلکہ آزاد نظم تو ایک طرح سے ایک طویل مصرع ہی ہوتی ہے۔ وہ بہاؤ جو نظم آزاد کے پہلے لفظ سے آخری لفظ تک موجود رہتا ہے، ایوب خاور کے ہاں باقاعدہ ایک فنی اعجاز بن گیا ہے۔ نظم آزاد کا پیرایۂ اظہار ایوب خاور کے مزاج و افتاد کے عین مطابق ہے اور اگرچہ افواہ ہے کہ اس نے چند نثری نظمیں بھی لکھی ہیں مگر مجھے یقین ہے کہ نظم آزاد کے وہ امکانات اسے کبھی بھٹکنے نہیں دیں گے جن سے وہ بہت اچھی طرح متعارف ہے۔

ایوب خاور کے موضوع و مواد کی ایک اہم خوبی اس کا مفکرانہ انداز ہے۔ وہ مسائل کی محض سطح پر نہیں منڈلاتا بلکہ ان کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اس لیے اس کے فن میں ایسی گمبھیرتا، ایسا بھرپور پن ہے جو اس کے ہم سن شعراء میں شاذ ہی دستیاب ہے۔ یہ اُردو شاعری میں غالبؔ اور اقبالؔ کی فکری روایات کی توسیع ہے۔ دراصل ہر دور کے اپنے مخصوص تقاضے ہوتے ہیں اور ہر دور کا مفکر انہی تقاضوں کے تحت ان مسائل کا فنی تجزیہ کرتا ہے۔ یوں ہر نئے دور کی فکر گزشتہ دور کی توسیع قرار دیا جا سکتا ہے۔ مسائل کا ردِ عمل منفی بھی ہو سکتا ہے اور مثبت بھی۔ ایوب خاور کا رجحانِ طبع بیش تر اثبات کا ہے۔ اگر اس کے ہاں کہیں کہیں نفی کی کیفیت بھی پیدا ہوتی ہے تو یہ شر کی نفی ہے اور شر کی نفی ہی خیر کے اثبات کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ ایوب خاور بے کیفیوں، اداسیوں اور شکستوں کا فاتح ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی نظموں اور غزلوں میں انتہائی کرب کے موثر اظہار کے باوجود اس افق کی کیفیت مسلسل موجود رہتی ہے جو طلوعِ آفتاب کی پذیرائی کے لیے آہستہ آہستہ منور ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایوب خاور کا یہ فکری اسلوب اسے اپنے دور کے شعرا میں ایک امتیاز بخشتا ہے اور یہی امتیاز اس کی پہچان ہے۔

ایوب خاور کی غزل بھی اس کی نظم کی طرح تہہ دار ہے۔ ویسے صحیح معنوں میں تو غزل ہوتی ہی تہہ دار ہے کیوں کہ اگر اس میں سے رمزیت کو خارج کر دیا جائے تو وہ ایک کھنڈر سا بن کر رہ جاتی ہے مگر خطرہ وہاں پیدا ہوتا ہے جہاں شاعر اپنے عہد کے آشوب اور کرب کو الفاظ میں منتقل کر رہا ہوتا ہے تب غزل عموماً بیانیہ شاعری میں بدل جاتی ہے اور اگرچہ بیانیہ شاعری کی بھی ایک اپنی اہمیت ہے مگر غزل کے لیے بیانیہ اسلوب کسی صورت میں مناسب نہیں سمجھا گیا۔ ایوب خاور غزل کے رمزیاتی حسن سے جی بھر کر کام لیتا ہے۔ صداقت کی جستجو میں بھی رہتا ہے، وہ بے چین بھی ہوتا ہے، کڑھتا بھی ہے مگر مجال ہے جو اس کے ہاں Narration کا انداز جگہ پا سکے۔

وہ اوّل و آخر شاعر ہے، وہ شاعری کے جملہ مطالبات کا لحاظ رکھتا ہے اور تمام فنی تقاضوں کا احترام کرتا ہے اور وہ اس کے باوجود جدید ہے بلکہ جدید تر ہے۔ علامتوں، استعاروں اور لفظوں کو نئی معنویتوں سے آراستہ کرنے والا شاعر، تیکھا شاعر اور جدید تر کا نمائندہ شاعر:

اب اس بے مہر تنہائی میں خاورؔ
کوئی دَم ساز ہونا چاہیے تھا

''آئینے کا عکس''

ڈاکٹر انور سجاد

(•)

جب ایوب خاور کا تیسرا مجموعہ ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' شائع ہو رہا تھا، انھی دنوں اُس نے ذکر کیا کہ اس کی اگلی کتاب ''محبت کی کتاب'' ہوگی جو ساری کی ساری شعری پیرایے میں ہوگی، یعنی اس کا بیانیہ، منظر نامہ اور ہدایات سبھی کچھ شاعری میں ہوگا۔ میں نے اس کی بات پر اتنی توجہ نہ دی لیکن بعد میں اس کا مسودہ دیکھ کر ایک خوش گوار حیرت ہوئی۔

کتاب کے صفحات کو پہلی نظر میں دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس نے بہت سوچ سمجھ کر کتاب مرتب کی ہے۔ یعنی بیانیے، منظر نامے، مکالمات اور ہدایات کے لیے اُس نے الگ الگ رسم الخط اور پوائنٹس کا انتخاب کیا ہے اور صفحے پر مکالمات، منظر نامے اور ہدایات کے آغاز کے لیے الگ الگ مقامات متعین کیے گئے ہیں۔ گویا مجموعی طور پر ایوب خاور نے اپنی شاعری کی طرح کتاب کے صفحات بھی منفرد بنا کر پیش کیے ہیں، کم از کم میں نے کسی کتاب کی ایسی تزئین نہیں دیکھی۔

''محبت کی کتاب'' میں ایک سادہ سی محبت کی کہانی ہے جو ایک ویلن ٹائن ڈے کے موقع پر شروع ہوتی ہے اور دوسرے ویلن ٹائن ڈے پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ سادہ اس لیے کہہ رہا ہوں کہ محبت ایک سادہ سا ہی جذبہ ہے جس کے اردگرد بُنے جانے والے حالات واقعات اسے پیچیدہ، آسان، مبہم، فانی یا غیر فانی بناتے ہیں۔

ایوب خاور کی تیسری کتاب کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

بصری میڈیم سے گہرا تعلق ہونے کے باعث اس کی امیجری انتہائی بصری ہے اور جزئیات سے لب ریز، یعنی اس کی شاعری میں زندگی اپنی پوری باریکی اور تفصیل سے نظر آتی ہے اور یہی اس کے شعری ہنر کا امتیاز ہے اور یہی خاص طور پر اس کی نظم کا وصف بھی۔ ڈراما نگار ہونے کے باعث ایوب خاور کے ہاں اکثر مقامات پر ڈرامائی عناصر بھی اپنی مخصوص اور پوری توانائی کے ساتھ اظہار پاتے ہیں۔

یہ کتاب پڑھ کر لگا کہ ایوب خاور نے اپنے شاعر، ڈراما نگار اور ہدایت کار کو بہت خوب صورتی سے یک جا کر دیا ہے۔ اب سے پہلے میں نے صرف ریڈیائی ڈرامے یعنی منظوم ڈرامے سنے ہیں جن کا رواج بھی کب کا ختم ہو چکا ہے۔ اُن منظوم ڈراموں میں بھی کہانی شعر کے سانچے میں ڈھلے ہوئے مکالمات کے ذریعے بیان کی جاتی تھی مگر یہ ڈراما دیکھنے سے زیادہ پڑھنے کی چیز ہے۔ ایک دل چسپ پہلو اس کہانی کا یہ ہے کہ بنیادی انسانی کرداروں کے ساتھ ساتھ ایوب خاور نے منظر نامے میں موجود اردگرد کی اشیا بھی کہانی کے کرداروں میں ڈھال دی ہیں اور کہانی کے مرکزی کرداروں پر خاور کی گرفت اس قدر مضبوط ہے کہ وہ اپنی مرضی کرنے سے قاصر ہیں۔ اُن کے اپنے الفاظ میں دیکھیے:

اور تمھیں معلوم ہے
کپڑوں کی الماری ہمیشہ سے کھلی ہے
سیف کی چابی تو تم نے خود ہی گم کی تھی
سو وہ تب سے کھلا ہے اور اس میں کچھ
تمھاری چوڑیاں، اک آدھ انگوٹھی اور ان
کے بیچ میں کچھ زرد لمحے اور ان لمحوں کی گرہوں
میں بندھی کچھ لمس کی کرنیں، نظر کے زاویے
پوروں کی شمعیں اور سنہرے رنگ کی ٹوٹی ہوئی
سانسیں ملیں گی اور وہ سب کچھ جو میرا اور
تمھارا مشترک سا اک اثاثہ ہے
سمٹ پائے تو لے جانا
مجھے جانے کی جلدی ہے

کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ کہانی کے حالات و واقعات کرداروں کے مرہونِ منت ہوتے ہیں، لکھنے والا ان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ پیرندیلو کے ایک ڈرامے میں تو ''چھ کردار اپنے مصنف کی تلاش میں'' نکل کھڑے ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ کیا کردار مصنف کی تخلیق نہیں۔ مصنف تو خود معاشرے سے کردار وضع کرتا ہے پھر پیرندیلوی کی یہ تلاش گھٹیا مفروضہ ہے جو سوائے مضحکہ خیز ہونے کے اور کچھ نہیں۔ ایوب خاور نے ثابت کر دیا ہے کہ کرداروں کی باگ ڈور مصنف کے اپنے ہاتھوں ہی میں رہتی ہے اور رہنی چاہیے جو کہانی اور کرداروں کو ایک مستری کی طرح کھولتا چلا جاتا ہے اپنے طے شدہ راستوں اور حالات و واقعات سے ہم آہنگ کرتے ہوئے اپنی منزل تک پہنچاتا ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایوب خاور نے ویلن ٹائن ڈے کے موقع پر ایک سفید پھول کو محبت کی سرشاری میں ڈوبے ہوئے مرکزی کرداروں کے خون سے سرخ کرتے ہوئے موجودہ سیاسی منظر نامے پر ایک ایسا Comment کیا ہے جس کی طرف کسی اور شاعر کا دھیان شاید ابھی تک نہیں گیا۔ ایوب خاور نے ویلن ٹائن ڈے کی محبت بھری سرخی کو دہشت گردی کی خونی دلدل میں ڈھال کر دنیا بھر میں پھیلی ہوئی بے امنی اور خونی انقلابات کے خلاف احتجاج کیا ہے اور میں اپنے آپ کو اس احتجاج میں شامل سمجھتا ہوں۔ اپنی بات ختم کرنے سے پہلے ایوب خاور کی ایک اور خوبصورت نظم آپ کی نذر:

اس اک آئینے کا عکس ہے
میری محبت بھی
تمھارے چاہنے والوں کی حیرت بھی
یہ حیرت آئینے کے ٹوٹنے تک ہے
ہمارے ہاتھ سے سانسوں کی ڈوری چھوٹنے تک ہے

باقی سب ہوس

شکیل عادل زادہ عفی عنہ
(کراچی)

ایوب خاور شاعر نہ ہوتے تو مصور ہوتے۔ یوں کہیے کہ ان کا یہ مجموعہ موصورانہ شاعری کا کمال ہے۔ کیسے کیسے مناظر، کس کس زاویے سے انہوں نے مصور کیے ہیں۔ سارے کلام، سارے مجموعے میں رنگ بکھرے ہوئے ہیں۔ پہلی شرط تو خیال ہے، مصور ہو، شاعر یا موسیقی کار، پہلی شرط تو خیال کاری و خیال آفرینی ہے۔ اس کے بعد آواز کی، اطوار کی، رنگ کی اور پیراہن کی منزل آتی ہے، گویا صناعی و فن کاری کے مرحلے کی۔ دونوں منزلوں اور مرحلوں میں ایوب خاور نے بڑی توانائی اور تمکنت سے اپنا وجود باور کرایا ہے۔

میں اپنی بات کروں، آزاد قسم کی اس شاعری سے مجھے بے اماں، بے مایہ کوئی ایسی رغبت نہیں ہے لیکن ادھر کچھ عرصے سے اس نوع کی شاعری متواتر اتنا اثر و ہنر اور فکر و سحر منکشف کرنے کے درپے رہی ہے اور بے شک اس شاعری کے تخلیق کاروں میں ایک نمایاں شاعر ایوب خاور ہیں۔ وہ میرے ہم جولی بھی ہیں، دوست بھی اور میرے محترم و مکرم بھی۔ تعلقِ خاطر اُن سے بہت پہلے کا ہے۔ یہ محترم و مکرم کا منصب انہوں نے اپنی شاعری کے طلسم سے جسم و جاں میں قائم کیا ہے اور کیا خوب کیا ہے:

محبت اِک مقدّس جذبۂ انسانیت ہے
وہ ماں ہو، باپ ہو
بھائی، بہن، بیوی ہو یا ہو سر کا تاج
محبت سارے رشتوں کو
کچھ ایسے جوڑ دیتی ہے
کہ جیسے ست رنگ ہیروں کی مالا ہو
ہر اک ہیرے کا اپنا رنگ اور اپنی الگ تاثیر
اور تنویر ہوتی ہے
یہ رشتے جب تک یک جان ہوتے ہیں
تو یہ اک دوسرے کا مان ہوتے ہیں
ہر اک چھوٹے بڑے کا دل
اگرچہ اپنا ہوتا ہے
مگر اُن سب کی دھڑکن ایک ہوتی ہے
اگر دھڑکن کی لَے میں عزت و تکریم بھی ہو، تو

شاید ابھی اُس قدر تشفی نہیں ہوئی جس قدر دل و دماغ کا تقاضا یا اسرار ہے۔ تو پھر کیا کیا جائے؟ اس کا سیدھا کا حل ہے کہ ایوب خاور کی ایک اور نظم کو آواز دے کر اس تشنگی کو مٹایا جائے۔

ابھی کچھ دیر باقی ہے
ابھی گلیوں، مکانوں کی چھتوں پر
ڈیوڑھیوں میں، خنجر بکف خامشی پہرے پر فائز ہے
یہاں اس قریۂ عبرت میں اک قصرِ بلند و پُر چشم ہے
جس کے فرشِ نیلمیں پر اک انبوہِ غلاماں
صف بہ صف خالی سروں کو اپنے سینے پر جھکائے
ہاتھ باندھے، اپنے آقا سے وفاداری کا دم بھرتا ہے
حاجت مند سائل کی طرح بے وزن لہجے میں سخن کرتا ہے
جیتا ہے نہ مرتا ہے
ذرا دیکھو
ذرا اس قریۂ عبرت کے قصرِ پُر چشم سے اس طرف دیکھو
ہوا محبوس ہے، برگ و ثمر سے خالی پیڑوں کی
برہنہ ٹہنیوں کے ساتھ گرہیں ڈال کر باندھی گئی ہے اور زمستاں کی
سنہری دھوپ ٹکڑے ٹکڑے کر کے شہر کی اونچی چھتوں پر
چیل کوؤں کے لیے ڈالی گئی ہے

ان کی جامع الصفاتی کا کیا احوال، ادیب، کہانی کار، ڈراما نگار، ہدایت کار اور شاعر۔ ڈراموں کی ہدایت میں انہوں نے ایک مرتبت حاصل کی ہے لیکن سب سے بڑا ہنر تو اُن کی شاعری ہے اور میں گواہ ہوں، شاعری ان کے لیے پہلا مسئلہ ہے، باقی تمام معاملات و مشاغل ثانوی اور بہت بعد کے ہیں۔ ان دنوں ان کی رفاقت کے مواقع افراط سے واقع ہوتے ہیں۔ وہ ایک مضطرب آدمی ہیں۔ ان کی شاعری سے ان کے ہیجان و اضطراب کا احساس کچھ سوا ہوتا ہے۔ لگتا ہے، کہیں کچھ رہ گیا اور کہیں کچھ کھو گیا ہے جس کی وہ تلاش میں ہیں۔ یوں ہر لحاظ سے وہ بڑے کامیاب ہیں مگر کامیابی سے مراد بامرادی نہیں ہے۔ جانے کی خلش ان کے رگ و پے میں اٹک گئی ہے۔ کوئی حسرت جو پوری نہیں ہو پاتی۔ زندگی بہ ظاہر کتنی ہی مہربان ہو، لگتا ہے روٹھی ہوئی بھی کچھ کم نہیں۔ یہی کچھ تمام و نا تمام کی حالت، یہ ناگفتنی انہیں شاعری پر آمادہ کرتی ہے، یعنی شاعری اُن کے لیے ذریعۂ عزت اتنی نہیں جتنی گوشہ اماں کی حیثیت رکھتی ہے یا اس کی حیثیت کسی سپر کی بھی ہے۔ یہ پناہ گاہ اور سپر بھی یاں کسے نصیب ہوتی ہے۔ یہی سارا ماجرا دیکھ کے جی کرتا ہے کہ نہاں خانے کی کشاکش ایسی دردناک اور رحم طلب بھی نہیں۔ مآل یہ تخلیق کاری، یہ مثال آفریں سخن طرازی و سخن پردازی، یہ دل نشین، نشاط افزا، فکر نما، خیال پرداز شاعری تو۔۔۔ تو ٹھیک ہے، اس کے سوا کیا۔۔۔ باقی سب ہیچ، بے مقدار، ناپائدار۔۔۔ باقی سب ہوس۔

بہت کچھ کھو گیا ہے

گلزار
(ممبئی)

یہ دوسری بار ہے کہ میں ایوب خاور کے مجموعے کے لیے پیش لفظ لکھ رہا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ پیش پیش ہیں اور میں پیروی کر رہا ہوں۔

اُس مجموعے اور اس مجموعے کے درمیان قریب پانچ سال کا وقفہ ہے۔ یہ بلند قامت شخص چلتا بھی ہے تو لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہے۔ ادب کے صفحوں پر بھی وہ ایسے ہی قدم اٹھاتا ہے۔ ایک ذاتی خیال ہے میرا کہ تخلیق میں وقفے ضروری ہوتے ہیں۔ کہیں رُک کر سانس لینا اور پھر چلنے لگنا، کہیں سیدھی راہ چھوڑ کر، کوئی موڑ مڑ جانا، ایا اچانک کوئی پگڈنڈی سر اُٹھا کر دیکھے تو کچھ دیر اُس کے ساتھ چل دینا۔ وہ کسی شاہراہ سے جا کر نہ ملے تو خود ہی کوئی نئی راہ نکال لینا لیکن وقفے ضروری ہوتے ہیں، خود بینی کے لیے، ورنہ تخلیق کار، خصوصا شاعر، خود کو دُہرانے لگتا ہے اور اکثر یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ شاعر اُسی راہ سے واپس لوٹ رہا ہے جس راہ سے آگے جا رہا تھا۔

لیکن زندگی تو مسلسل واقع ہوتی رہتی ہے۔ وہ تو وقفہ نہیں لیتی۔ رُکتی نہیں، اور تخلیق کار، اگر ایوب خاور جیسا حساس شاعر ہو تو وہ کیسے رُک جائے۔ اُس کی اُپج تو سانس بھی نہیں لیتی۔ زندگی مسلسل اُس کے اندر اُبلتی رہتی ہے اور وہ اُس کی بھاپ کو روک نہیں پاتا۔ اب وہ نئی نئی راہیں تلاش کرتا ہے اور نئے نئے شعبے اختیار کر لیتا ہے۔ اسی پانچ سالہ وقفے کے دوران ایوب خاور اپنے منظر ناموں میں پہلے سے زیادہ چمک اُٹھے۔ فلموں میں اُن کے نغمے بھی سنائی دیے اور ٹیلی ویژن پر اُن کی موجودگی پہلے سے کہیں زیادہ نکھر آئی۔

پانچ سال بعد، وہ ایک بار پھر اُس شاہراہ پہ بھی نظر آ رہے ہیں جس کا نتیجہ اُن کا تازہ ترین مجموعۂ کلام ہے۔

پچھلے مجموعے میں کہا تھا:

ساری دنیا میں ایک تم سے ہی
اب ملاقات نہیں ہو پاتی

اب فرماتے ہیں:

اگر ہم مل نہیں سکتے، یہ دِل اب کھِل نہیں سکتے
تو پھر تکیے کو منہ پر رکھ کے رونا کیا ضروری ہے

پہلے کہا تھا:

دل کی رگ رگ نچوڑ لیتا ہے
عشق میں یہ بڑی مصیبت ہے

اب فرماتے ہیں:

عشق تو خیر کہاں کا تھا، مگر جانِ جہاں
نوکِ مژگاں میں مہ و سال پرونے پڑے ہیں

اک وحشتِ بے نام نہیں چھوڑتی دل کو
اک ہجر ہے اور ریت کا اڑتا ہوا دریا

پہلے ایک تنہائی کا احساس تنگ کرتا تھا:

پلکیں اوڑھ کے سو جائے گا ہر منظر
اور اکیلا چاند فلک پر جاگے گا

اب تنہا ہیں مگر حوصلہ ہے۔

بجھا سکے تو بجھا دے کہ میری عادت ہے
دیا جلا کے ہمیشہ ہوا میں رکھتا ہوں

میں نے پڑھا اور آگے بڑھ گیا۔ حسبِ معمول!

رات بچھا لی دشت میں
چاند، سرھانا کر لیا
خواب کی چادر اُوڑھ لی
ہجر ازالہ کر لیا
خاورِ خستہ جاں نے بھی
دیکھ! گزارا کر لیا!

اس مجموعے میں سیریل اور ڈراموں کے منظر نامے بھی نظر آتے ہیں۔

ڈراما ''دُھند'' کے لیے لکھی گئی ایک نظم سنئے:

برف گنگناتی ہے
رات جلنے لگتی ہے
گہری نیند کا جنگل، اک ذرا سی آہٹ سے
سرسرانے لگتا ہے
دل کی ٹمٹماہٹ میں خوف کھوئے جانے کا
کسمسانے لگتا ہے
برف گنگناتی ہے
رات جلنے لگتی ہے

ڈراما چٹان کے لیے نظم ہے:

''زندگی وہ دھارا ہے
جس کی تیز لہروں میں
آدمی کو بہنا ہے۔''

ایک ادا جو اُن کی تب بھی بہت بھلی لگتی تھی۔ وہ اب بھی اُتنی ہی اچھی لگتی ہے۔ نظموں میں کتھک کی چال چلتے ہوئے لمبے لمبے مصرعے اور معنی کہیں

چھوٹتے نہیں۔گھنگھروؤں کی طرح قلم سے لپٹے رہتے ہیں۔

''میں نے دیکھا،اُس کی آنکھوں میں کئی صدیوں کا گہرا
زرد سورج تھا کہ جس کا عکسِ وارفتہ مری نظموں کی
سطروں اور ادھوری خواہشوں کی شام سے لپٹا
پڑا تھا اور کمرا دونوں سمتوں سے مقفّل تھا!''

ایک چھوٹا سا حوالہ اپنے لیے پیش کردوں۔ پانچ سال پہلے میں ایوب کو کم سمجھ پایا تھا۔ پانچ سال بعد اب اور بھی کم سمجھ پاتا ہوں،اس لیے کہ وہ پہلے سے بہت وسیع ہوگئے ہیں۔ بڑے ہوگئے ہیں۔وہ بڑے شاعر ہیں۔ایوب کا کہنا ہے۔

تم کہتے ہو
نظم لکھو
اوراپنی اس اک بات کو خاور
مصرعوں میں زنجیر کرو
میں کہتا ہوں
درد میں لپٹی
سوگ میں ڈوبی
روگ کی روگی اس اک بات کے کتنے معنی نکلیں گے
کیا تم نے یہ سوچا ہے؟

''شہادتِ سخن''

ایوب خاور کی پہچان کا بنیادی حوالہ ڈرامہ بنا۔خواجہ اینڈ سن، فشار، حصار، دن، دلدل، ریڈ کارڈ، غریب شہر، گرہ، کانچ کے پر، نشیب، انکار اور پاتال جیسے ڈرامے بنا کر انہوں نے ہدایت کار کے طور پر اپنا لوہا منوایا۔ادبی کہانیوں کو''قاسمی کہانی'' اور ''کہانی گھر'' کے نام سے بڑی کامیابی سے پیش کیا۔ان کے بقول ''جب میں نے محسوس کیا کہ ڈرامے کی کہانی فارمولا ہوگئی ہے تو میں نے سوچا افسانوں کو ڈرمائی صورت میں پیش کیا جائے۔افسانہ ڈرامے کے لیے تو لکھا نہیں جاتا۔اس لیے ایسی کہانی کی تلاش کے لیے پڑھنا بہت پڑھتا ہے تاکہ کہانی ایسی ہو جس میں ڈرامے کے لوازمات موجود ہوں۔عبداللہ حسین کے ''نشیب'' کے بارے میں ہمارے جی ایم کا خیال تھا کہ لوگ اسے پسند نہیں کریں گے مگر میں اسے بنانے پر مصر رہا، میں نے کہا کہ وہ مجھے بتادیں کہ اگر ڈراما پسند نہ کیا گیا تو مجھے استعفیٰ دینا ہوگا یا جرمانہ۔ مجھے یقین تھا کہ ڈراما کامیاب ہوگا اور میں جس نظر سے دیکھ رہا تھا دوسرے نہیں دیکھ پا رہے تھے۔گلزار صاحب کے افسانوں پر سیریز بنائی جو گلزار کلاسکس کے نام سے پیش کی گئی۔گلزار سے ان کا تعلق ارادت کا ہے۔وہ بھی ان سے محبت کرتے ہیں۔۱۹۹۸ء میں منصۂ شہود پر آنے والے ان کے دوسرے شعری مجموعے ''تمہیں جانے کی جلدی تھی'' کا تعارف انہوں نے لکھا اور ''محبت کی کتاب'' کا بھی انہوں نے ''محبت کا گلزار'' کے عنوان سے دیباچہ تحریر کیا۔ایوب خاور کا تیسرا شعری مجموعہ ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' دو سال قبل شائع ہوا۔

وہ اس بات کو نہیں مانتے کہ ٹی وی کی مصروفیات کے باعث ان کی شاعری متاثر ہوئی۔اس بابت ان کا نقطہ نظر ہے ''اور بھی بہت سے شاعر ہیں اور وہ اور کچھ نہ کچھ ضرور کرتے ہیں، ان کے ہاں تخلیقی آدمی تقسیم کیوں نہیں ہو جاتا، عبدالعزیز خالد ہیں وہ ہندسوں میں کیوں تقسیم نہیں کیے گئے۔ بڑے بڑے اور لوگ ہیں۔شاعری کیوں ایسا اوڑھنا بچھونا ہے جس میں کوئی اور شریک نہیں ہوسکتا۔میں نے کبھی تخصیص نہیں رکھی نہ کبھی شعوری کوشش کی ہے کہ اب مجھے شاعری کرنی ہے۔اب مجھے ڈرامے کے بارے میں سوچنا ہے۔ان لوگوں کا شعار اختیار نہیں کیا کہ جنہیں کچھ نہ کچھ ضرور روز لکھنا ہے۔ پھر لوگوں کو سنانا ہے اور داد لینی ہے۔مزے کی بات یہ ہے کہ آپ مختلف فضاؤں میں رہیں اور وہاں آپ اپنی شہادتیں بھی چھوڑیں۔ میں تو اچھے ڈرامے کی ڈائریکشن کو بھی تخلیق ہی سمجھتا ہوں۔

محمود الحسن

خوب صورت خیال کا شاعر

عطاالحق قاسمی
(لاہور)

ایوب خاور کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ کراچی میں اور میں لاہور میں ہوتا تھا اور ہم دونوں نے ایک دوسرے کی شکل نہیں دیکھی تھی یعنی وہ کیسے اچھے دن تھے! اب گزشتہ چند برسوں سے ہم دونوں ایک دوسرے کو ایک دوسرے کی نظم ونثر سمیت برداشت کر رہے ہیں۔ جب وہ کراچی میں تھا تو میں اس کی غزلیں ''فنون'' میں پڑھا کرتا تھا اور ان سے لطف اندوز ہوتا تھا لیکن جب سے اس کے ساتھ ''دوبدو'' دوستی ہوئی ہے۔ اس کی غزلیں کہیں چھپی دیکھتا ہوں تو پڑھنے کی کوئی اتنی جلدی نہیں ہوتی کہ اپنا ''خوشیا'' ہی تو ہے۔ دراصل مداح اور ممدوح کی جب بھی دوستی ہوتی ہے، بیچارے ممدوح کا انجام یہی ہوتا ہے!

آگے چلنے سے پہلے ایک اعلان ابھی سے کرتا چلوں اور وہ یہ ہے کہ میں دوستوں کے خاکے مختصر لکھتا ہوں کیوں کہ تفصیلی لکھنے سے وہ ناراض ہو جاتے ہیں، ایوب خاور کے بارے میں اظہار خیال تو مزید مختصر کروں گا کیوں کہ یہ انتہا سے زیادہ شریف آدمی ہے۔ چنانچہ اگر میں نے اس کی شرافت کی تفصیلات بیان کیں تو یہ بھی ناراض ہو جائے گا۔ کون شریف آدمی چاہتا ہے کہ اس کی ریپوٹیشن ایک شریف آدمی کی ہو۔ خاور کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع مجھے ''اپنے پرائے'' کی ریکارڈنگ کے دوران ہوا کہ لاہور کے ٹیلی ویژن کے لیے یہ سیریل لکھنے پر مجھے اس نے زبردستی آمادہ کیا۔ یہ ایک علیحدہ کہانی ہے تاہم اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ سیریل کے دوران خاور سے میری لڑائیاں شروع ہو گئیں۔ جس سے محبت پختہ ہوگئی۔ بہرحال اس عرصے میں اور ظاہر ہے اس سے پہلے بھی جو خاور میرے سامنے آیا، وہ ٹیلی ویژن میں رہتے ہوئے بھی خواتین سے دور دور رہنے والا خاور ہے۔ یعنی:

بازار سے گزرا ہوں
خریدار نہیں ہوں!

چناں چہ کام کی طلب گار خوش نما بیبیاں اس کے دفتر کے چکر لگاتی تھیں اور یہ انہیں آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتا تھا۔ اورینٹل کالج میں میرا ایک دوست عبدالغنی فاروق بھی انتہائی شریف آدمی تھا۔ اُسے لڑکیوں کے جھرمٹ میں جس سے ٹکرانا ہوتا اس سے جا کر ٹکراتا اور یوں اُس کی دیکھا دیکھی ہم لوگوں نے بھی نظریں جھکا کر چلنا شروع کر دیا تھا۔ تاہم اپنا ایوب خاور تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتا ہے مگر اس دوران اس کی آنکھوں میں ایک بال سا ہمیشہ موجود رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے خوبصورت غزلیں کہنے والے اس شاعر نے کتنی ہی غزلیں اپنے دیوان میں شامل ہی نہیں ہونے دیں، حالاں کہ ایک ٹیلی ویژن پروڈیوسر کے بارے میں شبہ ہے کہ جب بطور پروڈیوسر اپائنٹمنٹ کے بعد اس نے اپنی پہلی تنخواہ وصول کی تو اس نے حیران ہو کر کہا ''ہیں!'' اس کام کی بھی تنخواہ ملتی ہے!

ایوب خاور کی شخصیت کا دوسرا پہلو اس کا ایمان دار ہونا ہے، کام کے اوقات کے دوران اگر شعر بھی سوجھ رہا ہو تو اسے بھی کان سے پکڑ کر دفتر سے باہر نکال دیتا ہے۔ اسی طرح یہ شخص پاگل پن کی حد تک محنتی ہے۔ میں نے اسے مسلسل اڑتالیس اڑتالیس گھنٹے کام کرتے دیکھا ہے اور خالی پیٹ کام کرتے دیکھا ہے۔ اور شاید اس کی ''قابلِ رشک'' صحت کا یہی راز ہے۔ حالاں کہ شوبزنس سے وابستہ خواتین بھی جنہیں سمارٹ نظر آنا چاہیے بہت چٹخوری ہوتی ہیں اور ڈائٹنگ وغیرہ کے جھمیلوں میں نہیں پڑتیں۔ چنانچہ ایک دفعہ حسن لطیف مرحوم نے ایک محفل میں ملکہ ترنم نور جہاں سے کہا تھا کہ ''بی بی کوئی ایسا گانا سناؤ جو تم نے خالی پیٹ گایا ہو؟'' اور ایوب خاور کی شخصیت کا چوتھا اور سب سے اہم پہلو اس کا انتہائی تخلیقی ہونا ہے۔ یہ شخص جب کوئی پروگرام کر رہا ہو اس میں مکمل طور پر ڈوب جاتا ہے اور اس کی کتنی ہی خوب صورت جہتیں سامنے لاتا ہے حتیٰ کہ اگر اسے ''اللسان العربی'' والا پروگرام بھی سونپ دیا جائے تو مجھے یقین ہے یہ پروگرام دیکھنے والے ''حبیب بینک لمیٹڈ'' کو بھی حبیب بینک اَن لمیٹڈ کہنے لگیں گے!

ایوب خاور ہمارے ان شعرا میں سے ہے جن کی ڈکشن یکسر طور پر مختلف ہے اور میرے نزدیک بالکل اچھوتی ڈکشن والے شعرا میں منیر نیازی، اختر حسین جعفری، ثروت حسین، محمد اظہار الحق، اجمل نیازی، زاہد مسعود، علی اکبر عباس اور ایوب خاور شامل ہیں۔ اگر اچھوتی ڈکشن ہی سب کچھ ہوتی تو شاید ایوب خاور یا دوسرے شعراء میرے نزدیک اتنے اہم نہ ہوتے، کیوں کہ ڈکشن تو شاعری کا لبادہ ہے اس کا لباس ہے جس طرح کچھ شاعر پھندنے والی ٹوپی پر مالٹا باندھ کر مشاعروں میں کلام سناتے ہیں اور یوں بھرے مجمع میں بھی پہچانے جاتے ہیں، اسی طرح اگر یہ شعرا خالی خولی ڈکشن اپنے سروں پر سجائے پھرتے تو ان میں اور پھندنے والی ٹوپی سر پر سجانے والوں میں کوئی فرق نہ ہوتا مگر جس طرح لباس کے اندر کوئی انسان بھی چھپا ہو تو اس انسان کی عزت ہوتی ہے، اسی طرح ڈکشن کے لبادے میں شاعری موجود ہو تو شاعر صاحب عزت کہلاتا ہے۔ ایوب خاور میرے نزدیک صاحبِ عزت شاعر ہے کہ اس کے پاس ڈکشن بھی ہے اور خوب صورت خیال بھی ہے یعنی دستار بھی ہے اور دستار کے نیچے سر بھی ہے۔ چناں چہ میں اس وقت سے اس کا مداح ہوں جب وہ کراچی میں ہوتا تھا اور میں نے اس کی شکل تک نہ دیکھی تھی۔ میں اس زمانے میں ان کی غزلیں پڑھ کر بہت مرعوب ہوتا تھا مگر اب تو وہ میرا دوست ہے، بہت جی چاہتا ہے کہ اس کی بڑائی کا اعتراف کروں لیکن دوستوں کی بڑائی کا اعتراف بھلا کیسے کیا جا سکتا ہے؟

☆

''خوشبو کے کاغذ''

انور انصاری
(جدہ)

سرزمینِ پاکستان اردو ادب کے حوالے سے بہت ''نم'' ہے اسی لیے بے حد زرخیز ہے۔ وطنِ عزیز کے صرف بڑے شہروں سے ہی نہیں بلکہ چھوٹے شہروں اور قصبات سے بھی ایسے سخنور سامنے آ رہے ہیں جن کے خیال کی پرواز دیکھ کر قلب و ذہن ششدر رہ جاتے ہیں۔ ان میں ایسے نوجوان شعراء بھی موجود ہیں جو ''خود لکھے ہوئے'' اشعار سناتے ہیں تو سامع کے دل و دماغ میں ایک ''چیخ'' بلند ہوتی ہے کہ ''اتنا چھوٹا منہ اور اتنی بڑی بات؟'' انہیں سن کر یقین آتا ہے کہ پاکستانی قوم کی نئی نسل میں ادب باقی ہی نہیں بلکہ پروان چڑھ رہا ہے۔

شعر و ادب کے حوالے سے نئی نسل کس طرح سوچتی ہے اور وہ اپنے خیالات کا اظہار کس طرح کرتی ہے، اس کا اندازہ ممتاز شاعر، پروڈیوسر، کہانی کار اور ڈرامہ نویس ایوب خاور تازہ تخلیق ''محبت کی کتاب'' سے ہو جائے گا۔ یہاں نئی نسل کے شعراء سلیم کوثر، خواجہ رضی حیدر، سعود عثمانی، احمد مشتاق، عباس تابش، لیاقت علی عاصم، محسن اسرار، اکبر معصوم، عزم بہزاد، عتیق جیلانی، مصطفیٰ ترک، شاہین عباس، یاد صدیقی، صابر ظفر، جاوید صبا اور محسن چنگیزی وغیرہ کا ذکر اس لیے ضروری ہے کہ ایوب خاور کا تعلق بھی اسی نسل سے ہے۔ یہ سب لوگ اپنی تمام تر تازہ کاری اور حرکی صلاحیتوں کے بل بوتے پر خوبصورت غزلیں اور نظمیں تخلیق کر رہے ہیں۔ اس مرتبہ ایوب خاور اپنے تین مجموعوں ''تمہیں جانے کی جلدی تھی''، ''بہت کچھ کھو گیا ہے''، ''گل موسم خزاں'' کے بعد اپنی تازہ کاوش نظموں پر مشتمل کتاب پیش کی ہے۔ ''محبت کی کتاب'' شاعری ہے اور ڈرامہ بھی، ساتھ ہی ساتھ ایوب خاور بطور ہدایت کار بھی وہ اس کتاب کے ورق ورق میں شامل ہیں اور اپنے پیش منظر کے ساتھ محبت کی کہانی کو آگے بڑھا رہے ہیں۔

ایوب خاور ۱۲۔ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو پاکستان کے شہر چکوال میں پیدا ہوئے۔ بچپن میں حصول علم کے لیے کراچی آ گئے۔ زمانہ طالب علمی میں وہ اور ممتاز شاعر سلیم کوثر کورنگی میں ایک ہی جگہ رہائش پذیر رہے اور یہیں سے شاعری کا آغاز کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب صہبا اختر، رسا چغتائی، رؤف شیخ اور ڈاکٹر یوسف جاوید بھی اسی علاقے میں قیام پذیر تھے۔ ایوب خاور نے کراچی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور پھر ۱۹۷۵ء میں بحیثیت پروڈیوسر پاکستان ٹی وی سے منسلک ہو گئے۔ جہاں رفتہ رفتہ ڈرامے کی مختلف جہتوں میں اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھائے۔ آج وہ ممتاز اور منفرد شاعر کے علاوہ ایک معتبر ہدایت کار اور ڈرامہ نویس بھی ہیں وہ پی ٹی وی سے ریٹائرمنٹ کے بعد نجی ٹی وی چینل سے وابستہ ہو گئے اور معیاری ڈرامے تشکیل دیکر اپنے آپ کو معتبر بنایا۔

''محبت کی کتاب'' کے حوالے سے اپنی بات میں ایوب خاور نے لکھا ہے کہ ''مجھے ۲۰۰۷ء کے کسی درمیانی مہینے میں لکھنے کا خیال آیا۔ ان دنوں میں اپنی تیسری کتاب ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' ترتیب دے رہا تھا اور ساتھ ہی ساتھ آئندہ کے لیے کسی نئے یا مختلف شعری ڈھانچے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ پرویز مشرف کی ڈکٹیٹرشپ کا زوال شروع ہو چکا تھا ہمارے سیاسی منظر نامے پر دہشت گردی کے گہرے بادل خودکش حملوں کی صورت میں گرج برس رہے تھے اور انسانی زندگی خس و خاشاک کی طرح مختلف شہروں کی شاہراہوں، محلوں اور گلیوں پر اُڑا رہی تھی۔ خاک اور خون میں لپٹے ہزاروں معصوم اور بے گناہ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیوں، آرزوؤں، تمناؤں اور محبتوں کے خون کو پولیس اہلکار آنے دن دھونے میں لگے رہتے تھے۔ سو میں نے طے کیا کہ ایک ایسے ہی کسی بے گناہ معصوم جوڑے کی محبت کی ایک سادہ سی کہانی کو ٹیلی ویژن ڈرامے یا فلم اسکرپٹ کے طور پر شعری پیرائے میں لکھا جائے جو اپنی محبت کو بچاتے بچاتے دہشت گردی کا شکار ہو جاتا ہے۔''

یہ کہانی بنیادی طور پر سنبل افراز اور ظفر احتشام کی محبت کے گرد گھومتی ہے۔ چند معاون کرداروں کے سوا باقی کرداروں میں موبائل فون، آئینہ، دھوپ، ہوا، شام، چاند، سمندر اور کچھ بظاہر بے جان مگر سانس لیتی اشیاء ہیں جن کے ذریعے میں نے سنبل اور ظفر کے اندر برپا ہونے والی مختلف کیفیتوں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ محبت کی کتاب کے حوالے سے برصغیر کے ممتاز نقاد، ادیب اور ناول نگار شمس الرحمٰن فاروقی نے ایوب خاور کی کتاب کو غیر معمولی قرار دیا وہ کتاب کے فلیپ میں لکھتے ہیں کہ:

''مجھے یقین ہے کہ ٹی وی اور شاید اسٹیج پر بھی ''محبت کی کتاب'' کو نہایت عمدگی اور کامیابی سے پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم جو اسے اپنے ہاتھوں میں لیے چپ چاپ کسی کمرے یا کتب خانے میں پڑھ رہے ہیں، ہمیں یہ منظر کسی طویل نظم کے بند جیسا لگتا ہے اور اگرچہ کہانی بھی ہمیں اپنی گرفت میں لینے لگتی ہے لیکن جو چیز ہمارے احساس پر سے اپنی گرفت ایک لمحے کے بھی ڈھیلی نہیں کرتی وہ ''محبت کی کتاب'' کی شاعری ہے۔ اگر میں نے اپنی آنکھوں سے اسے نہ دیکھا ہوتا اور اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا تو میں یقین نہ کرتا کہ منظوم ڈرامے کی صنف میں آج ایسی شاعری ہو سکتی ہے۔ اس ڈرامے میں شاعری کا وفور کتنا ہے اس کا کچھ اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ اس کی اسٹیج ہدایات بھی منظوم ہیں۔ ''محبت کی کتاب'' غیر معمولی اور مدتوں یاد رکھنے کے لائق کارنامہ ہے۔''

ایوب خاور کی تازہ تخلیق کے حوالے سے ہندوستان کے ممتاز شاعر کی کہانی کار اور ہدایت کار گلزار نے ''محبت کا گلزار'' کے عنوان سے کیا خوب کہا ہے۔ آپ بھی ملاحظہ کیجیے:

''چلو اک کہانی بنیں
لمحوں کی شبنم سے
سانسوں کے ریشم سے
جذبوں کی شدت سے
پوروں کی وحدت سے
خوشبو کے کاغذ پہ
ایسی کہانی بنیں
جسے پڑھ کر ہر دل محبت، محبت، محبت کہے''

ایوب خاور نے جو کہا ہے، ویسا ہی کہا ہے۔ وہ زبان کا پکا ہے اور وعدے کا پابند ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ ایک نیا تجربہ کر رہا ہے اور اس تجربے کی تین تہیں شاعری، موسیقی اور ڈرامہ ہے۔ ڈرامے کی ایک اور تہہ بھی ہے کہ وہ فلمایا جا سکتا ہے اور فلمایا جائے گا۔ ایوب بذات خود ''سہ جہتی'' شخصیت ہیں۔ وہ بہت اچھے شاعر، بہت اچھے ڈرامہ نویس اور عمدہ قلم کار ہیں۔

اس ڈرامے کی سب سے خوبصورت بات یہ ہے کہ اس کا انداز ''بیلیٹ'' کا ہے جو بڑا کلاسیکی ہے مگر کردار بہت جدید اور ہم عصر ہیں۔ پڑھتے ہوئے اتنی آسانی سے شناخت ہو جاتے ہیں کہ لگتا ہے یہ تو کہیں ہمارے پڑوس میں واقع ہو رہا ہے اور شاعری کی تہیں دیکھئے کہ مناظر ہی نہیں، ہدایات بھی اتنی شاعرانہ ہیں۔

ایوب خاور سراسر آج کے دور کے آج کی پیڑھی یعنی نسل کے شاعر ہیں۔ ایوب نے وہ کام کیا ہے جو صرف وہی کر سکتا تھا۔ یہ صرف شاعر کا کام نہیں ایسے فنکار کی شخصیت کا سہ جہتی ہونا ضروری ہے اور یہی نہیں تینوں تہوں میں ماہر ہونا بھی اتنا ہی ضروری ہے۔ ایوب خاور، اس تین تہی تخلیق پر میری مبارکباد قبول کریں۔''

''ہجر کی اذیت''

ایوب خاور کی شاعری میں رومانیت بھی ہے اور فن کاری بھی، شعور اور لاشعور کی معجزہ نمائی بھی اور اپنی ذات کے تمام راز جو انہوں نے پوشیدہ رکھنے کی کوشش نہیں کی۔ پوری دیانت داری سے لوگوں کے سامنے رکھ دیئے، جتنا سچ اپنی شاعری میں ایوب خاور نے بولا ہے، اس کا حوصلہ ہر ایک کر بھی نہیں سکتا۔

''اترن پہنو گے'' جیسی نظم لکھنے کا حوصلہ ہر ایک میں کہاں ہوتا ہے۔

ایوب خاور اپنے اندر کے ہجر سے مسلسل نبرد آزما نظر آتا ہے۔ اُن کے شعری مجموعے ''تمہیں جانے کی جلدی تھی''، ''گل موسم خزاں'' اور ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' ہجر کی اذیت کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔

ساری شاعری میں سلسلہ نارسائی کا نہ ختم ہونے والا خوب واضح ہے۔

زوالِ شب ہے ستاروں کو گرد ہونا ہے — پسِ نگاہ ابھی ایک غم کو رونا ہے
اب اس کے بعد یہی کارِ عمر ہے کہ ہمیں — پلک پلک میں تیری یاد کو پرونا ہے
یہی کہ سلسلہ نارسائی ختم نہ ہو — سو جس کو پا نہ سکے ہم، اسی کو کھونا ہے
جو لفظ کھل نہ سکیں آئینے پہ، مٹی ہیں — جو بات دل پر اثر کر سکے، وہ سونا ہے
تو اس کو توڑنا چاہے تو توڑ سکتا ہے — کہ زندگی ترے ہاتھوں میں اک کھلونا ہے
بس ایک چشم سیہ بخت ہے اور اک تیرا خواب — یہ خواب، خواب نہیں اوڑھنا بچھونا ہے
سفر ہے دشت کا اور سر پہ رختِ تنہائی — یہ بار بھی اسی عمر رواں کو ڈھونا ہے

اس رومانیت اس ہجر کی کیفیت میں سطحیت نہیں، گہرائی ہے۔ سرمئی شام میں قطرہ قطرہ پگھلتی تنہائی کا احساس ہے، ایوب خاور کی شاعری میں ردھم ہے۔ ترنم ہے، ہجر کی کیفیت پڑھنے والے کے اندر یک دَم، اداسی اور کڑواہٹ نہیں بھرتی بلکہ دھیمے دھیمے کرب کا میٹھا احساس اپنے اثر میں لے لیتا ہے۔

لبنیٰ صفدر

گلِ موسمِ خزاں

عاصی کرنالی
(ملتان)

آیئے ایک ایسے دشت کا تصور کریں جس میں تنہائی ہو، ویرانی ہو، سناٹا ہو۔ جہاں سورج آسمان کی بجائے زمین سے نکلتا ہو۔ جہاں ذرّہ ذرّہ کسی بے مہر موسم کی بے مروّت دوپہر میں آگ کا جہنم اُگل رہا ہو۔ جس دشت میں بادِ سموم ہو۔ رات کے متحرک ٹیلے ہوں۔ چیختی ہوئی اور چنگھاڑتی ہوئی بلائیں غوِ بیابانی کی طرح بھاگتی دوڑتی پھر رہی ہوں۔ جہاں کوئی سمت نہ ہو، کوئی انجامِ سفر نہ ہو، کوئی منزل نہ ہو اس دشتِ ہول ناک کی بیکراں وسعتوں اور غیر محدود مسافتوں میں ایک تنہا مسافر سفر کر رہا ہو۔ اُس مسافر کا بدن زخم زخم ہو، دل لہولہو۔ پاؤں کانٹوں سے فگار ہوں۔ جسم اس جہنم آتشیں کی شعلہ باریوں میں جھلس رہا ہو لیکن وہ مسافر ایک ایسے عزم اور ایک ایسی اُمید کی بشارتوں سے معمور ہو، جن بشارتوں میں، موسمِ خزاں کے دامن کی سطح پر پھول سجانے کا حوصل ہو۔ جو مسافر سراب کی رگیں نچوڑ کر دریا بہا دینے اور سورج کی کرنیں کشید کر کے بارشیں برسا دینے کی ہمت رکھتا ہو جو موسمِ خزاں کو گل طراز اور سمن فشاں بنا سکتا ہو اور جو دشتِ ہول کو چمنِ آسودگی میں بدل دینے کی توفیق سے مشرف ہو۔

آپ نے جس دشت کا تصور کیا ہے اُس کے مسافر کا نام ایوب خاور ہے اور اُس کی توفیقات، عزائم، اُمیدوں اور بشارتوں کا نام گلِ موسمِ خزاں ہے۔ موسمِ خزاں کا لفظ اُس کی زندگی کی محرومیوں کی علامت ہے اور گل اِن محرومیوں کی خاک سے امکانات کے پھول کھلانے کا استعارہ ہے۔

ایوب خاور کی پوری شاعری اُس کے آنسوؤں میں بھیگی ہوئی ہے۔ اُس کے شجرِ تخلیق کی ہر شاخ اُس کے دلِ زخم زخم سے سلگ رہی ہے۔ اُس کی تخلیق کو پوری فضا اُس گہر میں لپٹی ہوئی ہے جو اُس کی نارسا آہوں کے بطون سے ابھری اور چار اطراف میں پھیل گئی ہے لیکن اُسے ماحول کو بدل ڈالنے کا ہنر آتا ہے۔ وہ آنسوؤں سے تبسم طلوع کرنے، کہر سے روشنی ظہور کرنے اور زخموں سے پھول اُجالنے کی صفات سے مالا مال ہے۔ جب وہ کہتا ہے:

سفر ہے دشت کا اور سر پہ رختِ تنہائی
یہ بار بھی اس عمرِ رواں کو ڈھونا ہے

تو بار ڈھونے کا عزم گویا محرومی کے تناظر میں احکامات کا سراغ لگانے کی آرزو ہے۔ جب یہ شعر اُس کی نوکِ قلم پر آتا ہے:

جلتے سورج کے سایے میں خاور
کٹ ہی جائے گا یہ سفر تنہا

تو ہمیں کٹ ہی جائے گا یہ سفر کے آئینے میں ایوب خاور کے عزم کا تمتماتا چہرہ نظر آتا ہے اور پھر جلتے سورج کو سایہ قرار دینا اُس کے حوصلے کا پرتو بن کر سامنے آتا ہے۔ یا پھر:

تھکن نے پاؤں میں کانٹے بچھا دیئے خاور
مگر یہ دھوپ سفر، بے تکان میں نے کیا

تھکن پاؤں میں کانٹے بچھاتی ہے لیکن مسافر اسی تھکن میں بے تکان دھوپ سفر کرتا ہے۔

فروغِ موسمِ گل پیش تھا سو میں نے بھی
خزاں کے زخم کو دشتِ بہار میں رکھا

تو یہ خزاں کے زخموں کو فروغِ موسمِ گل کی طرح دشت کے دامن میں سجا دیتا ہے۔ کچھ نظموں کے ٹکڑے ملاحظہ کیجیے:

عرصۂ وقت کے دامن میں کوئی شاخِ سحر ہے نہ کوئی
شامِ جمال
مگر اک رنگِ ملال

کبھی اُس کا اضطراب اس عنوان سے نظم لکھواتا ہے۔

ابھی موسم نہیں آیا
ابھی تک موسمِ گل لوٹ کر آیا نہیں
کچھ دیر باقی ہے
ابھی اس درد کی چھاؤں میں سانسوں کو رواں رکھنے کا حیلہ ڈھونڈنا ہے
پاؤں میں مٹی کے جوتے، ہاتھ میں کشکولِ جاں
سر پہ کلاہِ غم
قبائے گرد میں لپٹے بدن دیوارِ گریہ سے
لگا کر بیٹھنا ہے اور اُس موسم کا رستہ دیکھنا ہے
جس کی خاطر ہم نے اپنی خاک کے ذرّوں سے اپنے گھر بنائے تھے

وطن کے لیے ایک نظم میں یہ اضطراب، جوشِ اشتیاق کا روپ دھار لیتا ہے۔ وطن شاعر کے لیے کوئی سبز خطۂ خواب ہے جہاں اُس کے رت جگوں کے شمار میں عکسِ گل حرفِ دل کا جمال اور وطن کے موسموں کی مثال بن جاتا ہے اور اُس کے لبوں پر وطن کے لیے یہ سبز دعا اُبھرتی ہے۔

اے خدائے شمس و قمر مجھے
کوئی عمر دے
کہ میں اس نصابِ بہار کو دلِ خستہ حال کی دھڑکنوں میں
دھڑکنے والی دعاؤں کا وہ مزاج دوں
وہ مزاج دوں
جو کبھی ملالِ خزاں کی زد میں نہ آ سکے
جو کبھی بلائے زوال و قحط کی دسترس میں نہ آ سکے

مگر ایک امن کا پھول اس میں کھلا رہے

ایوب خاور جدید بلکہ جدید تر تخلیقی تجربوں کا نمائندہ ہے۔ اُس کے موضوعات غیر محدود ہیں۔ اس کی زبان و بیان میں ایسی تازہ کاری ہے جو انفرادیت اور امتیاز کا شرف لیے ہوئے ہے۔ اُس کے اسلوب میں استعارہ، رمزیت اور نظم و غزل کے جدید مطالبات کے فن اور معنوی محاسن موجود ہیں۔ وہ لفظ کے در کھول کر معانی کے نئے نئے عجائب خانوں تک ہمیں لے جاتا ہے اور خلیق امکانات کو اُن فضاؤں میں ہمیں اُڑا لے جاتا ہے جہاں ہم ناپیدہ اور نادیدہ جہانوں کی سیر کرتے ہیں لیکن ان بیکراں زمان و مکاں بلکہ لازماں اور لامکاں کی مسافتوں کے باوجود وہ اپنا اور ہمارا رشتہ زمین سے استوار رکھتا ہے۔

میری نظر میں ایوب خاور تخلیقی احکامات کی اُس سطح پر ہے کہ اُس نے گلِ موسمِ خزاں میں جس جس افق کا چہرہ ہمیں دکھلایا ہے اُن سے کہیں زیادہ افق اُس کی نگاہوں کے سامنے بے حجاب ہیں اور وہ ایک ایک کر کے ان سب کے منور چہرے ہمیں دکھانے کا عزم رکھتا ہے۔

☆

''دھنک رنگ''

ایوب خاور کا اصل نام ایوب خان ہے جس طرح پاکستان میں بہت سے غالب ہیں مگر جب ہم کہتے ہیں کہ غالب نے کہا تو اس سے مراد ہوتی ہے مرزا غالب نے کہا، اسی طرح جب ہم ایوب خان کہتے ہیں تو اس کا مطلب ہوتا ہے فیلڈ مارشل ایوب خاں، اسی لیے ہمارے ادبی ایوب خاں نے اپنا نام ایوب خاں سے بدل کر ایوب خاور کر لیا تھا کہ کہیں فیلڈ مارشل ایوب خان کے تمام بڑے کام ان کے نام نہ لگ جائیں اور ان کی تمام خوب صورت شاعری جیسے:

سات سروں کا بہتا دریا تیرے نام
ہر سر میں ہے رنگ دھنک کا تیرے نام
ہاتھ الجھے ہوئے ریشم میں پھنسا بیٹھے ہیں
اب بتا کون سے دھاگے کو جدا کس سے کریں
ایک دل تھا جسے پہلے ہی گنوا بیٹھے ہیں
اور اس گھر میں بچا کیا ہے لٹانے کے لیے

یہ اور اس طرح کے بہت سے خوب صورت شعر، غزلیں اور نظمیں فیلڈ مارشل ایوب خان کے نام سے مشہور نہ ہو جائیں۔

اعجاز رضوی

''شدتِ اظہار''

ایوب خاور کچھ اور طرح کے شاعر ہیں، طے شدہ اور رواجی ڈگر سے ہٹے ہوئے، وہ رشتوں کو اور رشتوں سے جڑے جذبوں کو دنیا، اہلِ دنیا اور اس کی ریاکاری سے خلط ملط نہیں کرتے، اپنی شاعری کو سچل رکھتے ہیں اور خود صادق اور سچل رہتے ہیں۔ وجہ اس کی انہوں نے خود ایک جگہ بیان کر رکھی ہے۔

''حقیقت تو یہ ہے کہ شاعری میری محبت ہے لیکن میں اس سے محبوبہ جیسا نہیں محبوباؤں جیسا سلوک کرتا ہوں۔ شاعری کو میں نے اس وقت تک گلے نہیں لگایا جب تک اس نے ضدی بچے کی طرح نوچ نوچ کر اور لپٹ لپٹ کر مجھے اپنے جیسا نہ کر ڈالا۔ چنانچہ میں نے جو کچھ لکھنے کی کوشش کی اس میں ''شدتِ اظہارِ ذات'' ہی کا مسئلہ رہا۔''

زاہد حسن

ایوب خاور کی شاعری

ڈاکٹر ناہید قاسمی
(لاہور)

ایوب خاور واقعی اپنے عہد کے شعرا میں منفرد و نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ یہ انفرادیت نہ صرف ان کی حسین لفظیات سے ظاہر ہے بلکہ ان کی مخصوص دلآویز امیجری سے بھی واضح ہوتی ہے۔ ان کی نظموں کا پیٹرن مثالی ہے اور ان کے مصرعوں کی ترتیب ایسی کشش کی حامل ہے کہ نظم کے آغاز سے اختتام تک روانی اور بہاؤ کا تسلسل برقرار رہتا ہے۔ جب کہ نظموں کی بنت کا انوکھا پن اور نظم وغزل میں برتے گئے موضوعات کو اظہار کے مختلف سانچوں اور زاویوں میں مجسم کرنا بھی ایوب خاور کا اپنا ہے۔ یہ پرکشش انفرادیت ان کے جیسے جینوئن اور حقیقی شاعر ہی کے حصے میں آ سکتی ہے جو جذبہ واحساس اور فکر ودانش کے ساتھ ساتھ بھرپور تخلیقی وفور بھی رکھتا ہو۔

ایوب خاور نے ہر گزرے لمحے کو اس کی اصلی اور سچی گہرائی تک محسوس کیا ہے اور جو ان کی شعری تجربات ومشاہدات کے سرمائے میں اضافہ کرتا جا رہا ہے۔ میرے نزدیک ایوب خاور کی شاعری میں دیہی اور شہری زندگیوں کا خوب صورت اور شائستہ سنگم ہے۔ جبھی تو وہ ''چھت پر سوکھتی مرچوں اور گٹھڑیوں میں باندھے ہوئے دنوں'' کے ساتھ ساتھ خوابوں اور آئینوں کا ذکر بھی کرتے ہیں۔ انہیں رومانویت کی کھلی چاندنی میں رہنا پسند تو ہے لیکن وہ حقیقت کی تیز چمکتی دھوپ میں سفر کرنے سے گریز نہیں کرتے اور اس سب کچھ کو اپنے خاص انداز بیان کے سانچوں میں سے گزار کر اپنی شاعری میں صورت پذیر کرتے رہے ہیں اور یوں اپنی خاص پہچان اور الگ اسلوب ابھار لینے میں کامیاب رہے ہیں۔ ایوب خاور کی ایک خوب صورت نظم بہ عنوان ''یہاں اک نظم رکھی تھی'' کے چند ڈھونڈتے ہوئے کھوجتے ہوئے تجسس مصرعے سنیے۔

''عجب جادوگری ہے کار دنیا بھی
کوئی لمحہ فراغت کا نہیں ملتا
گزرتے وقت کے پہیے سے اپنے پاؤں کا چکر ملانے کی
عبث خواہش میں جتنی دھول آنکھوں میں در آئی ہے
بھلا دیتی ہے
کس کاغذ پہ کتنی نظم لکھی تھی
کہاں کس خواب کے ٹکڑے پڑے ہیں
کون سے کونے میں کس خواہش پہ مکڑی جال بُنتی جا رہی ہے
کون سی دیوار پر کس آئینے میں بے ضرورت عکس رکھا ہے

ایوب خاور ایک ایسے شاعر ہیں جو بہت اداس ہیں۔ کچھ تو اپنی آرزوؤں اور تمناؤں کی شکست پر، کچھ اپنے اردگرد پھیلے کم فہمی اور خود غرضی کے مظاہر پر، کچھ قدرتی آفات کے جبر اور انسان کی بے بسی پر اور کچھ عالمی آفاق پر سے گرجتی آتی ظلم واستحصال کی آندھیوں کی وجہ سے۔۔۔ لیکن اس گھنی گمبھیر اداسی میں بھی وہ ہمت اور حوصلہ نہیں ہارتے ہمیشہ ہر مقام اور ہر موڑ پر اپنے آپ کو بخوبی سنبھالے رکھتے ہیں اور بکھرنے سے بچا لیتے ہیں۔

ایوب خاور بہت ذہانت اور سلیقے سے اپنے افکار و خیالات اور احساسات وجذبات کو شعر میں ڈھالتے ہیں۔ ان کی نظموں کے عنوانات میں اکثر لفظ ''نظم'' تواتر سے آتا ہے۔

نظم تو گویا ایوب خاور کی جان و دل ہے، ان کی محبوبہ ہے۔ اپنی محبت کی تکمیل کی جستجو، اس کے لیے خاص احترام، پھر اپنی محبت کے دیئے سکھوں اور دکھوں کو وہ اپنے منفرد شہر نظم میں خوش دلی اور خوش ذوقی سے بساتے رہتے ہیں آباد رکھتے ہیں اور اُن سے ایک انوکھا لحاظ اور نرالی پاس داری برتتے ہیں۔

اک بگولے کی طرح ڈھونڈتے پھرنا تجھ کو
روبرو ہو، تو نہ شکوہ نہ شکایت کرنا

ایوب خاور نے اردو شاعری کے اساتذہ کا احترام بھی ملحوظ رکھا ہے اور اپنے ہم عصروں سے بھی پہلو تہی نہیں کی ہے۔ دوسروں کی خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے لیکن اپنی انفرادیت کو کسی بھی صورت ترک نہیں کیا۔ ان کی منفرد پرتاثیر تمثال کاری اور ان کی نئی نئی سی بصری امیجری کے سحر کی جھلک سے ذرا لطف لیجیے وہ کہتے ہیں۔

خواب کٹورے، سورج کی دہلیز پہ رکھ کر لوٹ آنے کی سوچ میں دن چڑھ جاتا ہے
پھر دن کا پتھر
شام کی چوٹی تک لانے کی ہمت باندھ کے
بستر سے اُٹھ جاتا ہوں اور دفتر جا کے
سارے ضروری اور ادھورے کام مکمل کرنے کی خواہش کو ناشتہ دان میں بھر کے
گھر سے قدم باہر رکھتے ہی
میں کہیں اور نکل جاتا ہوں
راہ کہیں رہ جاتی ہے

علامت واستعارہ وتشبیہ جو کہ شاعری کا جمال ہیں۔ اس کی منفرد جلوہ گری ایوب خاور کے ہاں نئے انداز سے موجود ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔

اُتر رہے ہیں سرچشم، قافلوں کی طرح
شکستہ خواب، تھکن، چاندنی کی لَو، تیرا غم

پھر ''وہ درختوں سے الگ ہو جانے والی چھال جیسی آرزوئیں'' اور ''آنکھوں میں کاجل کی طرح سجنے کی خواہش'' کا ذکر بھی خاص اپنے ہی انداز میں بیان کرتے ہیں۔

ایوب خاور کی تراکیب بھی ان کی اپنی تعمیر وتخلیق کردہ ہیں۔ جو بہت پرمعنی اور پرکشش ہیں۔

مثلاً چند تراکیب اور مرکبات پیشِ خدمت ہیں۔ خطۂ عمرِ معطل، عکسِ

متروک، دیارِ رخ آئندہ، لوحِ مہتاب، صبحِ تحریر، دشتِ شب رزم، حجرۂ جاں، چشمِ منحرف، تہہ خانۂ عمر گزشتہ۔

آنکھوں کے بھرے ساون پیالے خنجر بہ کف خامشی، خوابِ مقفّل، سینۂ خواب، خس و خاشاکِ آرزو، نوزائیدہ خوابچے، کچے پکے خوابچوں کا ذائقہ، حسنِ منجمد، کتاب بدن، کم بخت محبت، صبحِ حرفِ خواب، بدنام تنہائی، ہوا کا ایڑیوں کے بل پر گھوم جانا، بارش کی ممتا، آئینے کا بحال ہونا، کفن پوش زمانے، شام کی ملگجی، خواب شجر، جھوٹ کی کائی، رات کی گدڑی، نظر کشکول، سانس کی پھانس۔

ان کی شاعری میں سیکڑوں ایسی ترکیبیں اور مرکبات ہیں جو ان کے ہم عصروں میں نہیں پائی جاتیں۔

تفکر ایوب خاور کی شاعری کی شان ہے جو انہیں نئی نئی راہیں سمجھاتا ہے۔ وہ سوچ کے گنجلک پن اور الجھاؤ کا شکار ہرگز نہیں ہیں بلکہ ان کا مثبت رویہ تو دھیرے دھیرے الجھنیں سلجھانے کے لیے سعیِ مسلسل کا ہے۔

یہ کس نے مثلِ مہ و مہر، اپنی اپنی جگہ
وصالِ وہجر کو ان کے مدار میں رکھا
دھاگوں کی طرح الجھ گیا ہے
اک شخص مری برائیوں میں

بلاشبہ ایوب خاور کی غزل کا مزاج رومانوی ہے لیکن وہ کسی دھندلے سے رنگین غبار میں گم سم نہیں ہو جاتے اور سدا اداسی کی دھند ہی میں لپٹے نہیں رہتے بلکہ حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مضبوط اور بلند لہجے میں بات کرنے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں۔

نہیں کہ صرف ہمیں راس آ گئی دنیا
ہماری زد سے نکل کر سنبھل گیا وہ بھی

اور

جن کو حضور شاہ سے اذنِ سخن نہ مل سکا
ایسے بھی کچھ گواہ تھے جرم و سزا کے درمیاں

پاکستان بننے کے فوری بعد جنم لینے والی نسل کے شعرا کی اپنے وطن سے محبت اپنے پیش روؤں سے کسی طرح کم نہیں۔ اپنے عہد کی دانش اور حالات حاضرہ کے تقاضوں کا شعور ان کی شاعری کو حبِ وطن کی مثالی گہرائی دیتے ہیں۔ جب وہ بزرگوں کے دیکھے خواب کی کوئی مکمل اور حسین تعبیر نہیں پاتے تو تڑپ تڑپ اٹھتے ہیں۔

ایسے ہی لمحے میں ایوب خاور علامہ اقبال کے سامنے اقرار اور فریاد کرتے ہیں کہ۔۔۔

''ترے دیکھے ہوئے اک خواب کی تو ہیں نہیں کھلتیں''

پھر ایک اور نظم میں خدا سے دعا کرتے ہیں:

سبھی تو سانس روکے چپ کھڑے ہیں
اور کتابِ ذات کی سچائیوں کی رونمائی اتنی آساں کب رہی ہے۔ رب کعبہ!
ایک ایسا آئینہ دے دے
کہ جس کو سامنے رکھیں تو تیری کبریائی رنگ فرما ہو۔ اندھیرے کے
پروں سے خواب چنتی ایک ایسی صبحِ فردا کو اشارہ ہو
جو اپنی پلکیں کھولے اور ہماری سرزمیں میں سورج مکھی کا کھیت ہو جائے

ایوب خاور کی ایسی ہی عام انداز سے ہٹ کر کہی باتیں، کرنیں بن کر آئندہ کے زمانوں کے پانیوں پر دور تک تیرتی جھلملاتی چلی جائیں گی۔۔۔ لیکن ابھی تو ایوب خاور کو بہت سے کام کرنا ہیں۔

اندھیرے میں بجھائی کچھ نہیں دیتا
بس اک لَو ہے لہو کی بوند کی مانند
جس کی ٹمٹماہٹ میں یہ سارے خواب سایوں کی طرح
سینے کی محرابوں سے لپٹے منتظر ہیں
جیسے کوئی آ کے اُن کے ہاتھ پاؤں کھول کر آزاد کر دے گا

مگر مجھ کو بہت سے کام کرنا ہیں
کسی کے پاؤں کو مٹی کے جوتوں سے چھڑانا ہے
کسی کے حلق میں بوئی گئی پچھلی رتوں کی پیاس فصلیں کاٹنی ہیں
اور کسی خاکستری تن پر کوئی پیراہنِ گل کھینچنا ہے
اے اسیرانِ قفس!
مجھ کو بہت سے کام کرنا ہیں

خاور بھائی آپ بہت اچھے شاعر ہیں۔ مختلف سوچتے ہیں، مختلف لکھتے ہیں۔ میں ہی نہیں بلکہ میرے جیسے بہت سے آپ کے پڑھنے والے آپ کی شخصیت اور آپ کی تخلیقی کاوشوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

''سچل شاعری''

میں بیس پچیس برس ایوب خاور کو اہل زبان ہی سمجھتا رہا۔ ان کے رنگ، روپ نے مجھے ہمیشہ مغالطے ہی میں رکھا، میں نے کبھی ان کے منہ سے پنجابی نہیں سنی، اگر حالتِ خواب میں پنجابی بولتے ہوں تو ابھی تک اس کی بھی رسید وصول نہیں ہو سکی۔ یہ تو تین برس پہلے ایوب خاور نے باتوں باتوں میں بتایا کہ ان کا تعلق چکوال سے ہے۔ میں حیران رہ گیا اور ابھی تک حیرانی میں ہوں، اب سمجھ آیا کہ ان کا قد واقعی پوٹھوہار کے اونچے اونچے پہاڑوں کی طرح اور گفتگو میں مٹھاس چکوال کی ریوڑی کی طرح ہے۔

نعمان منظور

موت کی جمالیات کا شاعر

امجد طفیل
(لاہور)

ایوب خاور کے اب تک تین شعری مجموعے ''گلِ موسمِ خزاں'' اور ''تمہیں جانے کی جلدی تھی'' اور ''بہت کچھ کھو گیا ہے'' شائع ہو چکے ہیں جن میں شامل نظمیں اور غزلیں ہمیں ایک ایسے شاعر کا پتا دیتی ہیں جس کے پاس اپنی بصیرت، اپنا انداز اور اپنا طرزِ اظہار موجود ہے۔ ایوب خاور کی شاعری میں کوئی ایسی بات ضرور ہے جو اسے اپنے ہم عصروں سے جدا کرتی ہے۔ اسے ایک منفرد شاعر کے طور پر اپنا وجود منوانے کے قابل بناتی ہے۔ اب اگر ایوب خاور کی شاعری کے حوالے سے یہ کہا جائے کہ اس کا وزن درست ہے، اسے قافیہ ردیف استعمال کرنا آتا ہے، اس نے شعری محاسن کو خوبی سے نبھایا ہے تو یہ ایسی بات ہوگی جیسے یہ کہا جائے کہ ایوب خاور خاور کو چلنا پھرنا آتا ہے۔

وہ کھانے پینے کے آداب سے واقف ہے کیوں کہ کسی بھی فن کے بنیادی لوازمات پورے کیے بغیر کسی کو اس فن کے دائرے میں داخل ہونے کا اذن نہیں ملتا اور جو لوگ دائرے سے باہر ہوں ان کی شخصیت و فن پر گفتگو ادبی تنقید کی ذیل میں نہیں آتی اسے ہم تعلقاتی گپ شپ قرار دے سکتے ہیں۔ ایوب خاور فن شاعری کے دائرے کے مرکز میں موجود ہے اور اپنے قارئین سے اس بات کا خواہاں ہے کہ اسے سنجیدہ ادبی معیارات کے مطابق پڑھا جائے۔

تخلیق کار کو اس دنیا میں جو باتیں تخلیق پر اکساتی ہیں ان میں سے ایک موت کا اسرار ہے۔ انسانی زندگی کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ مریضانہ اعصابی اداسی اور تنہائی کو جنم نہیں دیتی۔ وہ اس دہشت ناک مظہر کے سامنے کھڑا ہے اور ہر لحہ اپنی طرف بڑھتی موت سے مکالمہ کرتا ہے۔ اس نے موت کو ایک محبوبہ کے روپ میں دیکھا ہے۔ محبت اور موت اُس کے ہاں یوں باہم ہوئے ہیں کہ مرنا ایک خوب صورت لمحۂ وصال کی طرح محسوس ہوتا ہے۔ اس حوالے سے خاص طور پر اس کی نظم ''اپنی موت پر ایک نظم'' کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ جس میں موت اور محبت کے مظہر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں۔ نظم کا انجام ہمیں شاعر کے سکون اور اطمینان کا پتا دیتا ہے۔

مری میت کو مٹی دینے والوں میں
مرے کچھ خواب بچے، کچھ آرزوئیں اور کچھ نظموں کی سطریں رہ گئی ہیں
شام گہری ہونے والی ہے
کفن سرکا کے بس اب آخری بار اک ذرا اپنے لبِ نم ساز سے جاناں!
مری میت کے ماتھے اور آنکھوں اور ہونٹوں پر دوبارہ
ایسے لمحوں کے ستارے ٹانک دو جن کی کرامت
روزِ محشر تک لحد کے سر دا ندھیروں میں مہکتی روشنی بھر دے

موت کو اس طرح قبول کرنے کا رویہ ہمیں صرف سچے تخلیق کاروں کے یہاں دکھائی دیتا ہے کیوں کہ ان کے پاس وہ قوتِ متخیلہ موجود ہوتی ہے جو زندگی کی بے ثباتی کو بقا کا استعارہ بناتی ہے۔ موت کے منظر سے مکالمہ کرتی ہوئی دوسری اہم نظم ''ایک مرتے ہوئے آدمی کے لیے نظم'' ہے۔ یہ کوئی اتفاق کی بات نہیں ہے کہ شاعر نے اپنا دوسرا مجموعہ کلام مرتب کرتے ہوئے ان نظموں کو پہلو بہ پہلو رکھا ہے بلکہ یہ جو میں دوسری نظم کا حوالہ دے رہا ہوں تو یہ کتاب میں پہلے درج ہے اور مجھے یہ دونوں نظمیں ایک فکری تسلسل کی حامل محسوس ہوتی ہے۔ یہ جو مرتا ہوا آدمی ہے یہ کوئی اور نہیں شاعر خود ہے۔ اس بات کی دلیل خود نظم کے باطن میں موجود ہے میں اس نظم سے ایک طویل بند نقل کرنے کی اجازت چاہتا ہوں:

کون ہے وہ!
کس کے کہنے پر تمہارے سینۂ خالی کی محرابوں سے یہ لشکر چمٹتا جا رہا ہے!
اور تمہارے لشکر و طبل و علم کیوں سرنگوں ہیں
تم شکستِ ذات کے کن مرحلوں میں ہو
ادھر دیکھو تمہارے ہونٹ اتنے سرد کیوں ہونے لگے ہیں!
کیوں رگوں میں دوڑتی پھرتی
لہو کی ندیاں جمنے لگی ہیں!
موسمِ گل پر اچانک برف باری کا سبب کیا ہے
کہو! کچھ تو کہو وہ کون ہے
کس سے تمہاری دشمنی ہے!
کس نے پل بھر میں تمہارے جسم و جاں میں موت بھر دی ہے
تمہیں معلوم ہے
اس حسن زادی کا کوئی نام و پتا معلوم ہے
کچھ تو کہو بھائی کہو، کچھ تو کہو نا!
میرے بھائی!
اب تمہیں مرنے سے تو شاید بچایا جا نہیں سکتا
مگر آنکھیں کھلی رکھنا کہ میں اس حسن زادی (رات کی صحباں) کا عکسِ مطمئن
ان بے صدا آنکھوں میں پڑھنا چاہتا ہوں

یہ جو اوپر میں نے طویل اقتباس درج کیا ہے اس کی ساری ساخت ایک مرتے ہوئے آدمی کی کیفیات اور احساسات کو گرفت میں لینے سے عبارت ہے موت کوئی ڈرنے والی حقیقت نہیں بلکہ حسن زادی ہے۔ جس کا عکس شاعر اپنی آنکھوں میں سمونا چاہتا ہے۔ یہی تخلیق کا حسن ہے کہ ایک انتہائی ہیبت ناک مظہر کو جمالیاتی پیرہن پہنا دیا گیا ہے۔ موت کو جمالیاتی رخ سے پیش کرنے کی یہ ادا ہمیں بہت کم شاعروں کے ہاں دکھائی دیتی ہے۔ ایوب خاور اپنے تخلیقی سفر کے آغاز ہی

سے موت کے ساتھ مکالمہ کرنے میں مصروف ہے۔اس کی نظم ''زندگی اور موت کے درمیان ایک نظم'' ہو یا ''ابھی جنازہ اٹھا نہیں ہے''

''زندگی اور موت کے درمیان ایک نظم'' میں تخلیق کار اس ادراک کے باوجود کہ موت ایک اٹل حقیقت ہے، زندگی سے جڑے رہنے کی سعی کر رہا ہے وہ کسی صورت زندگی کا دامن چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔

جاں بہ لب ہیں
مگر اک حرفِ تسلی کے لیے
زندگی ہم تیری دہلیز پہ آ بیٹھے ہیں
ہاتھ میں کاسۂ تدبیر لئے
زندگی ہم تری دہلیز پہ آ بیٹھے ہیں

اس نظم کا تعلق ایوب خاور کی جوانی سے ہے۔شاعر اپنی ساری توانائی کے ساتھ زندگی سے جڑنے کی کوشش کر رہا ہے جوانی میں شاعر کو یہ دعویٰ بھلا لگتا ہے کہ اس کے پاس کاسۂ تدبیر ہے۔اس لیے وہ جاں بہ لب ہونے کے باوجود زندگی سے دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے مگر تھوڑا سا آگے چلیں تو نظم ''ابھی جنازہ اٹھا نہیں ہے'' ہمارے راستے میں آ کھڑی ہوتی ہے۔

ہوا دریچوں میں بند ہے اور خواب آنکھوں میں قید ہیں
اور آہٹیں راستوں میں زنجیر ہو گئی ہیں
محل سرا کے تمام دیوار و در منقش سکوت اوڑھے ہوئے ہوئے کھڑے ہیں
گزشتہ عمروں کی دھول معزول خلوتوں
میں چراغ کی بے لباس لو سے گریز پا ہے
اور آئینے بے صفات و متروک
تخت و ایوان کے حشم کو دوامِ عکس
ملال کا غسل دے رہے ہیں
ابھی جنازہ اٹھا نہیں ہے

دراصل ایوب خاور نے یہ نظم ذوالفقار علی بھٹو کی موت پر لکھی تھی ۱۹۷۹ء میں۔اس نظم کی لفظیات ہمیں بادشاہی نظام کی یاد دلاتی ہے۔شاعر نے ان علامتوں اور استعاروں کا انتخاب کیا ہے جن میں جلال و ہیبت جھلکتی ہے۔لیکن موت کے دستِ فنا کے آگے یہ سب مٹی کے گھروندے ہیں۔اس نظم میں ویرانی، سناٹا، حبس اور سکوت ایک عجیب فضا کی تشکیل کر رہے ہیں۔یہ ساری نظم موت کے استعارے میں ڈھل جاتی ہے۔

اب تک میں نے اپنی گفتگو ایوب خاور کی نظموں تک محدود رکھی ہے اب ہم اس کی غزل کی طرف آتے ہیں۔مجھے ایوب خاور کی غزلیں اور نظمیں پڑھتے ہوئے یہ شدید احساس ہوتا رہا ہے کہ ان کے پیچھے ایک تخلیقی وجدان اور سماجی اور سیاسی شعور کار فرما ہے۔شاعر نے اپنے غزلیہ اشعار میں بھی موت کی جمالیات کو پیش کیا ہے۔

اے جمالِ فن اُسے مت روک کہ تن آسان تھا
تیری دنیاؤں کا خاور صرفِ دنیا ہو گیا

اب ایسا نہیں کہ شاعر اپنی بات کو صرف جسمانی موت تک محدود رکھتا ہے بلکہ اس کے ہاں تو تمنا کی موت بھی جسمانی موت کے المیے سے جڑ جاتی ہے۔

سپرد خاک کیا پہلے ہر تمنا کو
پھر اس کے بعد بچھا دی ہے اُن پہ چادرِ خواب

اس کے ہاں حسرت مٹی میں ملتی ہے۔یا پھر جب یاد موت بن کر دل پر گرتی ہے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کا تخلیقی وجدان اپنے اردگرد کی فضا میں موجود ہر اس بات کو جذب کر رہا ہے جو اس کے جمالیاتی تجربے کو وسعت دے سکے۔

حسرتِ گردِ رہ یار تھی چشم
ذرۂ جاں تھی سو مٹی میں ملی
وہ تری یاد کی پرچھائیں تھی
موت بن کر جو میرے دل پہ گری

شاعر کو اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ موت اختتام زندگی ہے۔مگر جب پروین شاکر کی موت پر لکھی گئی ایک غزل کا مطلع کہا تو گویا موت سے اُس کا احساسِ جمال کشید کر لیا۔

یہ تو سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ مر جائے گا
چاند اک قبر کے سینے میں اُتر جائے گا

اب اس نے موت کی کیفیت کو کیسے نادر انداز میں بیان کیا ہے کہ انسان حیرت سے چونک اٹھتا ہے۔ہم ساری زندگی بھاگ دوڑ کرتے رہتے ہیں ہر لمحے کسی نہ کسی کی تاک میں، کسی کو پانے کے لیے، کچھ حاصل کرنے کے لیے اور جب موت کے ہاتھ ہم تک پہنچتے ہیں تو اس وقت بھی یہی خیال دل میں ہوتا ہے کہ اگر یہ دو چار دن اور رک جاتی تو نہ جانے ہم کیا کر لیتے۔شاعر اسے کچھ یوں رقم کرتا ہے:

شکار آنکھوں کے سامنے تھا مگر مری موت آ چکی تھی
اجل سے کے اٹل ارادوں کے سامنے آسمان تھا میں

ایوب خاور کی شاعری کا جائزہ میں نے صرف ایک خاص زاویہ سے لیا ہے اور جن نظموں اور غزلیہ اشعار کا حوالہ دیا گیا ہے ان سے ہٹ کر بھی ان کا وفات پا جانے والے تخلیق کاروں کے لیے نظمیں لکھنا اسی زمرے میں شامل کیا جا سکتا ہے۔اس حوالے سے انہوں نے طاہرہ نقوی، فیض احمد فیض، احمد ندیم قاسمی، علامہ اقبال، اختر حسین جعفری، استاد نصرت فتح علی خاں، دل دار پرویز بھٹی اور پروین شاکر کے لیے جو نظمیں لکھی ہیں وہ موت کو ایک جمالیاتی استعارے کے طور پر قاری کو ایک ایسے پُل صراط پر لا کھڑا کرتی ہے جہاں منظر اور پس منظر عکس اور آئینے کی طرح مربوط دکھائی دینے لگتا ہے۔اسی نکتۂ اتصال نے ایوب خاور کے تخلیقی وجدان کو ایک ندرت اور شاعری کی ایک انوکھی جہت سے ہم کنار کیا ہے۔

''محبت کی کتاب''

عارف وقار
(لاہور)

مغرب کی کلاسیکی روایت میں ڈرامے کو شاعری سے الگ کرنا ممکن نہیں اور مشرقی روایت میں شکنتلا سے لیکر پارسی تھیٹر تک اور بعد میں آغا حشر کے دور تک موسیقی اور شاعری کا ڈرامے کے ساتھ چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ چلتے مکالمات کے دوران اچانک کردار اشعار پڑھنے لگتے ہیں یا گیت گانے لگتے ہیں۔۔۔ اور اس مترنم وقفے کے بعد پھر سے کرداروں کی گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ یہی روایت آگے چل کر فلمی گیتوں کا روپ دھار گئی۔

یہ تمام پس منظر اپنی جگہ، لیکن 'منظوم ڈرامہ' بہرحال ایک الگ صنفِ ادب ہے اور اسے بیسویں صدی میں رواج ملا جب ریڈیو کے ذریعے ڈرامے کی تفریح گھر گھر پہنچنے لگی۔ مکمل طور پر منظوم ڈرامہ ہماری سٹیج پر رواج نہ پا سکا اور نہ ہی فِلم میں اسکی گنجائش پیدا ہوئی۔ کیفی اعظمی کا لکھا ہوا ہیر رانجھا کا مکمل منظوم سکرپٹ اس سلسلے میں غالباً واحد اِستثناء ہے۔

اردو کے معروف شاعر اور تمثیل کار ایوب خاور نے اب ایک انوکھا تجربہ کیا ہے یعنی شاعری، ڈرامہ نگاری اور ہدایت کاری کے فنون کو ایک ساتھ استعمال کرتے ہوئے 'محبت کی کتاب' تخلیق کی۔ یہ ایک منظوم ڈرامہ تو ہے ہی لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ اس میں سٹیج کی ہدایت بھی منظوم کر دی گئی ہیں، گویا کھیل کے تمام تر عمل کو سرتاپا نظم کے رنگ میں ڈبو دیا گیا ہے۔

''بھارت کے معروف فلم ساز، کہانی کار اور شاعر گلزار نے کتاب کے پیش لفظ میں اسے تین تہوں والی تخلیق قرار دیا ہے یعنی ایک ایسی تخلیق جس میں شاعری، موسیقی اور ڈرامہ ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔''

ویسے تو یہ ایک سیدھی سادی پریم کہانی ہے، لیکن مصنف نے اسے آج کے دہشت بھرے پس منظر میں تحریر کیا ہے، جب ہر طرف بے یقینی کے بادل چھا رہے ہیں اور بم دھماکوں کے جلو میں انسانی زندگی کی قیمت پرکاہ سے بھی کم ہو چکی ہے۔

یہ سنبل اور ظفر کی کہانی ہے۔ دو معصوم روحیں جو اپنی محبت کو بچاتے ہوئے دہشت گردی کا شکار ہو گئیں۔ کہانی کار نے خود کو آج کے نوجوانوں کی زندگی میں ضم کر کے ایک نئے تجربے اور تازہ احساس سے سناشائی حاصل کی ہے اور یوں لڑکے اور لڑکی کے ساتھ ساتھ ایک تیسرے کردار کے خدوخال بھی انتہائی کامیابی کے ساتھ تراشے ہیں۔ یہ تیسرا کردار آج کے ہر نوجوان کا ساتھی ہے۔ اُسکی زندگی کا جزوِ لاینفک اور اس کے رہن سہن کا اٹوٹ انگ ہے۔

جی ہاں، یہ تیسرا کردار ہے موبائیل فون۔ بظاہر پلاسٹک کی ایک بے جان سی ڈبیا۔ لیکن باطن میں ہر طرح کے جذبات وخیالات کے انبار لیے۔ یہ فون کبھی گہری نیند سوتا ہے اور کبھی ہڑبڑا کر جاگ اُٹھتا ہے۔ یہ تڑپتا ہے، تلملاتا ہے، سر پٹختا ہے اور پھر بے حس بھی ہو جاتا ہے، لیکن جب مستی میں آتا ہے تو پھر جھومتا ہے، ناچتا ہے، مسکراتا ہے۔

''سنبل افراز بہت غصے میں
اپنا سیل فون کہیں پھینکتی ہے
فون ڈریسنگ کے آئینے سے ٹکراتا ہے
آنکھ کھُل جاتی ہے آئینے کی
اور حیرت سے وہ سنبل کی طرف دیکھتا ہے
۔۔۔ڈر سا جاتا ہے کہ اب
جیسے وہ توڑ ہی دے گی اس کو۔۔۔
مگر ایسا نہ ہوا۔۔۔
اپنے ہی خول میں دُبکا ہوا، سہما ہوا سیل فون اٹھا لیتی ہے''

کھیل جوں جوں آگے بڑھتا ہے آپکو احساس ہوتا ہے کہ غیر انسانی کرداروں میں صرف فون ہی نہیں بلکہ آئینہ بھی پیش پیش ہے، اور مزید آگے چلیئے تو آپ کو دھوپ، ہوا، شام، چاند اور سمندر بھی انسانی کرداروں کے ساتھ ساتھ سانس لیتے نظر آئیں گے۔

محبت کی اس کتاب میں ظفر اور سُنبل کی کہانی ایک ویلنٹائن ڈے پہ شروع ہوتی ہے اور سال بھر تک دہشت بھری فضا میں منڈلانے کے بعد اگلے ویلنٹائن ڈے پر دم توڑ دیتی ہے۔ دو محبت بھرے معصوم دلوں پر اس ایک برس میں جو بیت گیا، وہ صرف اُنھی کی نہیں بلکہ ہزاروں دیگر نوجوانوں کی داستان بھی ہے۔

بھارت کے معروف فلم ساز، کہانی کار اور شاعر گلزار نے کتاب کے پیش لفظ میں اسے تین تہوں والی تخلیق قرار دیا ہے یعنی ایک ایسی تخلیق جس میں شاعری، موسیقی اور ڈرامہ ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔

کتاب کا سرِ ورق ویلنٹائن کی مناسبت سے تیار کیا گیا ہے اور عرصہ دراز کے بعد ایک خوبصورت ٹائیٹل والی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے جسے پڑھنے سے پہلے قاری دیر تک اس کے سرِ ورق کی نقش کاری سے محظوظ ہوتا رہتا ہے جس میں سرخ چھتری تلے مقدر کی سیاہی میں رنگے دو نوجوان سائے قدم بہ قدم اپنے انجام کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

''مردِ میدان''

ایوب خاور بطور شاعر، ڈرامہ نگار اور ہدایت کار ایسا مردِ میدان ہے کہ جو گھوڑے کو دوڑتا بھی اپنی مرضی سے ہے اور چابک کا استعمال بھی نہیں کرتا۔

امجد اسلام امجد

"چہارسُو"

"بادلوں کے رتھ پر سوار"

ایل آر ایس پرساد (بھارت)

ترجمہ: ایوب خاور

اتوار کا دن

اور پھر میں نے دیکھا
وقت کی لہراتی ہوئی شال میں ہنستی، مسکراتی دو نوخیز کرنوں کو
جو حبس بھرے پنجرے کی سلاخیں توڑ کر
بادلوں کے رتھ پر سوار
اپنے سرسبز پھلوں اور پھولوں سے بھرے باغ کے اوپر
تیرتے ہوئے آزادی کا گیت گنگنا رہی تھیں
اور اب
بادلوں کی نرم اور بے وزن شال کے پروں سے اترتے ہوئے
سن رہی تھیں وہ
سرسبز درختوں، پرندوں، پودوں، پھولوں اور
پھلوں کا استقبالیہ گیت
تتلیاں اور چڑیاں
انہیں دیکھ کر فرطِ مسرت سے چہچہا رہی تھیں
وہ درخت
جن کے پھل تُرش ہوتے ہیں، ان کے ذائقے بھی میٹھے ہونے لگے

اتوار کے اُسی دن
دہشت، خوف اور زندگی کی بے ثباتی میں لپٹا ہوا لوگوں کا بے ترتیب ہجوم
سیلابی ریلے کی طرح کہیں معدوم ہو گیا
سمندروں سے اُس پار
پُر آشوب اور قتل و غارت گری میں لپٹا ہوا ملکِ شام
اور فلسطین کی موت زدہ خاموشی
خون آلود لاشوں سے لدی ہوئی کشتی
اور ایک سنسان قبرستان۔۔۔ میں نے دیکھا
میں نے دیکھا
آلان کُردی کو
ایک بچے کی طرح گہری نیند سے اٹھ کر
اُسی قبرستان کی طرف آتا ہوا
جس کے ایک کنارے پر میں کھڑا تھا

پیر کا دن

موت کے بازوؤں میں دم توڑتی زمین کو
ایسی امداد کی ضرورت نہیں ہوتی
جو کسی یخ بستہ دل کے ہاتھوں نے گرائی ہو اُس کی گود میں
خدا کی طرح ہمیشہ زندہ رہنے کی خواہش کا مطلب یہ نہیں
کہ ظالم کے ہاتھوں مظلوم کی ہتھیلیوں پر
لہو میں گوندھی ہوئی ریت کے دانے رکھ دیئے جائیں
ڈراؤنے خوابوں کی طرح
چیختی چنگھاڑتی زندگی کے گہرے سایوں کے بیچ
اگر آزادی کا سورج طلوع ہونے لگے
تو اس آزادی کا اصل روپ کیا ہوگا
بے شک سدھائے ہوئے طوطے آزاد نظر آتے ہیں
مگر ان کے پَر کٹ چکے ہوتے ہیں

کل بہت تیز بارش ہوئی
گولیوں اور گرینیڈز کی بارش
تازہ ہوا قید کر کے اس کی جگہ کیمیائی گیس چھوڑ دی گئی
بڑی طاقتوں نے اپنی بقا کے لیے
چھوٹے ملکوں کو میدان جنگ بنا کر یہ اعلان کر دیا ہے کہ
اسی ہوا میں سانس لی جائے
جانے پہچانے محبِّ وطن
اپنی محکوم سرحدوں پر
بارودی سرنگوں کو چیر کر
فضا میں اڑتے ہوئے میزائلوں کے ٹکڑوں کی طرح بکھر رہے ہیں
کیا مادرِ وطن کے لیے
اُن کی آنکھوں میں ایسے ہی منظروں کے خواب تھے؟

○

منگل کا دن

زندگی کے تمام دکھ
سیاہ اور نیلے رنگوں میں بدل جاتے ہیں
اور وہ۔۔۔
وہ حکم دیتے ہیں کہ اپنے جذبات کو برہنہ مت کرو
ڈھانپ کر رکھو
زرد، سفید اور اُودی رنگوں سے مت ظاہر ہونے دو اپنے زخم
اگرچہ وہ درد کی شدت سے پھٹ ہی کیوں نہ پڑیں
تمہارے بھائی کے گلے پر مذہب کی تیز دھار چھری رکھ دی گئی ہے
اسے ماورائی فتح کی بیش قیمت خوراک دے کر
تمہیں اُس سے محروم کر دیا گیا ہے
اب وہ اُسے نفرت، بے حسی اور حیوانیت کے زیور سے
آراستہ کریں گے
اور پھر ایک خود کُش کشتی میں بیٹھا کر لہو کے دریا میں دھکیل دیں گے
جس کی پرورش کی ہے انہوں نے
مامتا بھرے دودھ کی بجائے نفرت ملا دودھ پلا پلا کر
اس کے آرام کے لیے ماں کی گود ہوگی نہ مامتا بھری زمین
اب وہ جنگل بھری دنیا میں مار دینے کے لیے تیار ہے
''اس طرف یا اُس طرف''
اب کوئی ضرورت نہیں کسی راستے کے انتخاب کی
اُسے ہر حال میں ایک خون کی دلدل میں دھنسی ہوئی
سرزمین کو پار کرنا ہے
حماقت کو
اچھے برے کی تمیز کب ہوتی ہے!
مگر تمہیں نظر رکھنی ہے ایسے گمراہ کر دیے گئے
اَن گائیڈڈ (Unguided) میزائیلوں پر
جو ہمیشہ معصوم لوگوں کی جان لے کر اپنے لیے جہنم کا سودا کرتے ہیں

بدھ کا دن

یہ تمہاری شادی کی سالگرہ کا دن ہے
پلاسٹک کے چہروں پر اُدھارے آنسو، چیخیں
آئے ہوئے تمام مہمانوں کی آہ و بکا اور دعائیں تمہیں مبارک
مکمل کی حمیت کے نام
سرجیکل اسٹرائیک
کچھ لوگ شدید زخمی سروں سے بہتے ہوئے خون کے قطروں کو
ٹپکتا دیکھتے دیکھتے
دشمن کی پہنچ سے دور بھاگتے جا رہے ہیں
یہ سو سال پہلے کی بات ہے
دونوں بھائی تھے
ایک ایسے گاؤں میں رہنے والے دو بھائی
جس کی حدود نہیں تھیں

کیا ہماری یادداشت کھو چکی ہے
یا سراب تھا سورج کی کرنوں کا
یا جادو بھرا کوئی صحرا
یا پھر مہربانی تھی اوپر والے کی
جسے ریت اور تپتے سورج کی کرنوں نے جنت میں ڈھال دیا تھا

ریت اور ہوا تب بھی ویسی ہی تھی
جیسی اب ہے
مگر خون کی بوندیں اور آنسوؤں کے قطرے
اس خشک دھرتی کے سینے پر مسلسل ٹپک رہے ہیں
اس مہیب، خوفناک، انجان اور تقسیم کر دینے والے صحرا کی ریت پر
کھینچو۔۔۔ایک لکیر
امن کی لکیر
بھائی چارے کی لکیر
جو اِدھر بھی ہو اور اُدھر بھی

جمعرات کا دن

میں مطمئن اور آسودہ ہوں
زیتون کی شاخوں سے ڈھکی محراب پر
ایک فاختہ بیٹھی تھی
اور کہہ رہی تھی
میں مطمئن اور آسودہ حال ہوں
جب میں روتی ہوں
تو اس محراب پر بیٹھے باقی پرندے اُڑ جاتے ہیں
میں نے ان کھیتوں کی حقیقت جان لی ہے
جن میں سرسوں کے پھول لہلا رہے ہوتے ہیں
مگر پرندے جب زیرِ زمین چلے جاتے ہیں
تو برفیلے موسموں کی ٹھنڈک میں اُن کے گھروندے منجمد ہو جاتے ہیں
وہ اپنے آرام کے لیے سکون مانگتے ہیں
اور جب انہیں کسی ماورائی طاقت کی طرف سے خیر کی کوئی خبر نہیں ملتی
تو پھر وہ قیامت کے آنے کی دعا کرتے ہیں
اور قبول کرنے پر راضی ہو جاتے ہیں،
تختۂ دار پر لٹکا دیے جانے والے باغیوں کی پیش گوئیاں
پھر نہ بھیڑوں کی کھال پر اُون اُگتی ہے
نہ سنہرے دن باقی رہتے ہیں
نہ محبت بھرے گیت، نہ کوئی بربط نواز
نہ آسمان سے صحیفے اترتے ہیں اور نہ ہی طوفانِ نوح
اور جب بادلوں کی پیشانیوں پر قوسِ قزح نمودار ہوتی ہے
تب قدرت کی طرف سے آتا ہے ایک بلاوا
تب میں زیتون کی شاخ لیے
امن و آشتی کے پروں پر سوار پرواز کرتا ہوں

○

جمعہ کا دن

شاہینوں کا ایک قافلہ
دیکھ رہا ہے ست رنگی زمین کا حیران کن عکس
آسمان کی بلندیوں سے
زمین زادوں نے انتہائی باریک بینی کے ساتھ
مسلسل
کُتّوں اور ان کے جنگجو رکھوالوں کو مدعو کر رکھا تھا
جو اپنی تمام مہارت کے ساتھ مسلسل خاکوں اور تصویروں کے ذریعے
فاختہ کے پروں میں پھڑ پھڑاتے ہوئے امن کے نعرے کو غلط ثابت
کرنے کی کوشش کر رہے تھے
اور ماہی گیر پوری طرح تیار تھے
منجنیقوں کے ذریعے امن کی فاختہ کو تباہ کرنے کے لیے
دنیا کے تمام خطوں کو بے نشان کر کے
اپنی مرضی کی حد بندی کرنے کے لیے
تمام پرندے موت کی دعائیں پڑھ چکے تھے
تب قسمت کی دیوی آگے بڑھی
اور اقتصادی راہداری میں داخل ہوئی
اور پانی پر بنے راستوں پر دونوں اطراف پھیلی ہوئی
خوابوں کی سرزمیں پر
خوبصورت رنگوں اور لمبی دموں والے پرندوں کے سروں پر
پھولوں کے تاج سجا دیے گئے
بیمار اور کمزور قوموں کے راستوں پر کالک پھیر دی گئی
اور چھوڑ دیا گیا انہیں سفید رنگ کی چکا چوند میں
جہاں ٹرمپ، اپنے ٹرمپٹ پر جنگی ترانے کی ایک مخصوص دھن بجا بجا کر
اپنے حواریوں کو تختِ شاہی کے سایے تلے جمع کر رہا تھا
ٹرمپٹ کی پھنکار ایک نئی عالمی جنگ کی دھمکی سے شعلہ بار تھی
اور اُدھر
ایٹمی ہتھیاروں کی پنیری لگائی جا رہی تھی
ایک ناقابلِ توجہ اور غیر ضروری سرزمین پر
جو اب تک ایٹمی اثرات سے پاک تھی
جہاں ذات پات، اعلیٰ اور ادنیٰ، مذہبی اختلافات میں الجھے ہوئے
اور نفرتوں کے پالے ہوئے انسانی روپ میں گدھوں کے گروہ
ایک وحشیانہ رقص میں مبتلا تھے
کوئی امید کی کرن!!!
کہ جنگ کے گھنے بادلوں کی سیاہی
امن کی قوسِ قزح میں تبدیل ہو جائے
نفرت اور مفادات کے رس میں رچے ہوئے پھل
انسانی آبادیوں پر گرنے سے پہلے ہی سوکھ جائیں
کیا توسیع پسند حاکموں کے خونی ارادوں سے سینچے گئے
بموں اور میزائیلوں کے بوجھ سے لدے ہوئے درختوں
اور آسمان کی نیلاہٹ کو اسی طرح زہریلے دھوئیں سے
میلا کرتے رہیں گے؟

○

ہفتہ کا دن

ابھی وقت نہیں بدلا
سمندری ساحلوں پر چلتی ہوئی خوشنما ہوا
اور شفاف برف کے پگھلتے ہوئے اُولوں جیسے دریا
انسانی اعضا اور کوڑا کرکٹ سے اَٹے ہوئے ہیں
زندگی کے تمام عناصر
غلاظت، گندگی اور کمینے پن سے لدے ہوئے ہیں
جنہیں اصل حالت میں لانا ممکن نہیں
ہم ساحلِ سمندر کو کبھی نہیں پا سکتے
جب تک تباہ شدہ پناہ گیر بچوں کے بوسیدہ ڈھانچوں کو
پراسرار اور نہ سمجھ میں آنے والی حالت میں نہ دیکھیں
جب تک دلوں کو چیر دینے والی چیخوں کا ہجوم
ہمارے کانوں میں نہ ٹکرائے

یروشلم کی دیواروں میں منہدم باغات کی تعمیرِ نو کے ساتھ ساتھ
دوسرے باغات کی تعمیر بھی ضروری ہے
ان کی اینٹوں اور دیواروں کو بوٹس اور میزائیلوں سے تبدیل کر دو
کیونکہ ان کے در و دیوار کی آہ و بکا پوری دنیا میں پھیل رہی ہے
اس آہ و بکا کے خوف سے کئی ستاروں کے پاؤں پھسلے
اور سمندر کی اتھاہ میں جا گرے ہیں
ان کی چیخوں کے خوف سے
انسانی گوشت کے ٹکڑے سسک رہے ہیں
آسمان کی طنابیں افق کی گرفت سے نکل چکی ہیں
اور روشنی افق سے اُس طرف ہی کہیں گم ہو گئی ہے
دنیا کی تمام کمزور آوازیں آنسوؤں سے تر ہو کر
غصے کی آگ میں تبدیل ہو رہی ہیں
ہمیں عیسیٰ کی صلیب یاد ہے
ہمیں آخری پیغمبر کا مدینہ یاد ہے
ہم نے دیکھے ہیں سارے مزارات اور دوسرے خداؤں کے معبد بھی
ہم غربت اور بھوک سے نمٹ رہے ہیں
ان تمام قیامت خیز دنوں سے گزر چکے ہیں،
جو مسلط کیے ہیں ہم پر اس جنگ نے
مگر کہاں ہیں وہ صدیاں!
جو تہذیب و تمدن، علم و ادب، محبت اور امن کا گہوارہ تھیں
سرسبز و شاداب نخلستان انسانیت کے آنسوؤں میں ڈوبے،
کھڑے ہیں اس دریا کے کنارے
جس میں صدیوں سے انسانی خون اور آنسو گلے مل کر
بہتے چلے آ رہے ہیں

○

چھٹی کا دن

گول میز کی طرح گول دھرتی کے اردگرد
چوکور چہروں والے کچھ بزرگ بیٹھے ہیں
ایک طویل چپ کے سناٹے میں
اُن کے چہروں اور اُن کی آنکھوں میں کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں
مگر یہ لوگ فیصلہ کرنے والے ہیں
حق و باطل کے آخری معرکے کے بارے میں

اچانک بادلوں سے اَٹے ہوئے آسمان کی اونچائی سے
فاختہ کی شکل جیسی کوئی مخلوق
آس پاس کی ہر شے سے نظر بچا کر
شاہینوں سے مماثل ڈرونز کا تعاقب کرتی دکھائی دی
ان سب نے نیچے آ کر جنگ زدہ زمین کے سینے پر
اپنے اپنے ہونٹ رکھ دیے
اور کر دیا آغاز مقدس دعاؤں کی تلاوت کا
توارت، انجیل، بائیبل، بھگوت گیتا اور قرآن پاک کے علاوہ
اور کئی دوسری مقدس کتابوں میں دھڑکتی دعاؤں کا
ان کے دل امن عالم کی خواہش سے لبریز تھے
وہ ساری معلوم و نامعلوم کائناتوں کے خدا سے ہمکلام تھے
کچھ دیر کے لیے
آسمان پر چھائے ہوئے بادل گرجے
اور ان کی دبیز تہوں میں سے بجلی کی ایک تیز دھار لکیر نمودار ہو کر

قوس قزح میں تبدیل ہوگئی
ایک سکون آمیز لمحے میں
پھر ایک ماورائی حکم نازل ہوا
جس میں جنگ اور جنگ میں ملوث طاقتوں کے لیے
ایک اعلان تھا
''آج کا دن جنگ کے لیے مستقل چھٹی کا دن ہے''

○

مقدس دن

جنگ وجدل کے تاجر
گھر واپس آتے ہوئے بہت شرمندہ تھے
چیخ چیخ کر رو رہے تھے
اپنی قاتل فطرت کو زنگ لگتا دیکھ کر وہ فکرمند تھے
کہ اگر جنگ اور قتل وغارت سے پاک یہ دن طویل ہوگیا
تو سائنس کی ترقی کا کیا ہوگا
اگر ہر شخص نے امن کی زندگی گزارنے کا عہد کرلیا
تو جنگ وجدل کی اہمیت کو
کون تسلیم کرے گا، اس کمزور اور بزدل دنیا میں
ماہرین جنگ کیا اس امن وامان کی یکسانی میں
خوش رہنے کے لیے کوئی خاص جراثیم چھوڑیں گے؟

یکسانیت ایک ایسی اذیت ناک بیماری ہے
جیسے برداشت کرنا انسانی اعصاب کے بس کی بات نہیں
وہ اینٹی وائرس پر قابض ہوجائیں گے
بلکہ بیچ دیں گے سود کی چھوٹی سی رقم حاصل کرنے کے لالچ میں
کون آمادہ کرے گا لوگوں کو یہ وائرس خریدنے پر؟
محبت اور دوستی کو نہ تو زبردستی گلے لگایا جاسکتا ہے اور نہ
اس کے لیے کوئی دوا ایجاد کی جاسکتی ہے
سو
شہنشاہِ وقت نے لوگوں کے دلوں سے
محبت، دوستی، رحم اور ترس کھانے پر مائل کرنے والے جراثیموں کو ختم کرنے
اور تمام محکوم سائنسدانوں اور ذہین وفطین لوگوں کو زندہ درگور کردیا ہے
اور اس پاک دن کو امن کی بجائے زمانۂ جنگ کی بقا کا دن قرار دے دیا

○

فیصلے کا دن

انہوں نے پہلے گہری خندقیں کھودیں
پھر تمام ایٹمی ہتھیاروں کو خندق کے پیٹ میں زندہ دفن کردیا
ابدی نیند سونے کے لیے
پھر انہوں نے دوبارہ دیکھا
آسمان سے نیچے آتا ہوا فاختاؤں کا ہوائی قافلہ
محتاط اُڑان کے ساتھ
رُوپوش شاہینوں کے ساتھ گفتگو کرنے کے لیے
انہوں نے عبادت گاہوں کو بند کردیا اور شہر بدر کردیا
اُن زمینی پیشواؤں کو
جو جنگ اور دہشت گردی کے اسباب پیدا کرتے ہیں
اُن تمام منصفوں اور غیر انسانی فیصلوں کی حمایت کرنے والے
جنوں اور بھوتوں کی شکل والے وکیلوں کو
جو بظاہر امنِ عالم کے علمبردار کہلاتے ہیں
اور ادھر
وہ تمام اینٹی وار چیمبرز میں اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے مسکرا رہے تھے
بھیانک چیخ وپکار اور آہ وبکا کے بلند ہونے کے انتظار میں
وہ جانتے تھے امن وامان کے وقت کو بھی
آخرکار جنگی تباہیوں کی قبر میں دفن ہونا ہوتا ہے
خنجر کی دھار پر پاؤں جمائے
نوعِ انسانی کو
ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گرنا ہے اندھیرے کی ایسی کھائی میں
جس کا کوئی اَنت نہیں
اس امید پر کہ اس کی کوئی انتہا تو ہوگی
یہ ہماری مدد کرے گی
دادرسی کرے گی
اور ہمارے گناہوں کو درگزر کرکے معاف کردے گی ہمیں

○

صدرِ مملکت جناب ممنون حسین سے اعزاز وصول کرتے ہوئے

احمد ندیم قاسمی، پروین شاکر اور نوشی گیلانی کے ساتھ

ضیا محی الدین صاحب کے ساتھ

محمد قوی خان اور عابد کاشمیری کے ساتھ

فاطمہ ثریا بجیا اور قاسم جلالی کے ساتھ

راحت فتح علی خان کے ساتھ

دوپٹہ

محمد بشیر مالیر کوٹلوی
(ہندوستان)

انور خان تقریباً پچپن کے لپیٹے میں ہوگا۔ ہونٹوں کے اوپر پروقار پٹھانی مونچھیں، کالی مہندی سے رنگے سر کے بال، گورا گلابی رنگ، چوڑی چھاتی اور دراز قد دیکھنے میں پنتالیس سے زیادہ نہیں لگتا تھا۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد اس کو ہندوستان کے لئے ٹورسٹ ویزہ مل گیا تھا۔ وہ رات ہی جالندھر پہنچا تھا۔ ایک دن تو اُس نے جی بھر کر ہوٹل میں ہی آرام کیا اور ملسیاں کے بارے میں معلومات حاصل کرتا رہا جہاں جانا اُس کے سفر کا مقصد تھا۔ اگلے دن صبح سویرے تیار ہو کر سب سے پہلے وہ درگاہ امام ناصر پہنچا جس کا ذکر اکثر و بیشتر وہ اپنی امی جان سے سنا کرتا تھا۔ صدر دروازے کی خوبصورتی دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ دروازہ دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے یہ اسی سال تیار کیا گیا ہو۔ سامنے کھلا کھلا صحن، بائیں طرف مسجد اور دائیں طرف سرخ رنگ کے کئی کمرے، پیچھے درگاہ۔ درود وفاتحہ سے فارغ ہو کر وہ درگاہ سے باہر نکلا۔ بازار جا کر اُس نے ناشتہ کیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا وہ بستی اڈہ کی طرف نکل گیا۔ چوک میں کافی بھیڑ ہو رہی تھی۔ ایک ٹیکسی والے سے بات کر کے وہ سفر پر روانہ ہو گیا۔ تقسیم وطن سے پہلے ملسیاں میں اُس کا ننہال تھا۔ اُس کی امّی نانا کی اکیلی اولاد تھی۔ نانا کپڑے کے بڑے تاجر تھے۔ انہوں نے ابو کو گھر داماد بنا لیا تھا۔ اس طرح ابو بھی نانا کے کاروبار میں شامل ہو گئے تھے۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ سردی تو تھی مگر قابل برداشت تھی۔ شہر سے نکلے تو دور تک سرسوں کے زرد کھیت لہلہاتے ہوئے نظر آنے لگے۔ باہر کے نظارے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوا۔ وہ دل ہی دل میں حیران ہو رہا تھا کہ پنجاب کے دیہات میں کوئی کچا مکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ شہر کی طرح گاؤں میں بھی خوبصورت کوٹھیاں اور پکے مکانات تھے۔ ٹیوب ویلوں سے اُچھلتا ہوا پانی ہری بھری کھتیاں پاکستان کے دیہاتوں میں بیشتر کچے مکان دیکھائی دیتے ہیں۔ اس کے ملک کا کسان آج بھی جاگیرداری نظام میں پھنسا ہوا ہے۔ ڈرائیور کافی خاموش طبع آدمی تھا۔ ٹیکسی ایک شہر سے گزری تو اُس نے ڈرائیور سے سوال کیا۔

''یہ کون سا شہر تھا۔۔۔؟! ڈرائیور صاحب۔۔۔!!''

''جی۔۔۔ یہ نکودر تھا، بس اگلا شہر ملسیاں ہے۔''

انور کی آنکھوں کے پپوٹے بھاری ہونے لگے۔ وہ اونگھنے لگا۔ ٹیکسی ایک جگہ رک گئی۔ ڈرائیور نے اسے آگاہ کیا۔

''لو صاحب جی ملسیاں آ گیا۔۔۔ یہ بازار ہے۔''

انور نے ٹیکسی سے باہر نکل کر ایک بھرپور انگڑائی لی، کوٹ کی جیب سے پرس نکال کر ڈرائیور کو روپے دے کر اس نے ایک آدمی کو روکا:

''سردار جی۔۔۔ یہاں سردار مہندر سنگھ گریوال کا مکان کہاں ہے۔؟''

اُس آدمی نے تھوڑی دیر سوچا اور کندھے اچکا کر معذوری ظاہر کی اور چل دیا۔ دو تین مزید آدمیوں سے پوچھنے پر بھی اُسے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ سامنے بڑی دکان کے کاؤنٹر پر ایک بوڑھا آدمی بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اُس کے قریب جا کر انور نے اپنا سوال دہرایا۔

''لالا جی یہاں سردار مہندر سنگھ گریوال کا گھر کہاں ہے۔؟''

لالا جی خاموش رہے۔ جیسے انہوں نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ پھر اچانک بولے۔

''اس ہاتھ جا کر آگے سڑک سجّے (دائیں) مڑتی ہے۔ شاہ کوٹ روڈ پر چار کلومیٹر چلو گے تو اُن کا فارم آ جائے گا۔''

ٹیکسی جا چکی تھی چار کلومیٹر کا فاصلہ کیسے طے ہوگا۔ لالا جی اس کی پریشانی دیکھ کر بولے۔

''گھبراؤ نہ باؤ جی۔۔۔ شاہ کوٹ روڈ سے آپ کو بھونڈ مل جائے گا۔ وہ آپ کو فارم کے سامنے اُتار دے گا۔''

انور بڑبڑایا۔

''بھونڈ۔۔۔؟!!''

لالا جی نے وضاحت کی۔

''ہاں جی بھونڈ۔۔۔ تین پہیا ٹیمپو کو پنجاب میں بھونڈ کہتے ہیں۔''

وہ لالا جی کا شکریہ ادا کر کے آگے بڑھ گیا۔ دوپہر کے بارہ بجنے کو تھے۔ وہ شاہ کوٹ روڈ کی طرف مڑا تو وہاں تین چار ٹیمپو کھڑے تھے۔ ایک ٹیمپو ٹھسا ٹھس بھرا پڑا تھا۔ قریب سے گزرتے ہوئے انور نے ایک نوجوان سے پوچھا۔

''یہ ٹیمپو سردار مہندر سنگھ گریوال کے فارم جائے گا۔؟''

سامنے سے سکول کے بچوں کا ایک ٹولا شور مچاتا ہوا آ رہا تھا۔ نوجوان نے ایک بچے کو آواز دی۔

''او گولڈی۔۔۔''

تقریباً دس سال کا خوبصورت بچہ اُس کے قریب آ گیا۔ نوجوان نے اُس سے کہا۔

''اِن بھائی صاحب نے تیرے دادا جی کو ملنا ہے۔ ان کو گھر لے جانا۔''

گولڈی مثبت میں سر ہلا کر اپنے دوستوں کی طرف بھاگا جو ٹیمپو کی چھت پر سوار ہو رہے تھے۔ انور پریشان تھا کہ وہ اس ہولناک بھونڈ پر کیسے سوار ہو۔ ایک نوجوان جو ٹیمپو کے پچھلی طرف ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔ کود کر انور سے بولا۔

''آپ اِدھر بیٹھ جاؤ باؤ جی۔''

انور حیران ہو کر بولا۔

''بھئی تم کہاں بیٹھو گے۔؟''

وہ انور کی بات سنے بغیر ٹیمپو کے سائیڈ پر بنی کھڑے ہونے کی جگہ پر زبردستی کھڑا ہو گیا، اور انور سے بولا۔

''بیٹھو جی بیٹھو۔۔۔''

انور اپنے گہرے نیلے سوٹ کو سنبھالتا ہوا ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا، اور بڑبڑایا۔

''چلو یہ نیا تجربہ ہی سہی۔ چھت پر بیٹھے بچے شور مچانے لگے۔

''او۔۔۔ چل ٹھولو اوئے ٹائم ہو گیا۔۔۔!''

ٹھولو ڈرائیور نے جانے کہا سے رسّی کھینچی کہ ٹیمپو سٹارٹ ہو گیا اور دھیمی چال میں چلنے لگا۔ انور اپنے خیالات میں ڈوبا ہوا بھونڈ کی سواری کا تلخ مزہ لے رہا تھا۔ راستے میں کئی جگہ سواریاں اُتریں ٹھولو کو بار بار رسی کھینچ کر اُسے سٹارٹ کرنا پڑتا۔ بچکولے کھاتا کھلاتا ایک جگہ ٹیمپو رکی چھت سے بچے چیخے۔

''جلدی اُتر اوے گولڈی تیرا گھر آ گیا۔''

گولڈی نے چھلانگ لگائی تو انور بھی کود کر نیچے اُتر آیا۔ گولڈی اپنا بستہ سنبھال رہا تھا۔ انور نے نظر دوڑائی ادھر اُدھر کے مناظر دیکھے۔ دائیں طرف دور تک کھیت تھے۔ کھیتوں کے درمیان درختوں سے گھری ہوئی ایک خوب صورت کوٹھی تھی۔ مین روڈ کوٹھی کی طرف لال پتھر سے راستہ تھا۔ سڑک کے کنارے ہو کے گولڈی نے آسے بلایا۔

''چلو انکل آؤ۔۔۔''

انور نے بڑے پیار سے گولڈی سے پوچھا۔

''تم نے بھونڈ والے کو پیسے کیوں نہیں دیئے۔؟!''

''وہ ٹھولو۔۔۔! ہم سکولی بچوں سے بھاڑہ نہیں لیتا۔ اکر مانگ بھی لے تو ہمارے پاس دینے کو ہے کیا؟ اُس کو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ شیطان ٹولا اُس کا کئی طرح سے نقصان بھی کر سکتا ہے۔''

تھوڑی دیر بعد انور نے گولڈی سے پوچھا۔

''خالہ ستّی ٹھیک ہیں۔۔۔؟''

گولڈی رک گیا تیور بدل کر بولا۔

''تم میری دادی کا نام کیسے جانتے ہو، اور یہ کھالا کیا ہوتا ہے کوئی گالی ہے۔؟!''

انور کان کو ہاتھ لگا کر ہنسا۔

''توبہ، یہ کیا کہہ رہے ہو؟ خالہ کا مطلب موسی ہوتا ہے۔ تمھاری پنجابی میں ماسی کہتے ہیں۔''

گولڈی سوچ میں پڑ گیا۔ یہ اجنبی بندہ (تراشے بالوں والا) میری دادی کا بھانجا کیسے ہو گیا۔

گولڈی کو کسی اجنبی کے ساتھ آتے دیکھ کر عمر رسیدہ مہندر سنگھ چھڑی ٹیکتے ہوئے اپنے بیٹے دیالے کے ساتھ برآمدے میں آن کھڑے ہوئے۔ جب انور قریب پہنچا ڈابر مین کتا جو بندھا ہوا تھا بھونکنے لگا۔ دیالے نے اُسے جھڑک کر چپ کرا دیا۔ بوڑھا گریوال عینک کی ڈنڈی پکڑ کر اُسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگا۔ انور نے قریب پہنچ کر کہا۔

''ست سری اکال۔۔۔!''

ست سری اکال کا جواب دے کر مہندر سنگھ نے سوال کیا۔

''کا کا۔۔۔ میں تینوں پچھانیا نہیں۔۔۔ کون اے؟!! (بیٹا میں نے تمھیں پہچانا نہیں۔۔۔ کون ہو۔۔۔!!)

انور بڑے ادب سے بولا۔

''جی میں انور پاکستان سے آیا ہوں۔ میں خالہ ستّی اور آپ سے ملنے آیا ہوں۔''

گریوال حیران ہو کر بولے۔

''تم یہ نام کیسے جانتے ہو؟! کون ہو تم۔۔۔؟!''

انور نے فوراً جواب دیا۔

''میں اُن کی بہن رجّو کا بیٹا ہوں۔۔۔ انور۔''

گریوال خوشی اور حیرت کے ملے جلے جذبے سے بولے۔

''او یار تو رجّو کا پُتر ہے۔ چاچا سلیمان کپڑے والے کی بیٹی رجو۔۔۔ ہلوں (تقسیم) میں پاکستان چلے گئے تھے۔''

انور بولا۔

''ہاں جی۔۔۔ ہاں خالو جی۔۔۔ میں سلیمان کا نواسا ہوں۔''

مہندر سنگھ گریوال روہانسے ہو کر چھڑی پھینک کر باہیں پھیلا کر بولے۔

''او پُتر جی اتنی دور کیوں کھڑے ہو آ جا آ جا۔۔۔!''

مہندر سنگھ گریوال نے انور کو چھاتی سے لگا کر خوب پیار کیا۔ دیالے نے بھی بغلگیر ہو کر اپنی محبت کا اظہار کیا۔ گریوال انور کو بغل میں لے کر ڈرائینگ روم میں لے گئے۔ ایک نوجوان لڑکی پانی کا گلاس لے آئی پانی پی کر گریوال نے سوال کیا۔

''تمھارے ابّا جی کا کیا حال ہے۔ کئی سال پہلے وہ مجھے ننکانہ صاحب ملے تھے۔ مجھے دیکھ کر پہچان گئے تھے۔ کافی خستہ حالت تھی اُن کی۔۔۔ دو تین گھنٹے ہم ساتھ رہے۔ مجھے لگا وہ مجھے کچھ کہنا چاہتے تھے۔۔۔ پر کہہ نہ سکے۔''

انور خاموشی سے سنتا رہا پھر بولا۔

''اُن کا انتقال ہو گیا، دس سال بیت گئے جی۔''

دیالہ پچھلے دروازے سے ایک معمّر اور کمزور عورت کو سہارا دے کر ڈرائنگ روم میں لے آیا۔ چھڑی ٹیکتی ہوئی بڑھیا آگے آئی تو گریوال جوش میں بولے۔

''ستونت کُرے آ دیکھ کون آیا جے۔۔۔ اج دا دیہاڑہ بڑا ہی شُبھ چڑھا اے۔ (ستونت کور یہ دیکھ کون آیا ہے۔ آ کا دن بڑا ہی مبارک چڑھا ہے۔''

بڑھیا نے خلا میں آنکھیں گھما کر پوچھا۔

''کون اے۔۔۔ کون آیا ہے سردار جی۔۔۔؟! (کون ہے۔۔۔ کون آیا ہے سردار جی۔۔۔؟!''

گریوال بولے۔

''او تیری سہیلی رجو دا پتر آیا ہے تینو ملن لئی (اری تیری سہیلی کا بیٹا آیا ہے تمھیں ملنے کے لئے۔)

بڑھیا نے پھر سوال دہرایا۔

''کون اے۔۔۔کون آیا ہے۔۔۔؟!''

اس بار گریوال زور دے کر بولے۔

''او بولیئے۔۔۔تیری سہیلی رجو دا پُتر تینوں ملن آیا ہے۔(او بہری۔۔۔ تیری سہیلی رجو کا بیٹا تجھے ملنے کے لئے آیا ہے۔''

بڑھیا پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا۔اُس کے ہاتھ سے چھڑی چھوٹ گئی وہ خلاؤں میں گھورتی ہوئی بولی۔

''کی کہیا رجو بھین دا پُتر۔۔۔!!؟(کیا کہا رجو بہن کا بیٹا!!؟)''

وہ جیسے پگلا گئی۔ہوا کو ٹٹولتے ہوئے آگے بڑھی۔

''کتھے ہے۔۔۔کتھے ہے۔۔۔میرا بھانجا۔۔۔اوے آ جا۔۔۔پت سونیا۔۔۔(کہاں ہے۔۔۔کہاں ہے۔۔۔میرا بھانجا۔۔۔آ جا سوہنے بیٹے۔)''

انور کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔اُس نے آگے بڑھ کر ستی کو تھام لیا اور بولا۔

''خالہ۔۔۔ست سری اکال۔''

اُس نے انور کو کانپتی ہوئی بانہوں میں بھر لیا اور بین کرتے ہوئے بولی۔

''وے آ جا پُتا۔۔۔تھونوں اُڈیک اُڈیک کے میں اپنیاں اکھاں گنوا بیٹھی ہے(او آ جا بیٹا۔۔۔آپ لوگوں کا انتظار کرتے کرتے تو میں نے اپنی آنکھیں کھو دیں ہیں)۔''

تھوڑی دیر بعد پُرسکون ہو کر صوفے پر بیٹھ کر انور کا ماتھا چوما چھت کو گھورتے ہوئے اُس نے انور کے چہرے پر ہاتھ پھیرا اور بولی۔

''ناک نکشہ سارا ای رجّو ورگا ای اے۔۔۔(ناک نقشہ سارا ہی رجو جیسا ہے)۔''

انور حیران تھا کہ خالہ نے چھو کر ہی بتا دیا کہ میری شکل میری امی جیسی ہے۔سارا کنبہ اس محبت بھرے ملن کو دیکھ کر حیران تھا۔انور نے پانی کا گلاس پکڑا کر کہا۔

''خالہ پانی پی لو آپ۔''

پانی پی کر ستی نے ایک گہری سانس لی اور انور سے سوال کیا۔

''رجو آپ کیوں نی آئی۔۔اوہ ٹھیک وی ہے(رجو خود کیوں نہیں آئی وہ ٹھیک تو ہے)۔''

انور خاموش رہا اُس کی آنکھیں گیلی ہو گئیں۔ستی نے اپنا سوال زور دے کر دہرایا تو وہ پھپھک کر رو پڑا پھر سنبھل کر بولا۔

''دو سال ہو گئے وہ ہمیں روتا بلکتا چھوڑ گئی۔آپ سے ملنے کی تمنا دل میں لے کر ہی چلی گئی۔مرنے سے پہلے اُس نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں آپ سے ضرور ملوں، بڑی مشکلات سے ویزہ ملا اور میں چلا آیا۔''

ستی آنکھیں پھیلائے فرش کو گھورتی رہی پھر اچانک بڑبڑائی۔

''نئیں نئیں۔۔۔اے کدّاں ہو سکدا اے او بے وپھائیں سی مینو ملے بغیر کداں اکال چلانا کر گئی۔نئیں نئیں او مری نہیں تو جھوٹ بولدا ایں کا کا(نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔وہ بے وفا نہیں تھی۔مجھے ملے بغیر وہ کیسے اکال چلانا کر گئی۔۔۔نہیں نہیں وہ مری نہیں تو جھوٹ بول رہا ہے کا کا)۔''

ستی اچانک کھڑی ہو گئی اور بیرونی دروازے کی طرف لپکی۔

''رجو۔۔۔نی رجو کتھے لگی ایں آ جا گوے(رجو۔۔۔اری رجو کہاں چھپی ہواری آ جا)۔''

دیالے اور اُس کی بیٹی نے اُسے سنبھالہ وہ روئی تو روتی ہی چلی گئی

گریوال نے لڑکی کو اشارہ کیا۔وہ پانی کا گلاس اور ایک گولی لے آئی اور بولی۔

''بے بے دوائی دا ٹائم ہو گیا آ گولی کھالے(اماں دوائی کا وقت ہو گیا۔یہ گولی کھالو)۔''

گولی کھا کر ستی پرسکون ہو گئی تھوڑی دیر بعد خراٹے لینے لگی۔دیالہ اُسے بانہوں میں اُٹھا کر اندر اُس کے کمرے میں لے گیا سب لوگ افسردہ تھے، خاموش تھے۔وقت زیادہ ہو گیا تھا۔سب نے مل کر انور کے ساتھ لنچ کیا۔ پھر چائے کا دور چلا۔پیالی اُٹھا کر گریوال نے سوال کیا۔

''انور بیٹے۔۔۔پاکستان سے بھارت آنا کتنا مشکل تھا؟ لوگ اپنوں سے ملنے آتے ہی رہتے ہیں۔ویزا لے کر ایک بار رجو کو ستی سے ملوا جاتے۔''

تھوڑی دیر خاموش ہو کر وہ گریوال سے مخاطب ہوا۔

''خالو جی امی بتایا کرتی تھیں کہ تقسیم کے وقت اِدھر سے جاتے وقت ماموں عبدالستار تو راستہ میں ہی قتل کر دیئے گئے تھے۔باقی لوگ ملتان کے پاس ایک شہر ہے خانیوال وہاں جا کر رہنے لگے۔کرایہ کا مکان لیا۔ابّو سائیکل پر کپڑا لاد کے دیہات میں جا کر بیچتے تھے۔نانا اور نانی اکثر بیمار رہتے تھے۔اِدھر جائیداد کا کوئی کاغذ نہیں لے کر گئے تھے۔اُدھر کسٹوڈین والے رقم مانگتے تھے۔کوئی رشتہ دار کوئی پہچان والا نہیں تھا۔دو وقت کی روٹی مشکل پڑ گئی تھی۔میرے دو بھائی پیدا ہوتے ہی مر گئے تھے۔میری ولادت 1967 میں ہوئی میرے تین سال بعد میرا چھوٹا بھائی ایوب پیدا ہوا۔نانا اور نانی میرے پہلے ہی فوت ہو چکے تھے۔امی نے کسی سے قرضہ لے کر ابو کو آپ سے ملنے بھیجا تھا۔میں بڑا ہوا تو ابو نے مجھے ایک گیرج والے کے سپرد کر دیا۔میں سکول بھی جاتا اور کام بھی سیکھتا تھا۔پڑھائی چھٹ گئی۔میں گیرج کا ہو کر رہ گیا اور چھوٹی گاڑیوں کا کاریگر بن گیا چھوٹے نے میٹرک کی،اُس کو بھی کام سیکھا دیا۔ہماری محنت ہماری جدّ وجہد کامیاب ہو گئی دونوں بھائیوں کی شادیاں اچھے گھرانوں میں ہوئیں جب اللہ ہم پر مہربان ہوا تو امی چلنے کے پھرنے کے لائق نہ رہیں۔کراچی میں میرا اپنا بڑا گیرج ہے۔چھوٹا بھائی اور میرا بیٹا دوبئی میں سیٹل ہیں۔جب پیسہ آیا تو ماں چلی گئی۔ماں تھی تو پیسہ نہ تھا۔مرنے سے پہلے امی نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں ستی خالہ کو ضرور ملنے جاؤں وعدہ نبھانے کے لئے حاضر ہوا ہوں۔''

سب لوگ خاموش تھے۔گریوال ایک ٹھنڈی سانس لے کر بولے۔

''انگریزوں اور اُس وقت کے لیڈروں کی وجہ سے لاکھوں مارے

گئے لاکھوں گھر سے بے گھر ہو گئے۔۔۔اچھا یہ بتا انور تیرا سامان کہاں ہے اور تیرا ویزہ کتنے دن کا ہے۔''

انور نے جواب دیا۔

''آج 21 ہے مجھے 26 کو بارڈر کراس کرنا ہے واہگہ سے۔۔۔ لاہور سے میری فلائٹ بک ہے۔''

گریوال بولے۔

''ٹھہرے کہاں ہو۔۔۔؟اور سامان۔۔۔؟!''

انور نے بتایا۔

''ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔یہ رہا اُس کا کارڈ۔۔۔سامان وہیں ہے۔ پاسپورٹ شناختی کارڈ ہوٹل میں جمع ہیں۔''

انور سے کارڈ لے کر گریوال نے بیٹے کو دے کر کہا۔

''ویکھ تا دیالے کہڑا ہوٹل ہے؟(دیکھ تو دیالے کون سا ہوٹل ہے۔۔۔؟)''

دیالے نے کارڈ پڑھا۔

''یہ تو سرکاریہ انکل کا ہوٹل ہے۔''

گریوال ہنسے۔

''پھر تو ٹھیک ہے۔دیالے کے سسرال والے ہی ہیں۔باقی ایس۔پی۔آفس میں اطلاع دی۔۔۔؟''

انور پریشان ہو کر بولا۔

''خالو کل میری طبیعت بگڑ گئی۔میں ہوٹل میں ہی رہا۔آج آپ کے پاس آ گیا۔''

گریوال لاپرواہی سے بولے۔

''گھبرانے کی کوئی بات نہیں،کل چلیں گے۔سب ٹھیک ہو جائے گا۔اتنی تو اپنی چلتی ہے یار۔۔۔''

اگلے دن سارا کام قانونی طور پر درست کر لیا گیا۔شام کو سامان گھر واپس لے آئے۔ہنستے کھیلتے چار دن نکل گئے۔انور گریوال کے کنبہ میں یوں گھل مل گیا جیسے اُنھیں کا فرد ہو۔انور کی دیالے سے دوستی ہو گئی۔دونوں لڑکیاں جسی اور نیلو تایا سے اُس کی فیملی اور اُس کے ملک کے بارے میں معلومات حاصل کرتی رہیں۔دیالے کی بیوی نے جیٹھ کو سرسوں کا ساگ مکئی کی روٹی اور چھاچھ کے ساتھ کئی کئی بار کھلایا۔انور مان گیا کہ یہ ٹیسٹ پاکستان میں نہیں ملتا۔انور نے ستّی خالہ سے اپنی ماں کے بارے میں بہت سی باتیں سنیں۔خواب کی طرح چار دن ہوا ہو گئے۔چوتھے دن شام کو انور سامان پیک کرنے لگا۔لڑکیوں نے تائی کے لئے تحائف دیئے۔سبھی لوگ افسردہ تھے۔گولڈی نے سوال کیا۔

''تایا جی ہُن تُسی کدوں آؤ گے۔؟میرے واسطے کرکٹ دی کٹ لے کے آئیو(تایا جی اب آپ کب آؤ گے؟میرے لئے کرکٹ کی کٹ لے کر آئیں)۔''

انور نے اُس کا گال چھو کر پیار سے کہا۔

''اوہ بھتیجے ایک نہیں دو کٹس لاؤں گا۔''

سبھی افراد ڈرائنگ روم میں موجود تھے۔ستّی نیلو کے کندے کا سہارا لے کر سامنے سے آئی۔جسّی ایک کپڑے میں لپیٹے کوئی چیز اُٹھا کر لا رہی تھی۔ستّی نے آواز لگائی۔

''کتھے ایں۔۔۔انور پُت۔۔۔؟(کہاں ہو۔۔۔؟انور بیٹے۔۔۔؟)''

انور نے آگے بڑھ کر اُس کا بازو پکڑ کر اُسے صوفے پر بیٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں اِدھر ہی ہوں خالہ۔''

ستّی بولی۔

''جسی اے۔۔۔لیا۔۔۔آ۔۔۔سان پھڑا مینو۔۔۔(جسی۔۔۔ا۔۔۔ یہ سامان مجھے پکڑا)۔''

جسّی نے کھدر میں لپیٹی ہوئی ایک ہنڈیا ٹیبل پر رکھ دی جو سبھی کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ستی نے کپڑے کی گانٹھ کھول کر ایک کوری ہنڈیا دونوں ہاتھوں سے اُٹھا کر انور کو دیتے ہوئے کہا۔

''انور۔۔۔آلے بھائی پھڑ۔۔۔سامھ اے نوں(انور۔۔۔یہ لے بھائی سنبھال اسے)۔''

وہ حیران ہو کر بولا۔

''خالہ یہ کیا ہے۔؟''

ستی بولی۔

''پاکستان نوں جان لگی تیری ماں مینوا یہہ امانت دے گئی تھی،یہ ہانڈی دے کے اُس نے کیہا سی ستی بھین جیوندی رہی تاں لین ضرور آواں گی ایہہ امانت،مر گئی تے میرا تحفہ سمجھ لئیں(پاکستان جاتے ہوئے تیری ماں مجھے یہ امانت دے گئی تھی۔یہ ہنڈیا دے کر اُس نے کہا تھا،ستی بہن زندہ رہی تو اس کو لینے ضرور آؤں گی مر گئی تو اسے میرا تحفہ سمجھ لینا)۔''

انور کے آنسو ہنڈیا پر گرنے لگے۔ستی پھر بولی۔

''ایہہ تیرے پُرکھاں دی کمائی اے تولے جا تیرا حق بندا اے۔ہُن میں اسانی نال اس دنیا تو چلی جاواں گی۔میرا بوجھ ہلکا ہوئیا(یہ تیرے آباد جداد کی کمائی ہے۔تولے جا تیرا حق بنتا ہے۔اب میں آسانی سے اس دنیا سے چلی جاؤں گی۔میرا بوجھ ہلکا ہوا)۔''

انور نے ہنڈیا کا ڈھکن اُٹھایا۔اُس میں ایک میلا اور بوسیدہ دوپٹہ نکلا انور نے اُسے کھول کر دیکھا اور ستی سے مخاطب ہوا۔

''خالہ۔۔۔!ایسا ہی ایک دوپٹہ میری امی کے پاس تھا۔اکثر وہ اُسے سینے سے لگا کر رویا کرتی تھی۔!''

ستی کی آنکھوں سے کھارا پانی اُبل پڑا وہ کہنے لگی۔

''اوہ دوپٹہ میرا سی دوپٹے بدل کے اسی بھیناں بنیاں سی(وہ دوپٹہ میرا تھا۔دوپٹے بدل کر ہم بہنیں بنی تھیں)''

باقی صفحہ ۹۹ پر ملاحظہ کیجیے

چمکیلی روشنی کا اِک منظرنامہ

سیمیں کرن
(فیصل آباد)

دھوم دھوم دھک دھک، نوبت بج رہی تھی، شور تھا کہ قیامت برپا تھی۔۔۔آئینے میں اُسکی حیرت کچھ ایسے منجمند ہوئی تھی کہ آئینہ چکنا چور پڑا تھا، اُسکی ذات کے پرخچے اُڑ گئے تھے، اُس نے خوفزدہ ہو کر اپنے اِردگرد، اطراف اور کرچی آئینے کے پسِ منظر میں اپنے ماضی کو دیکھا، اُسے دور تک تنہائی ملی!

اُسے لگا کہ یہ آل، اولاد، خاندان، قبیلہ، ہر رشتہ ناطہ اُس کے لیے تمام عمر پرایا ہی رہا۔ وہ سب جو اُسکے حسبی نسبی رشتے تھے، اُسکی شناخت تھے، اُسے شناخت دینے میں ناکام رہے، یہ اُسکے اپنے لوگ۔۔۔مگر اپنے کب تھے! سب نے اپنے اپنے وقتوں میں اُسکا اِستحصال کیا، اُسکی خدائی کا دعویٰ کیا، یہ اپنے کب تھے، یہ تو پرائے تھے!

اپنا پھر کون تھا؟! کیا وہ جس نے ہمسفری کا وعدہ کیا تھا؟ کیا وہ ہمسفر تھا؟ شریکِ ذات تھا؟ کب تھا وہ؟ کب رہا وہ شریکِ ذات؟؟؟!

آج عمر کے اِس زوال میں اُسے محض اِک بوڑھی بوسیدہ پوشاک سمجھ کر کیوں رد کر جاتا؟ وہ جس لباس کو اوڑھے اپنی شناخت سمجھے بیٹھی تھی، وہ شناخت اُس سے کیوں چھینتا؟! اُسکی شناخت کا ہر آئینہ مسخ ہوا پڑا تھا! اُسے لگا کہ قبر ہی بس اُسکی آخری اور پہلی شناخت ہو گی، اِک ایسا گھر جو اُسکے نام ہوگا! بلا شراکتِ غیرے! تو کیا وہ مر گئی تھی؟! نوبت لگاتار بج رہی تھی، دھوم دھک دھک!!!

مسخ شناخت کے آئینوں سے شاید کوئی نئی شناخت جنم لے کہ رات اِک طویل مدت سے بہت تاریک اور گہری تھی، اُسکی تنہائی کی طرح گہری، اُسکے سب اپنے پاس ہو کر بھی اُس سے دور ہو چکے تھے وہ اِک ایسی مسافر تھی جس کے زادِ راہ پہ ڈاکہ پڑ گیا تھا! اُسکی ذات کے کرب سے بے خبر اور انجان تھے!

وہ اذیت سے کراہ اُٹھی، اُسے پھر لگا کہ نوبت بج رہی ہے دھوم دھوم دھک دھک، بلا کا حبس اور قیامت کا شور تھا! سانس اپنے ہی اگلے سانس سے اُلجھ رہی تھی۔

کیا حشر برپا ہونے کو ہے؟! اُس نے خوف سے آواز دینی چاہی، مگر حلق میں الفاظ جیسے پھنس کر رہ گئے، وہ شاید اپنی زبان، اپنی بولی بھی کھو بیٹھی تھی! شاید واقعی حشر برپا ہونے کو تھا۔۔۔جب زمین آسمان میں سب کچھ گڈمڈ ہو رہا تھا، زبانیں بھی اُٹھالی گئیں تھیں، گریہ کرنے کا وقت بھی اُٹھا لیا گیا تھا، لفظوں کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔

اُس نے اپنے ہاتھ پہ چٹکی کاٹی، کیا وہ حالتِ نوم میں تھی؟ کیا کوئی خواب دیکھ رہی تھی؟ اُسکی سسکی اُبھری، وہ شاید خواب دیکھتے دیکھتے جاگ اُٹھی تھی!

لیکن وہ کب اِس قابل تھی کہ طے کر پاتی، خواب و حقیقت کے بیچ فاصلے کو!

دیکھتے ہی دیکھتے اندھیرا دور ہو گیا، ایک عجیب تیز پیلی، چمکیلی، تنہا پُر اِسرار سی روشنی پھیل گئی! جس میں سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا، بہت دور تک صاف!

اُس نے دیکھا کہ وہ اِس روشنی میں بھی تنہا تھی، فردِ واحد!

وہ ہر نسبت سے آزاد ہو کر کُل بنی کھڑی تھی!

اُسکے قرب و جوار، آس پاس کوئی بھی نہ تھا، سوئی بھی گرے تو آواز سنائی دے، ایسا ہولناک سناٹا تھا!

اِس سناٹے میں مگر اِک مہیب و قیامت خیز شور چھپا تھا!!!

کیا یہ گلی، یہ محلّہ، یہ ملک، یہ سرزمین وہی دُنیا تھی جہاں وہ رہتی اور بستی آئی تھی؟!

زماں و مکاں شناخت ہو کر بھی بے شناخت ہو رہے تھے کہ شناخت تو افراد کی نسبتوں سے ہوتی ہے اور وہ یہاں فردِ واحد تھی!

اُسے اِس تنہائی سے خوف آیا!

اِس تنہائی نے اُسے پہلی بار آدم کے دُکھ و تنہائی سے روشناس کروایا!

اِس دُکھ سے باہر آ کر جب اُس چمکیلی روشنی میں اُس نے اپنے اردگرد پھیلی، اپنی وادی، اپنی بستی کو دیکھا تو اِک وارفتگی شوق نے جنم لیا!

ہر بازار، ہر گلی ہر کوچہ اُسکی نگاہِ چشم کو سیراب کرنے اور شوقِ سیر کو دعوت دیتا تھا!

اُس نے جھجھک و شرم کی آڑ کو ایک طرف رکھ کر قدم باہر نکالا، اُسکے قدم میں اِک ہلکی سی لڑکھڑاہٹ بالکل اُس بچے کی تھی جو پہلا قدم اُٹھاتے جھجکتا ہے، اُسکی سرشت بتاتی ہے کہ یہ پیر چلنے کو دئے گئے ہیں اور خوف۔۔۔گرنے کا خوف۔۔۔ قدم تھام لیتا ہے! وہ ہر بندھن و بیڑی سے آزاد تھی، کوئی روکنے ٹوکنے والا نہ تھا!

کوئی اُسکی عقل پہ سوال اُٹھانے والا نہ تھا!

کسی کے ایمان کو اُس سے خطرہ نہ تھا!

اور وہ ہر خدشے و خوف سے بے نیاز تھی!

یہ اِس میلے کی رونق، یہ سجے بازار اُسکے لئے سجائے گئے تھے!

سو وہ وارفتگی سے اور اِک دیوانگی سے اِس سجاوٹ کی جانب لپکی! لپکتی چلی گئی!

مگر اِک عادت تھی زمانوں کی۔۔۔!

وہ اپنی عادت کے مطابق اِن بازاروں میں نعمتوں کے خوانوں سے کپڑوں، ریشم و اطلس و کمخواب کے تھانوں پہ ٹوٹ پڑی! جواہرات، ہیرے، پتھر، موتی، سونا چاندی اُسکے گردِ کشش کے نئے دائرے بناتے چلے جاتے تھے!

وہ اِن دُکانوں کے گرد ٹھہر گئی، پاگل سی ہو اُٹھی جہاں مصنوعی جوانی بکتی تھی، جہاں جسم و جان کو بوسیدگی ڈھلتی تھی!

اُس نے اپنے اِردگرد اِن نعمتوں کے انبار اکٹھے کر لئے!

باقی صفحہ ۶۲ پر ملاحظہ کیجیے

الاؤ

قمر جمالی
(حیدرآباد، دکن)

''ہاش۔۔۔اُم''

کوڑھی نے آخری لکڑی آگ میں پھینکتے ہوئے مضبوطی سے اپنے ہونٹ جکڑ لیے۔

اب ہر طرف آگ کے سرخ شعلے رقص کر رہے تھے اور کوڑھی بڑا مسرور نظر آتا تھا، ہوا کے تیز جھکڑ چلتے تو، لپکے مزید سرخ ہو جاتے اور کوڑھی کی آنکھوں میں ایک شناسا سا چمک جاگ اٹھتی

سرخی۔۔۔

قدِ آدم سرخی۔۔۔

اس کی آنکھوں میں رچی بسی تھی یہ سرخی۔۔۔

اس کی اپنی بیوی کے آنچل کی سرخی۔۔۔

الاؤ تیز دہک اٹھتا تو اسے ہر طرف سرخی ہی سرخی دکھائی دینے لگتی۔

جمالیات کے تجربے میں یہی تو ہوتا ہے۔ نظارگی میں نظر غائب ہو جاتی ہے۔۔۔اور باقی رہ جاتا ہے منظر۔۔۔!

آ گئیں۔۔۔!!

خوشی سے اس کی باچھیں پھیل جاتیں، وہ اٹھنے کی ناکام کوشش کرتا اور دوبارہ اپنی ہتھ بنڈی پر گر پڑتا۔ مارے خوشی کے اس کے حلق سے مختلف آوازیں نکلنے لگتیں۔

پھر۔۔۔وہ بدمست ہو جاتا۔

اپنے ٹونٹھ سے ہاتھ ہوا میں لہرا کر ناچنے لگتا۔ ایک بے ہنگم سا ناچ۔۔۔!

بے معنی سا۔۔۔!!

خمیر کھائی صورت، گول گول ابلی ہوئی سرخ آنکھیں، ناک کے نام پر رخساروں کے بیچ دو پتلی سرنگیں، اور ٹونٹھ سے ہاتھ۔ جب وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھا کر لہرانے لگتا تو انسان نہیں بلکہ کالا ناگ معلوم ہوتا۔ اِچھا دھاری ناگ جو اپنی منی کی روشنی میں آپ ہی بدمست ناچ رہا ہو۔

''آنچنا۔۔۔میری دلہن!!''

آنچ کے لپکے مدھم ہونے لگتے تو وہ انہیں بھڑکاتا اور اپنی بانہیں پھیلا کر لپکوں کو اپنے اندر سمیٹ لینے کی کوشش کرتا۔

''آؤ۔۔۔سما جاؤ مجھ میں یا پھر۔۔۔سمیٹ لو مجھے اپنے آپ میں''

عشق کی اس منزل سے کوڑھی اچھی طرح واقف تھا۔ بظاہر اس کا شکستہ جسم اس کے جذبات سے میل نہیں کھاتا تھا مگر اس میں اس کا قصور بھی کیا تھا!

وہ کوڑھی پیدا تو نہیں ہوا تھا۔!!

اس کا ذہن بالکل جوان اور تازہ رہ گیا تھا اتنا ہی جتنا آج سے تیس برس پہلے تھا۔ جذبات سے اُمڈتی اس کی جوانی کو جانے کس کمبخت کی نظر کھا گئی تھی۔۔۔!

زندگی سے بھرپور تھا وہ۔

انگ انگ سے نشہ پھوٹتا تھا۔

ٹوٹے جسم اور جھڑتے بدن کے ساتھ ثابت انسانوں کے بیچ جینا کتنا مشکل ہے۔ یہ تو صرف وہی جان سکتا تھا۔ پتہ نہیں کیسے وہ اس شکستہ جسم کے ساتھ حیات کی کئی منزلیں جی گیا۔ ناچتے ناچتے وہ تھک گیا تھا۔ پسینے سے شرابور، نڈھال ہو گیا تھا۔

نفرت ہو گئی تھی اسے خود سے۔۔۔اپنے وجود سے۔۔۔سڑے گوشت کی بدبو سے۔۔۔اور بدن سے اٹھنے والی سراند سے۔

وہ مرنا چاہتا تھا۔

موت۔۔۔؟ کیسی ہوگی۔۔۔!!

آئینے سے رشتہ ٹوٹے زمانہ گزر گیا تھا۔

''نہیں۔۔۔یہ معمولی داغ نہیں ہیں۔ کوڑھ ہے۔ مرض بُری طرح پھیل گیا ہے۔ اب اس اسٹیج پر ہڈیاں موم کی طرح گھلنے لگتی ہیں۔'' ڈاکٹر نے اعلان کیا۔

بس آخری بار۔۔۔

ہاں۔ اس دن اس نے آخری بار آئینہ دیکھا تھا۔ اس دن اس نے اچانک محسوس کیا کہ ناک کی ہڈی بنا بنیاد کے چھت کی طرح بیٹھنے لگی ہے۔ وہ دیکھتا رہا۔۔۔دیکھتا رہا۔۔۔اس نے دیکھا اس کی صورت خوفناک ہونے لگی ہے۔

اب ناک کی جگہ صرف دو سوراخ باقی رہ گئے ہیں۔

غیض و غضب سے وہ پھنکارنے لگا

اور۔۔۔

آئینہ چیخ گیا۔۔۔

اس کی صورت کرچیوں میں بکھر گئی۔ ہر عضو کے کئی ٹکڑے ہوئے، اب اس میں اپنی کرچی کرچی شبیہ دیکھنے کی تاب نہیں رہی تھی۔ نہ ہی کوئی آرزو اسے اپنی شبیہ دیکھنے پر اکساتی تھی۔

اس دن۔۔۔

آخری بار اس نے بیوی کے سرخ آنچل کو قدموں تک کھینچ کر دلہن کی طرح اسے سمٹی سمٹائی دیکھا تھا۔

ہاں۔۔۔

اس دن۔۔۔

اس نے دیکھا۔۔۔بیوی کے سفید رخساروں پر آنچل کی سرخی دہک اٹھی تھی۔ اسے لگا اس کی بیوی کے چہرے سے آنچ کی لپٹیں اٹھنے لگی تھیں۔ وہ گھبرا

گیااور مارے وحشت کے آنچل سر سے الٹ دیا۔
ہر طرف شہابی رنگ بکھر گیا۔اور۔۔۔
اس کی آنکھیں سرخی پی گئیں۔
وہ اندھوں کی طرح ہاتھوں سے ٹٹول کر اپنی بیوی کو چھونے کی کوشش کرنے لگا۔اس کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکل گئی۔اسے لگا کہ اس نے ایک الاؤ نگل لیا ہے۔
اب کچھ نہیں بچا تھا۔۔۔بس رہ گئی تھی سرخی،ایک منظر بن کر۔
اپنی خواب گاہ میں دو بستروں کے بیچ فاصلہ دیکھ کر اسے یقین ہو گیا کہ حیات تا وان وصول کر رہی ہے۔قسط در قسط۔
پھر۔۔۔
یہ فاصلہ بڑھتا گیا۔
خواب گاہ میں اب صرف ایک کھاٹ رہ گئی۔
بیوی سے صرف بول چال کا رشتہ باقی رہ گیا۔وہ خود چاند کی رفتار سے گھٹتی رہی۔اس کے چہرے پر سہاگن کے نام پر صرف سیندور کی بندی رہ گئی۔
اس کے جیتے جی ننھا دودھ پیتا یتیم خانے میں بھرتی کر دیا گیا۔
اور۔۔۔
ایک دن۔۔۔
اس کے کمرے کے عین سامنے دالان میں بچھی اس کی بیوی کی دری بھی اٹھ گئی۔
پھر۔۔۔
گھر سمٹ کر ایک مربع فٹ کی چار پہیوں والی ہتھ بنڈی میں مجسم ہو گیا۔
گھر۔۔۔!
چار پہیوں والی ہتھ بنڈی۔۔۔!!
گھر۔۔۔
بنڈی۔۔۔
گھر۔۔۔بنڈی۔۔۔گھر۔۔۔
''ہاش۔۔۔اُم۔۔۔''
غم کی شدت سے وہ بے قابو ہو گیا اور بازو رکھا المونیم کا بگونہ اٹھا کر آگ کی ڈھیر پر دے مارا۔چنگاریاں چٹپٹانے لگیں۔
''چیختی ہو؟بے وفا۔۔۔!ابھی کچھ دیر میں سرد پڑ جاؤ گی یا پھر۔۔۔''
ہوا کا ایک تیز جھونکا چلا اور چنگاریوں کو اپنے دوش پر بہت دور اُڑا لے گیا۔
''دیکھا۔۔۔!میں نے کہتا تھا۔۔۔!وہ آئے گا۔تمہارا یار۔۔۔عاشق،اور تم اس کے ساتھ بھاگ جاؤ گی۔''
ایک اور طوفانی جھونکا چلا۔راکھ کے انبار میں جلی چنکاریاں لمحہ بھر کو جی اٹھیں۔سفید راکھ میں سرخ نقطے نمودار ہوئے اور۔۔۔''پُھر''۔۔۔سے اُڑ گئے۔
''میں نہ کہتا تھا۔۔۔ٹہر۔۔۔اے جاتا کدھر ہے؟بے رحم۔۔۔!''
اس نے بازو پڑی چپلیں اپنے ٹونٹھ سے ہاتھوں پہنیں،زمین پر ہتھے مارتا ہوا تیز تیز دوڑنے لگا۔اس پر وحشت سوار ہو گئی تھی۔اس کا رقیب تھا ہوا کا جھونکا جو ہمیشہ راکھ میں دبی چنگاریوں کو ورغلا کر اڑا لے جاتا تھا۔
''جان سے ماردوں گا۔۔۔سنا تو نے؟''
''کسے۔۔۔کسے جان سے ماردو گے بابا۔۔۔؟''
اس نے رُک کر اپنے اطراف کا جائزہ لیا۔
ہاں کسے۔۔۔؟کسے مارے گا وہ؟؟پھر۔۔۔وہ جواب کسے دیتا!
وہاں تو کوئی تھا ہی نہیں۔
بہت تھک گیا تھا وہ اپنے اندر والے اس توانا مرد سے جو بار بار باہر والے کرم خوردہ بدن سے مات کھا جاتا۔وہ ہزار کوشش کرتا مگر پھر بھی جانے کیسے وہ بار بار جی اُٹھتا۔اسے اپنے ان محسوسات پر غصہ بھی آتا اور پیار بھی۔
جسم و ذہن کے یہ رشتے اس کی سمجھ میں کبھی نہ آئے۔
وہ انہیں جتنا دباتا۔۔۔اتنے ہی اینگھتہ ہو جاتے۔
اسے آج اس کی شدت سے یاد آنے لگی تھی جس کے ساتھ اس نے زندگی کا پہلا سبق پڑھا تھا۔شاید یہ اس کا فطری تقاضہ تھا۔وہ جانتا تھا۔
مگر۔۔۔
مگر۔۔۔مگر۔۔۔مگر۔۔۔پھر وہی مگر!!
یہ لفظ۔۔۔لفظ نہیں۔بے چارگی کی علامت ہے۔
یہی تو وہ لفظ ہے جو ایک تارِ عنکبوت کی طرح اس کی زندگی کے اطراف لپٹ گیا ہے۔
اسے نفرت ہے اس لفظ سے۔پھر بھی قدم قدم پر اس کے سامنے ایک سنگِ میل کی طرح کھڑا ہو جاتا ہے اور اس کی بے بسی کی توسیع کر جاتا ہے۔
وہ رونا چاہتا تھا۔
مگر۔۔۔
شاید۔۔۔وہ اسے اپنی باہوں میں بھر لینا چاہتا تھا۔سرخ گھونگھٹ کے پیچھے حیران سی کھلی بڑی بڑی آنکھوں سے ایک نہیں کئی جام غٹا غٹ پینا چاہتا تھا۔
میٹھے پانی کا کنواں تھی وہ،
مگر۔۔۔
وہ تو رہ گیا اوپر۔۔۔پھوٹے ڈول کی طرح۔
اور رسّی۔۔۔؟
کُشٹھ روگ چاٹ گیا اُسے۔
بس رہ گیا ایک سرا جو بجائے کٹ کر گر جانے کے،غڑاپ سے الٹا

اندر چلا گیا۔ اس کے وجود کے اندر۔ شاید یہی سارا رہ کر اس کے اندر ہلچل کرتا رہتا تھا۔

''میں جینا چاہتا ہوں تمہارے ساتھ۔ سنتی ہو؟ تمہارے آنچل کی ٹھنڈک میں۔

دیکھو! بظاہر میں بڑا خوفناک لگتا ہوں مگر۔۔۔''

پھر وہی مگر۔۔۔ ایک تارِ عنکبوت جس کے اندر وہ ایک ادھ موئی چونٹی کی طرح تڑپڑا رہا تھا۔

''میں اس عفریت سے باہر نکلنا چاہتا ہوں۔ تمہارے ساتھ جینا چاہتا ہوں۔ چار دیواروں کے بیچ جسے گھر کہتے ہیں۔''

''بابا! کبھی تمہارا بھی تو گھر رہا ہوگا۔۔۔؟''

اپنے آپ کو مکڑی کے جال سے آزاد کرانے کے لیے زمین پر اوندھے منہ گرا دائیں بائیں پلٹیاں کھاتا دیکھ کر اس نے آج پھر اسے ٹھوکا دیا۔

''گھر۔۔۔؟'' اس نے سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا۔

''ہاں گھر۔۔۔ کبھی تم بھی تو گھر والے رہے ہوں گے۔؟''

''گھر۔۔۔ گھر والا؟ ہاں ہاں میں جینا چاہتا ہوں۔ گھر والا بن کر۔ ثابت بدن لوگوں کے بیچ۔ تمہاری طرح۔''

وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔ صرف وہ تھا اور اس کا ٹوٹا وجود۔ جو مسلسل ٹوٹ رہا تھا۔ نس نس، ریشہ ریشہ۔

باہر سے بھی۔۔۔ اور اندر سے بھی۔

اب وہ پیچھے کی طرف دوڑ رہا تھا۔ تیز رفتار، اپنی پناہ گاہ کی طرف جہاں اس نے ایک دنیا بسا رکھی تھی۔ گھاس پھوس کا انبار، ٹوٹے جوتے اور پلاسٹ کے ناکارہ برتن۔

اس پر ایک ہیجان طاری ہو گیا تھا۔ وہ دوڑنے لگا۔ بے تحاشہ، چار پہیوں اور۔۔۔ دو ہاتھوں پر۔ ہوا کے جھونکوں نے اس جگہ کو بالکل صاف کر دیا تھا جہاں کچھ دیر قبل اس نے الاؤ جلایا تھا۔ جھکڑ راکھ تک اُڑا لے گئے تھے۔

صرف ایک احساس باقی رہ گیا تھا، زندگی کا۔۔۔ لمس انسانی کا۔۔۔ ایک سفید دھبہ۔۔۔!

اس نے نہایت تگ و دو سے دوبارہ اس دھبے کو آباد کر دیا۔ گھاس پھوس، ٹوٹے جوتے اور پلاسٹ کے ناکارہ برتنوں سے۔

''اب یہاں ناچ ہوگا۔ سرخ شعلوں کا ناچ۔ وہ آئے گی آنچنا۔ شعلہ بدن، سرخ آنچل۔۔۔ میری محبوبہ۔۔۔''

خوشی سے اس کی باچھیں پھیل گئیں۔

''میں ناچوں گا تمہارے ساتھ۔ تمہارے آنچل کے سایے میں۔ مجھے ضرورت ہے تمہاری۔۔۔ تمہاری حرارت کی۔۔۔ آخر تم میری ضرورت ہو۔۔۔ میری ارھانگنی ہو۔۔۔ اُپنشدوں میں بھی یہی لکھا ہے۔''

وہ زور زور سے چلاّنے لگا۔ اس پر وحشت طاری ہو گئی۔

''ہاش۔۔۔ اُم۔۔۔''

کوڑھی نے جھولی سے ماچس نکالی اور جلتی ہوئی تیلی کچرے کے ڈھیر پر ڈال دی۔

آگ کے سرخ شعلے رقص کرنے لگے۔ وہ مسرور ہوتا رہا۔ اس کے جسم میں حرارت پیدا ہونے لگی۔ چنگاریاں بھڑکنے لگیں۔

کوڑھی بدمست ہو گیا۔

اس کی سرخ گول گول آنکھیں پھیل کر وحشت ناک ہو گئیں۔ وہ ہتھ بنڈی سے اٹھ کر کھڑے ہونے کی ناکام کوشش کرنے لگا۔۔۔ اور آخر تھک ہار کر اس میں پسر گیا۔

ہوا کا ایک تیز جھونکا چلا۔

کوڑھی کے جسم پر بے شمار مکڑیاں رینگنے لگیں۔

چنگاریاں پکارنے لگیں۔

کوڑھی تلملا اٹھا۔

''نہیں۔ آج یہ نہیں ہوگا۔ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتیں۔ کم از کم آج اپنے عاشق کے ساتھ نہیں جاسکتیں۔

آج۔۔۔

میں تمہاری ذات میں مدغم ہو جانا چاہتا ہوں۔ گھل مل جانا چاہتا ہوں۔

آخر تم میری ضرورت ہو۔ میرے بدن کی حرارت ہو۔۔۔!

''ہاش۔۔۔ اُم۔۔۔''

کوڑھی نے ایک ماہر خلا باز کی طرح اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا دئے۔

اور۔۔۔

فضا میں جلتے گوشت کی چراند پھیل گئی۔

محبت

''چارلی چپلن'' ایک انگریز اداکار، ہدایت کار، اسکرین رائٹر، ایڈیٹر، کمپوزر، فلم پروڈیوسر اور مزاح نگار تھا۔ چپلن کو سینما کا پہلا عالمی ستارہ سمجھا جاتا ہے اور وہ فلمی تاریخ کا سب سے بااثر مزاح نگاروں میں سے ایک ہے۔ چارلی کا بہت ہی خوبصورت جملہ آپ سب کی بصارتوں کی نذر:

''آپ کو طاقت کی ضرورت صرف اُس وقت ہوتی ہے جب آپ کسی بُری چیز کا منصوبہ بنا رہے ہوں۔ باقی ہر چیز کے لیے محبت ہی کافی ہے۔''

پتی ورتا

شاہد رضوان
(چیچہ وطنی)

اس کا شوہر بازار میں بغلی گلی کی نکڑ پر کپڑے کی دکان کے آگے منیاری لگاتا اور ساتھ بجلی کے کھمبے کی آڑ میں لنڈے کے کپڑے بھی رکھ کر بیچتا۔ کوئی ڈھنگ کا کپڑا نکل آتا تو گھر کے لیے الگ کر لیتا۔ سفید پوش عورتیں جو پردے کے نام سے بدکتیں، سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے لیے نقاب پہن کر لنڈے سے ضرورت کے کپڑے چھانٹ کر لے جاتیں۔ وہ آئے دن بیوی کے لیے نئی پونیاں، سوئیاں، جیولری، ہیئر کیچر اور چوڑیاں لاتا، تین ہزار ماہوار دکان والے کو دیتا، مکان کا کرایہ، بجلی، گیس اور پانی کا بل دے کر کوشش کے باوجود کچھ بھی پس انداز کرنے کو نہ بچتا تھا۔

سونیا اپنے بچوں کو پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھتی تھی۔ اس نے خواب کی تعبیر کے لیے دونوں بڑے لڑکے پرائیویٹ سکول میں بٹھا دیے۔ ہر ماہ فیس کی مد میں چار ہزار کا بوجھ اس کے شوہر کے کندھوں پر مزید آ پڑا، کتابیں، کاپیاں، لیڈ پنسلیں، ربڑ اور شاپنر کا الگ خرچ، اور پھر سکول والے آئے دن کسی نہ کسی فنکشن کے نام پر پیسے بٹورنے کے بہانے ڈھونڈ لیتے، ہاتھ تنگ پڑنے لگا، اکثر ایسا ہوتا کہ بچوں کی فیس ادا کی جاتی تو بجلی گیس کا بل رہ جاتا، بل ادا کیا جاتا تو اگلے ماہ تک مالک مکان کی باتیں سننا پڑتی تھیں۔

اس کا سڈول بدن، دراز قامت، سیب جیسی رنگت، تیکھے نقوش، گول چہرہ، ستواں ناک، بلوریں آنکھیں، گھنی بھنویں اور قہر ڈھاتی سیاہ گھنی زلفیں دیکھتے ہی دلوں کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو جاتیں۔ محلے کے کتنے ہی من چلوں نے اس کبوتری کو آ آ کر کے اپنی ہوس کی چھتری پر اتارنا چاہا لیکن اس نے اپنے شوہر کے گھر کی دہلیز الانگنا گوارا نہ کی۔ ایک دن اس نے آئینہ دیکھ کر سوچا: اگر وہ ماڈلنگ سے وابستہ ہوتی تو آج لاکھوں میں کھیلتی۔ اسے یاد آیا، ایک بار اس نے کلاس میں شوخی سے کہا تھا: ''خدا اتنے خوبصورت چہرے یونہی پیدا نہیں کرتا، اُن کا ایک خاص مقصد ہوتا ہے۔'' اس کی پروفیسر نے اس کا ارادہ بھانپ کر سمجھایا تھا: ''خدا اس لیے خدا ہے کہ اس تک کسی کی رسائی نہیں۔ بازار میں پڑی چیز کتنی ہی بیش قیمت کیوں نہ ہو، ایک دن اس کی وقعت کھوٹے پیسے کی نہیں رہتی۔ مکار سرمایہ داران چہروں کی چمک دمک نچوڑ لیتے ہیں۔ حسن اشتہار کی زینت بنتا ہے تو چیزیں ضرور بک جاتی ہیں لیکن ساتھ ہی اس کی معصومیت بھی نیلام ہو جاتی ہے۔'' شاید کبھی وہ اپنے شوق کو پروان چڑھانے کے بارے دوبارہ سوچتی لیکن غریب ماں باپ نے شادی کے بندھن میں باندھ کر اپنے کندھوں سے بھاری بوجھ اتارنا مناسب سمجھا تھا۔

وہ بچوں کو سکول چھوڑنے جاتی تو اسے دیکھ کر بڈھے کھوسٹ پرنسپل کی رال ٹپک جاتی۔ ایک دن پرنسپل نے اس کے سراپے کا شہوت بھری نگاہوں کی تکڑی میں تول کر جائزہ لیتے ہوئے انکساری سے کہا: آپ میرے پاس جاب کیوں نہیں کر لیتیں۔ بی ایس سی کس دن کام آئے گی۔'' اس نے پرنسپل کے چہرے پر کھنڈتی مکروہ خواہش پڑھ کر گھریلو مصروفیت کا بہانہ بنا کر ٹال دیا۔ اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ اس کا شوہر اسے کبھی بھی پرائیویٹ سکول میں نوکری نہیں کرنے دے گا۔ اگلے دن پرنسپل نے ایک اور معنی خیز بات کی: ''کچھ لوگ بہت ہی بیش قیمت ہوتے ہیں لیکن انھیں اپنی قدر و منزلت کا علم ہی نہیں ہوتا۔ میرے خیال سے آپ نے خود کو بہت ضائع کر لیا، آگے مزید ضائع نہ کریں۔ ہمارے پاس تو بے روزگاروں کی قطار لگی رہتی ہے، اور میں آپ کو یہ آفر خود دے رہا ہوں۔'' چکنی چپڑی باتوں نے اندر ہی اندر کھلبلی تو مچائی لیکن وہ ان کی قیمت ادا کرنے پر خود کو آمادہ نہ کر سکی تھی۔

تیسرا لڑکا بھی سکول جانے لگا تو اس نے پرنسپل سے اس کی فیس معافی کی درخواست کی۔ پرنسپل نے بہت ہی روکھے لہجے میں کہا: ''لوگ کام کرنا قبول نہیں کرتے لیکن دوسروں پر بوجھ بننا پسند کرتے ہیں۔ ہم کس کس کی فیس معاف کریں، یہاں جو بھی آتا ہے غربت اور مہنگائی کا رونا روتا ہے۔ اس طرح ہمدردی کرنے لگیں تو سکول کو تالا لگانے کی نوبت ہی نہیں آئے گی، سب کچھ ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔'' وہ سرد آہ بھر کر چپ ہو گئی۔

گھر آ کر اس نے سوچا: اکیلا آدمی کیا کر سکتا ہے، میں جوان جہان ہوں، زندگی کی گاڑی کھینچنے کے لیے شوہر کا ہاتھ بٹانا چاہیے۔ پھر اس بہانے سے بچوں کی نگہداشت بھی رہے گی۔ پہلے تو شوہر نے نہ نکڑ کی، پھر حالات کے آگے بے بس ہو کر رضامندی ظاہر کر دی۔ اسے دیکھ کر پرنسپل کے ہونٹوں پر فتح مندی کا تبسم لہرایا۔ اسے بچوں کی خاطر سات ہزار کی آفر قبول کرنا پڑی۔ پرنسپل نے ایک ہزار فیس کم کر کے حاتم طائی کی روح کے تڑپنے کا سامان کیا۔ ہر ماہ کی دس سے پندرہ تاریخ کے درمیان ٹیچرز کو تنخواہ دینے کا مطلب صاف تھا تاکہ وہ کسی دوسرے سکول میں نہ جا سکیں۔ بچوں کی پانچ ہزار فیس کاٹ کر دو ہزار روپیہ اس کے ہاتھ پر دھر دیا جاتا۔ زندگی کی گاڑی چلنے لگی اور کچھ ماہ تک وسائل اور اخراجات کے درمیان برابری قائم رہی لیکن جلد ہی مہنگائی کے طوفان نے اس توازن کو غیر متوازن کر دیا اور رہی سہی کسر کرونا وبا نے پوری کر دی۔

کرونا وبا (covid.19) کے باعث کاروبارِ زندگی معطل ہو کر رہ گیا، سکول، کالج، دفاتر اور بازار بند ہو گئے۔ مردوں نے تو بہ امر مجبوری خود کو گھروں میں کوارنٹین کر لیا لیکن بچے سنبھالے نہ سنبھلتے۔ موقع ملتے ہی آنکھ چرا کر گلی میں بھاگ نکلتے اور انھیں زور زبردستی پکڑ کر مقید کیا جاتا۔ البتہ عورتوں کی مصروفیتیں اور مشغولیتیں بڑھ گئیں۔ انھیں سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی اور پھر ان کی پرائیویسی بھی متاثر ہونے لگی۔ فریقین ایک دوسرے کی شکلیں دیکھ دیکھ کر تنگ پڑنے لگے۔

''چہار سُو''

ہمہ وقت بچوں کا شور وغل یا پھر عورتوں مردوں کی چخ چخ سنائی دیتی۔عورتیں اس وقت کو یاد کرتیں جب مرد کام پر اور بچے سکول چلے جاتے اور وہ جلدی جلدی کام نپٹا کر پڑوسنوں سے چغلیاں کر کے دل کی بھڑاس نکال لیتیں۔ پھر کھانا پکا کر بچوں اور شوہروں کے انتظار میں دروازے کی طرف آنکھیں لگا کر بیٹھ جاتی تھیں۔

وبا سے متعلق سوشل میڈیا پر پھیلی افواہوں نے اعصاب شل کر دیے اور لوگ ذہنی طور پر مفلوج ہو گئے۔ہسپتالوں اور قبرستانوں میں رونقیں لگ گئیں ،توبہ استغفار کی مناجاتوں کے ساتھ اشیائے خوردونوش کی قیمتیں بھی فلک تک سنائی دیتیں۔صبح جو چیز دس روپے میں ملتی شام وہی چیز بیس روپے میں مشکل سے ملتی۔

گلی میں ردی خریدنے والے نے ہانک لگائی :''ردی بیچ۔۔۔ سوکھی روٹیاں بیچ ۔۔۔ بال بیچ۔۔۔''وہ دوسرے تیسرے روز سائیکل پر آتا۔سائیکل کے کیریئر پر دونوں طرف پالان کی طرح دو بوریاں لٹک رہی ہوتیں اور ہینڈل کے ساتھ ایک تھیلا بندھا ہوتا۔ایک بوری میں ردی دوسری میں سوکھی روٹیاں اور تھیلے میں بال ڈالتا۔وہ سوار ہونے کے بجائے پیدل چلتا اور وقفے وقفے سے گھنٹی بجاتا جاتا۔عورتیں گھنٹی کی آواز سن کر نکل آتیں۔کسی کے ہاتھ میں سوکھی روٹیوں کی چنگیر اور کوئی ردی اٹھائے چلی آتی۔

اس نے سوکھی روٹیوں کی چنگیر اٹھاتے ہوئے سوچا: مردوں کے بال تو ویسے بھی کم ہوتے ہیں اور پھر وہ ماہ دو ماہ بعد حمام پر جا کر کٹوا آتے ہیں۔عورتیں تو بال کٹواتی ہی نہیں، چھوٹے شہروں میں تو بالکل بھی نہیں۔پھیری والا کس طرح کے بال خریدتا ہے اور سب سے اہم اور نہ سمجھ میں آنے والی بات تو یہ ہے کہ وہ ان بالوں کا کیا کرتا ہے۔پھر سوچا: اس نامراد نے میرے بال دیکھ لیے ہوں گے، میرے باپ کا سا لاٹھ کھڑک جھاڑتا ہے، پرنسپل صاحب بھی تو یہی کچھ کرتے ہیں، میں پاگل تو نہیں کہ یہ بھی نہ سمجھ سکوں کہ وہ مجھے بار بار دفتر میں کیوں بلاتے اور بہانے بہانے سے احساس دلاتے ہیں کہ میرے بال بہت خوبصورت ہیں جیسے مجھے کچھ پتا ہی نہ ہو۔خود داڑھی اور مونچھوں کو خضاب لگا کر کاکے بنتے ہیں حالانکہ میرے دادا ابا کی عمر کے ہیں، دادا ابا ایک ماہ کم ساٹھ برس کے ہو کر عدم کو سدھارے تھے اور اس بات کو پانچواں سال لگ گیا ہے۔ایک دن پرنسپل کی زبان پر اس کے اندر کی خباثت ظاہر ہوئی تو اس نے جھلا کر کہا:''گھر سے باہر نکلنے والی ہر عورت ضروری نہیں ایسی ہی ہو، جیسا مردوں کا خیال ہے۔'' پرنسپل نے آئیں بائیں شائیں کر کے بات کا رخ دوسری طرف پھیر دیا تھا۔

اس نے سوچا: کیا پتا پھیری والا عورتوں کے بالوں پر جادو ٹونا کرتا ہو، اسے یاد آیا: جب اس کی بہشتن ماں کنگھی کرتی تو کافی سارے بال ٹوٹ کر کنگھی کے دندانوں میں پھنس جاتے ،وہ انھیں ناخنوں سے چن چن کر چارپائی کے بان میں پھنساتی جاتی۔ جب چڑیا کر چکتی تو بال سمیٹ کر ان کی گولی بنا کر دیوار کی درز میں دے کر تنکے کی نوک سے دھکیل کر بہت آگے تک پہنچاتے ہوئے کہا کرتی:''عورت کو اپنے بال نامحرم مردوں کی نظروں سے بچا کر رکھنے چاہئیں، جادوگران پر کالا جادو کرتے ہیں۔''

وہ جھک کر سوکھی روٹیاں ترازو میں ڈالنے لگی تو پھیری والے نے روٹیاں کم تولیں البتہ اس کے حسن کو آنکھوں کے ترازو میں ایمان داری سے تولتے ہوئے سوچنے لگا: اس عورت کے بال اتنے لمبے، گھنے اور سیاہ ہیں پتا نہیں کون سی کمپنی کا شیمپو لگاتی ہے، یہ کنگھی بھی زیادہ کرتی ہو گی اور یقیناً اس کے بال بھی اوروں کی نسبت زیادہ گرتے ہوں گے۔

اس نے پوچھا''آپ بالوں کا کیا کرتے ہو؟''وہ اپنا گنجا سر کھجا کر بولا''میں تو کچھ نہیں کرتا البتہ ان سے''وگ''تیار کی جاتی ہے۔''وہ اس کے چٹیل سر کی طرف دیکھ کر ہونٹوں پر آئی ہنسی روک کر بولی''آپ نے خود تو''وگ''نہیں لگائی۔''وہ کھسیانا ہو کر بولا''یہ امیروں کے چونچلے ہیں، ہم غریبوں کے پیٹ کا دوزخ بھرے تو کچھ اور بھی سوجھے۔''

وہ جب بھی سوکھی روٹیاں لے کر باہر نکلتی تو پھیری والا ضرور پوچھتا''گھر میں بال تو نہیں''وہ نفی میں سر ہلا دیتی لیکن پہروں سوچتی کہ آخر وہ مجھ سے ہی کیوں پوچھتا ہے کسی اور سے تو نہیں پوچھتا، میں نے کون سی آڑھت منڈی کھول رکھی ہے۔پھر یہ سوچ کر چپ ہو رہتی کہ ٹھرک جھاڑتا ہے سارے مرد ہی ٹھرکی ہوتے ہیں۔

پھیری والا سوچتا: اس عورت کے بالوں سے ایک نہیں دو تین وگز تیار ہو سکتی ہیں، اگر اس کے بال مل جائیں تو میں اپنے لیے وگ بنواؤں، نرم نرم ریشمی بالوں کی وگ سر پر سجانے کا سوچ کر اس کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔رات اس نے خواب میں دیکھا، ناگ اس کی گردن کے گرد لپٹ رہا ہے۔اس نے اسے جھٹکنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس کی نرم جلد انگلیوں سے مس ہوتے ہی اس کی رگیں تن گئیں اور انگ انگ میں سرور کی لہر دوڑ گئی۔وہ خوف زدہ ہونے کے بجائے ہتھیلیوں سے اس کی نرم نرم جلد سہلا کر حظ اٹھانے لگا۔

ایک دن کنگھی کرتے ہوئے اس کے ہاتھ میں تین چار بال آئے تو وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی: میرے بالوں کو پھیری والے کی نظر لگ گئی، اگر اس منحوس کی نظر نہ اتاری گئی تو میں گنجی ہو جاؤں گی اور تو اور میرا شوہر دیکھ کر پکار اٹھے گا''گنجی کبوتری تے ڈیرے محلاں وچ۔''

پھیری والا آتا، ہانک لگاتا اور مسلسل گھنٹی بجاتا لیکن کوئی عورت ردی یا سوکھی روٹیاں بیچنے نہ نکلتی، بچے سکول جاتے تو ردی اکٹھی ہوتی اور روٹیاں تو کھانے ہی کو پوری نہ ہوتیں، بیچنے کو کہاں سے لاتیں۔پھیری والے نے جیسے ہی ہانک لگائی، اس نے دروازے کا پٹ ہٹا کر باہر جھانکا تو پھیری والا یہ سوچ کر رک گیا کہ شاید کچھ بیچنے کا ارادہ ہے۔وہ برا سا منہ بنا کر بولی''بیچنے کو کچھ نہیں۔۔۔ میں نے تو ویسے ہی باہر جھانکا ہے۔''وہ چپ چاپ آگے نکل گیا تو اس نے اس کے پاؤں کی مٹی اٹھا کر جلتے چولھے میں پھینک کر اپنے تئیں اس کی پتھر پھاڑ نظر اتار پھینکی تھی۔

''چہارسُو''

رات اس نے خواب میں دیکھا کہ اس کے سارے بال جھڑ گئے ہیں۔اس کا شوہر اس کے چہرے کی طرف بھولے سے بھی نہیں دیکھتا اور عورتیں اسے ''ماہی منڈا'' کہہ کر بلاتی ہیں۔یوں لگتا جیسے اس کے شانوں پر سر کے بجائے اوندھا گھڑا رکھا ہو۔وہ زار زار رونے لگی، جب آنکھ کھلی تو خود کو پسینے میں غرق پایا۔اس کی دھونکنی کی طرح چلتی سانس درست ہوئی تو اس نے اپنے سر پر جھجکتے جھجکتے ہاتھ پھیرا اور بالوں کو موجود پا کر اس کی جان میں جان آئی۔

اس نے سوچا: مردوں کے بال اڑ جائیں تو کہتے ہیں دولت ہاتھ آنے والی ہے، مگر گنجی عورت کی طرف تو کوئی پھیکی نظر بھی نہیں ڈالتا ہوگا، بالوں کے بغیر تو عورت دم کٹی گھوڑی لگتی ہوگی۔

اس کے شوہر کو نزلہ زکام اور کھانسی رہنے لگی تھی۔ڈاکٹر نے کرونا تجویز کرتے ہوئے ٹیسٹ کروانے کا مشورہ دیا اور یہ بھی بتا دیا کہ ٹیسٹ کسی صورت دس ہزار سے کم میں نہ ہوں گے۔شوہر نے خود کو کوارنٹین کر لیا اور سونیا دس ہزار کے فکر میں پڑ گئی۔اس نے رشتے داروں اور دوستوں کے دروازوں پر دستک دی، لیکن کسی کی پوری پڑ رہی ہوتی تو اس کی مدد کرتے۔

چھ ماہ سے سکول بند تھے۔اپنی کولیگز کی طرح اس کی بھی خوش فہمی تھی کہ ان چھ ماہ کی تنخواہ ضرور ملے گی۔پھر اس کے ذہن کے کسی گوشے میں یہ بات بھی اٹکی ہوئی تھی کہ پرنسپل اس پر مہربان ہے۔

ایک دن وہ سکول گئی، اسے دیکھ کر بوڑھے پرنسپل کے رخساروں میں پڑے گڑھے دیے کی طرح چمک اٹھے اور آنکھوں سے پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔ اس نے شوہر کے وبا سے متاثر ہونے کے بارے میں بتایا تو پرنسپل نے بے دلی سے ہمدردی کا اظہار کیا۔اسے بہت حیرت ہوئی اور ایک لمحے کے لیے ایسا لگا جیسے وہ کسی اجنبی سے ہمدردی کی بھیک مانگ رہی ہو، کہیں ادھار پیسے نہ مانگ لے یہ سوچ کر پرنسپل نے ماتھے پر تیوریاں ڈال لیں اور خالصتاً کاروباری طریقے سے آنکھیں ماتھے پر رکھ کر بولا ''ابھی تک آپ کے بچوں کی فیس نہیں آئی، اللہ کے کسی ایک بندے نے بھی آ کر نہیں پوچھا کہ کن حالوں میں ہو، آخر ہماری بھی تو کچھ ضرورتیں ہیں۔'' وہ کچھ دیر یونہی گم سم بیٹھی رہی، اسے سمجھ تو آ گئی کہ یہاں سے کچھ ملنے کی توقع کرنا ایسا ہی ہے جیسے چیل کے گھونسلے سے ماس تلاش کرنا، اس نے اپنے حواس مجتمع کر کے جونہی تنخواہ کی بات کی تو وہ کرسی سے یوں اچھلا جیسے اسے اچانک بچھو نے کاٹ لیا ہو، پھر بنیے کی طرح دوٹوک انداز میں بولا ''جب کام نہیں کیا تو تنخواہ کیسی۔۔۔؟ ایک بار تو اس کے جی میں آئی کہ کہہ دے جب پڑھایا نہیں تو فیس کیسی؟'' لیکن وہ مصلحت کے تحت کڑوا گھونٹ پی کر چل دی۔

شوہر نے بولنا چاہا تو کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور کافی دیر تک سانس اٹھل پتھل ہوتی رہی۔اس کی حالت دیکھ کر وہ اندر سے لرز گئی۔ابھی دو دن پہلے ہی اس کا سگا چچا اسی طرح کھانستے ہوئے مرا تھا۔اس کی بھرائی آنکھیں دیکھ کر شوہر نقاہت سے بولا: ''میں اللہ کی طرف سے مایوس نہیں۔اگر سانسیں باقی ہیں تو میں تندرست ہو جاؤں گا۔کسی سے قرض مت لینا۔میں نہیں چاہتا کہ جاتے ہوئے قرض کا بوجھ تم پر لاد جاؤں۔'' اس نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ہوئے سوچا: اگر میرے شوہر کو کچھ ہو گیا تو میرا اور ان بچوں کا کیا ہوگا، مرد کے بغیر عورت کا حال ویرانے میں بنائی قبر جیسا ہوتا ہے، جس کی دیکھ بھال نہ اپنے کرتے ہیں نہ ہی بیگانے۔ہر وقت ہوس کے پجاری اس ڈھیری میں سیندھ لگانے کے جتن کرتے ہیں۔بجلی، گیس کا بل اور مکان کا کرایہ ادا کرنا تو دور کی بات روٹیوں کے لالے پڑے ہوئے تھے۔اشیا کی عدم دستیابی کا ڈھونگ رچا کر منافع خوروں نے خوب لوٹ مار کا بازار گرم کیا۔غریب مہاتڑوں کا بھرکس نکل گیا اور سفید پوش صدقے خیرات کی طرف دیکھنے لگے، ایک وقت کھانے کو ملتا تو اگلے وقت کی فکر دامن گیر رہتی۔لوٹ مار، سینہ زوری اور چوری چکاری عام ہو گئی۔چند دن تک تو صدقہ خیرات کرنے والوں نے جذبہ ایمانی سے سرشار ہو کر تجوریوں کو ہوا لگوائی لیکن جیسے ہی وبا پھیلنے لگی ان کے ہاتھ سمٹنے اور ہمدردیاں سکڑنے لگیں۔جہیز کے برتن بھانڈے ایک ایک کر کے بک گئے اور مکان کا چھ ماہ کا کرایہ بھی سر پر چڑھ گیا۔مالک مکان نے اس کی بے بسی سے فائدہ اٹھانا چاہا لیکن اس نے اس کا ہاتھ جھٹک کر پتی ورتا ہونے کا ثبوت دیا۔وہ شوہر کے ٹیسٹ کروانے کے لیے روپے پیدا نہ کر سکی تھی کہ اوپر سے مالک مکان نے دھمکی دی کہ اگر دو چار دن تک بقایا جات ادا نہ کیے گئے تو مکان زبردستی خالی کروا لیا جائے گا۔اسے سمجھ نہ آتی کہ کیا کرے۔

گلی میں ردی خریدنے والے نے ہانک لگائی: ردی بیچ۔۔۔ روٹیاں بیچ اور بال بیچ۔۔۔وہ کچھ سوچ کر باہر جھانک کر بولی ''بال کس بھاؤ لیتے ہو؟'' وہ بولا ''کنگھی کے بال دو سو روپے اور قینچی کے کٹے بال سو روپے چھٹانک۔۔۔'' اسے سمجھ نہ آئی کہ بال تو بال ہوتے ہیں ان کی قیمت میں اتنا فرق کیوں ہے؟۔اس نے اپنی پشت پر لٹکتے بالوں کا گچھا دکھا کر شوخی سے پوچھا: ''میرے بال کتنے کے ہوں گے؟'' وہ زیر لب مسکرا کر بولا ''آٹھ دس ہزار کے تو ہوں گے۔''

اس نے شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بال شانوں کے اوپر سے گرائے تو لگا جیسے گلے میں دونوں طرف کالے ریشمی لچھے لٹک رہے ہوں۔اس نے سوچا: بال تو گھر کی کھیتی ہیں، سرسوں کا تیل لگانے سے پھر آ جائیں گے مگر شوہر۔۔۔اس نے قینچی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس پر کپکپی طاری ہو گئی۔اس نے کڑے دل سے بالوں کو اکٹھا کیا اور لچھا کاٹ کر میز پر رکھ دیا۔اس حالت میں آئینے میں جھانکا تو مارے خوف کے پلنگ پر جا پڑی۔جو ہونا تھا ہو چکا، یہ سوچ کر اس نے خود کو طفل تسلی دی۔پھر سوچا: مرد ایسے ہی تو نہیں عورت کے بالوں پر فریفتہ ہوتے۔۔۔بالوں کے بغیر عورت اپنے آپ کو دیکھ نہیں سکتی، مرد تو پھر مرد ہیں۔اس نے بالوں کو بٹ دے کر کلائی پر ڈالا اور باہر نکل آئی لیکن پھیری والا گلی میں نظر نہ آیا۔اس نے بال شاپر میں ڈال کر سنبھال رکھے تھے۔

دوسری طرف شوہر نے ٹیسٹ کروانے اور ہسپتال میں داخل ہونے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ وہ مر تو جائے گا لیکن ہسپتال نہیں جائے گا، اس طرح کی افواہیں عام تھیں کہ کرونا کے مریضوں کی دیکھ بھال کرنے کے بجائے زہریلا انجکشن لگا کر انھیں زندگی سے نجات دلا دی جاتی ہے۔ ورثا کو میت دفنانے کی بھی اجازت نہیں دی جاتی، تابوت سیدھا گڑھے میں رکھ دیا جاتا ہے۔ مسئلہ دس روپے کا نہیں دس ہزار کا تھا۔ اگر اس کا بندوبست ہو جاتا تو وہ شوہر کو ہسپتال داخل ہونے پر راضی کر سکتی تھی۔

گلی میں پتا بھی کھٹکتا تو وہ باہر جھانکنے لگتی لیکن پھیری والا نظر نہ آتا۔ وہ رہ رہ کر سوچتی: جانے کہاں مر گیا پھیری والا۔ آج نہیں آیا تو کل یا پرسوں تو ضرور ہی آئے گا۔

موت کا خوف مریض کے اندر ایک انجانی سی توانائی پیدا کر دیتا ہے، جس سے وہ پورا زور لگا کر موت کو پرے دھکیلنے کی کوشش کرتا ہے۔ احمد نے بھی ایسا ہی کیا اور دس دن تک خود کو ارنٹین کرنے کے بعد وہ چنگا بھلا ہو کر بازار کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔

سونیا معمول کے خلاف ہر وقت چادر اوڑھے رکھتی اور ہر نماز کے بعد وبا کے ختم ہونے اور زندگی معمول پر آنے کی دعائیں کرتی۔ وہ یہ سوچ کر گھبرا جاتی کہ اگر شوہر نے کٹے بال دیکھ لیے تو آفت آ جائے گی۔ بیوی کو چادر کی بکل میں لپٹی دیکھ کر شوہر کو سمجھ نہ آئے کہ معاملہ کیا ہے۔ وہ تو سکول میں بھی ڈوپٹہ اوڑھ کر جاتی اور گھر میں تو بالکل اس جھنجھٹ سے آزاد پھرتی۔ ایک دن شوہر کے ہاتھ وہ شاپر لگ گیا۔ اس نے بہت صفائی دی لیکن شوہر نے ایک نہ سنی اور یہی رٹ لگائے رکھی کہ جب سے اس نے سکول جانا شروع کیا ہے۔ ہواؤں میں اڑنے لگی ہے اور اس کے پر پرزے نکل آئے ہیں۔ میاں بیوی میں روز چخ چخ ہوتی یہاں تک کہ شوہر اسے مشکوک نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔

وبا کے تھمتے ہی سکول، دفاتر اور بازار کھل گئے اور سڑکوں پر زندگی کی گہما گہمی لوٹ آئی۔ وہ کلاس میں تھی کہ پرنسپل نے اسے دل لگی کے لیے بلا بھیجا لیکن جیسے ہی اس کے کٹے بالوں پر نظر پڑی تو بجھ کر رہ گیا اور ٹھنڈی آہ بھر کر کچھ سوچنے لگا۔ شاید وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن الفاظ نہیں مل رہے، پھر کچھ دیر بعد اس کی طرف فیس کا واؤچر بڑھا کر بولا ''بچوں کی تعداد کم ہے، آپ گھر بیٹھ کر آرام کریں۔

جب بھی اسے پھیری والے کا خیال آتا تو دانت پیس کر رہ جاتی۔ وہ انتظار ہی کرتی رہی لیکن پھیری والا نہیں آیا تھا۔

بقیہ : چمکیلی روشنی کا ایک منظر

وہ اِس انبار پہ مگر تنہا بیٹھی تھی!
اُس نے مایوسی سے دیکھا، ہر طرف پُر ہول سنّاٹا تھا!
کوئی چشم حیراں تھی نہ چشم شوق!
اُس نے دیکھا، کوئی اُسے دیکھ کر جل کر راکھ بھی نہ ہوا، حاسد بھی جانے کہاں غائب و محصور تھے؟!
اِک اور حیرت پیلی روشنی کے ساتھ اُس کے گلے ملنے چلی آئی!
عادت مر رہی تھی۔
عادت کے مرقد پہ سرشت و جبلت بیدار ہو رہی تھی!
اِس پیلی پُر اِسرار روشنی میں نئے آئینے، نیارے عکس تخلیق کرنے کو تیار تھے!
اس نئے آئینے میں اُس نے اپنی ذات اور وَجود کی قوت کو کھوجا!
اپنے وجود کی یکتائی و تنہائی کو محسوس کیا!!!
اُس کی سرشت و جبلت نے اُس سے اُس کا دوج طلب کیا!!!
اِسی ضرورت نے اُسکے وجود سے اُس کے بیٹے کی صورت جنم لیا تھا!!!
اُس نے نئے آدم کو اپنی پسلی سے نہیں، اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا۔
اور کہانی تو اب شروع ہوئی تھی!

- بقیہ -

مزدور کا دن

کیا؟؟
بدرالدین چیخ پڑے
''میں اور میٹرو بس؟''
جی سر، بڑے بڑے لوگ اس میں بیٹھتے ہیں سر
مگر میں نہیں بیٹھوں گا۔ بدرالدین بے زاری سے بولے
''آج لیبر ڈے ہے، فنکشن کے مزدور بھی میٹرو میں بیٹھے ہوں گے، مجھے پہچان لیں گے تو کیا کہیں گے''
سر، میرے خیال سے تو وہ بہت خوش ہوں گے، آپ کو اپنے درمیان دیکھ کر۔
او بے وقوف۔ لیبر ڈے صرف ایک ایونٹ ہے۔ ایک دن کی زندگی ہے اس کی، پوری حیات تو نہیں تجی جا سکتی اس پر؟ ہاں؟؟
اور ششدر ڈرائیور پر ناران کے پہاڑ ایک ایک کر کے گرنے لگے۔

☆

چاندرام کی لُگائی

دیپک کنول
(ممبئی)

بیس تیس سال قبل کی بات ہے ہمارے گاؤں میں دو بھائی رہا کرتے تھے۔ بڑے کا نام تیج رام تھا اور چھوٹے کا نام چاندرام تھا۔ برسوں پہلے انکے ماں باپ کا دیہانت ہوا تھا۔ تیج رام اپنی ماں سے بے انتہا پیار کرتا تھا۔ جب وہ مرگئی تو تیج رام نے قسم کھائی کہ وہ کبھی شادی نہیں کرے گا۔ ساری زندگی برہمچاری بن کر رہے گا۔ بڑے بھائی نے جب کنورا رہنے کا فیصلہ کیا تو چھوٹے بھائی کی شادی کیسے ہو پاتی۔ اسلئے دونوں بھائی مجرد رہے۔ تیج رام امرتسر کے ایک منیاری والے کے پاس کام کرتا تھا جسکی سری نگر کے مہاراجہ بازار میں ہول سیل کی دکان تھی۔ وہ منہ اندھیرے ہی گھر سے نکل جاتا تھا اور شام کو گھر تبھی لوٹتا تھا جب چراغوں میں بتی پڑ چکی ہوتی تھی۔ گھر پہنچ کر وہ دونوالے پکا کر کھالیتا تھا اور مست ہوکر سو جاتا تھا۔ چاند کچھ کرتا دھرتا نہیں تھا پھر بھی اُس کے آنے جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ وہ تو کبھی آدھی رات کو چلا آتا تھا تو کبھی ہفتوں گھر سے غائب رہتا تھا۔ دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ تیج رام جتنا نیک چلن، خوش مزاج اور خدا ترس آدمی تھا، چاندرام اُتنا ہی بدچلن، اوباش اور نالائق تھا۔ اُس میں ایک نہیں سو طرح کے عیب تھے۔ وہ جوا کھیلتا تھا۔ چرس پیتا تھا اور رولا کرتا تھا۔ کتنی بار وہ لوگوں کے ہاتھوں پٹا تھا پھر بھی اپنی خو بو بدلنے کے لئے تیار نہ تھا۔ تیج رام نستعلیق انسان تھا۔ وہ کسی کے لینے دینے میں نہیں پڑتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا تھا۔ تیج رام کو نیک و بد کی پہچان تھی جب کہ چاندرام کو بدکاری کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں تھا۔ تیج رام نے شروع شروع میں اپنے چھوٹے بھائی کو راہ راست پر لانے کی سر توڑ کوشش کی مگر وہ تو کتے کی دم نکلا جسے بارہ برس نلکی میں ڈالو پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی ہی رہے گی۔ جب وہ اُسے سدھارنے میں ناکام رہا تو اُس نے اُس کے ساتھ سارے رشتے ناتے توڑ لئے۔ گو کہ دونوں بھائی ایک ہی چھت کے نیچے رہتے تھے کیونکہ یہ پشتینی مکان تھا اسلئے تیج رام اُسے اس مکان سے بے دخل نہیں کرسکتا تھا لیکن ایک ہی گھر میں رہ کر بھی وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ دونوں بھائیوں میں بول چال بند تھی۔ چاند نے اپنی کالی کرتوتوں سے خاندان کے نام پر جس طرح بٹہ لگا دیا تھا وہ دیکھ کے تیج رام من مسوس کر رہ جاتا تھا۔ اُن کا باپ سادھو سنت آدمی تھا۔ لوگ اب بھی اُس کی شرافت اور نیک چلنی کی قسمیں کھاتے تھے۔ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ اُسکا پوت ایسا خانہ خراب نکلے گا۔ چاند کو دیکھ کر لوگ یہی کہتے تھے کہ اولیا کے گھر میں بھوت پیدا ہوا ہے۔ چاندرام بچپن سے شرارتی تھا۔ پڑھائی لکھائی میں اُس کا من نہیں لگتا تھا۔ بس دن بھر آوارہ پھرتا رہتا تھا۔ اسی آوارگی کی وجہ سے اُسکی میل ملاقات اُن لوگوں سے ہونے لگی جو غنڈے اور بدمعاش تھے۔ ان لوگوں کی سنگت میں پڑ کر اُسے نشے کی لت لگ گئی۔ اس علت کی وجہ سے وہ چوریاں کرنے لگا۔ کرتا وہ تھا اور بھرنا تیج رام کو پڑتا تھا جب کہ اُس کا اب اُس سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔

کہتے ہیں کہ اُتم سے اُتم ملے، نیچ سے ملے نیچ۔ ایک دن اُس کا سابقہ ایک ایسے اوباش سے پڑا جس کے نام سے ہی لوگ کانپتے تھے۔ اس بدمعاش کا نام امتیاز کانیا تھا۔ اس نے بیک بلوے میں اپنی ایک آنکھ کھو دی تھی جب سے اُس کا نام امتیاز کانیا پڑا تھا۔ اُس نے ایسی دہشت اور دبدبہ بنا کے رکھا تھا کہ کوئی اُس کے خلاف منہ کھولنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ چاندرام پہلے چھپ چھپ کے گناہ کیا کرتا تھا لیکن امتیاز کانیا کا ساتھ پا کر اب وہ کھلے عام فعل شنیع کرنے سے نہیں کتراتا تھا۔ امتیاز کانیا کا کام تھا دھونس جما کر غریب لوگوں سے تاوان وصول کرنا۔ اسے لوگوں کی بزدلی کہئے یا بے بسی کہ وہ اُس کا ظلم چپ چاپ سہہ لیتے تھے۔ اب تو یہ ایک سے دو ہو گئے تھے اس لئے اُن کی طاقت بھی دوگنی ہوگئی تھی۔ اب ان لپھنگوں کے منہ کون لگے۔ یہ تو شرم و حیا بیچ کھا کر آگئے تھے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ جس کی اُتر گئی لوئی اُس کا کیا کرے گا کوئی، لیکن جو عزت دار تھے وہ اپنی عزت بچانے کے لئے تاوان ادا کرنا ہی بہتر سمجھتے تھے۔

اپنے چھوٹے بھائی کی کرنیوں کی وجہ سے تیج رام کی زندگی اجیرن ہو کے رہ گئی تھی۔ لوگ چاندرام کا تو کچھ بگاڑ نہیں پا رہے تھے البتہ وہ اپنا سارا زلہ تیج رام پر اُتار دیتے تھے۔ تیج رام روز روز کی اس زلت سے اتنا عاجز آچکا تھا کہ ایک دن اُس نے اس عذاب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گلوخلاصی پانے کا فیصلہ کیا۔ ایک دن وہ جو گھر سے نکلا تو پھر کبھی لوٹ کے نہیں آیا۔ چاندرام نے ڈھونڈنا تو دور کبھی بھولے سے بھی اُس کا نام نہیں لیا جیسے اُس کا تیج رام کے ساتھ کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ اُس کا خون تو سفید ہو چکا تھا۔ وہ تو اُس کے چلے جانے سے ایک طرح خوش ہی تھا کہ چلو کسی نہ کسی بہانے اس بلائے بے درماں سے چھٹکارا ملا۔ بھائی کے غائب ہوتے ہی چاندرام نے امتیاز کانیا اور اُس کے گرگوں کو اپنے گھر پر بلانا شروع کیا۔ اب تو وہ بلا روک ٹوک چاندرام کے گھر پر آکر خوب اُودھم مچاتے تھے۔ محلے کے لوگ انکی حرکتوں کی وجہ سے نالاں و پریشاں ضرور تھے مگر قہر درویش بر جان درویش کے مصداق وہ بس خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتے تھے۔ اور کیا کرسکتے تھے۔

بڑے بھائی کے برہمچاری رہنے کے سبب اُسکی زندگی پر جو گہن لگا تھا وہ اس گہن کی وجہ سے کافی دکھی اور پریشان تھا۔ وہ اپنے بھائی کی طرح مجرد اور پھٹکل زندگی گزارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنا گھر بسانا چاہتا تھا۔ بچے پیدا کرنا چاہتا تھا تاکہ اُس کے باپ شیورام کی نسل آگے بڑھے۔ ایک دن امتیاز کانیا پینگ کے عالم میں تھا۔ اُس نے اُسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''چاند بھائی اپنا گھر بسالو۔ کب تک پھٹکل زندگی جیو گے۔ گھر میں بیوی آئے گی تو کوٹھوں کا خرچہ بچ جائے گا اور ساتھ ہی بیوی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے کو ملے گا۔''

امتیاز کانیا کے اس مشورے سے چاندرام کا دل مچل اُٹھا۔ من میں پھلجڑیاں چھوٹنے لگیں مگر ساتھ ہی دل میں ایک ٹیس سی اُٹھی۔ اُس نے اُداس

ہو کے امتیاز کانیا سے کہا۔

''بھائی۔تم نے تو میرے من کی بات کہی پر بات یہ ہے کہ یہ کام کون کرے۔میرا بھائی نہ بندو، جات نہ جورو۔ماں باپ تو برسوں پہلے چھوڑ کر چلے گئے۔ ایک بھائی تھا جو جیتے جی ہی مر گیا۔اب کون میرے لئے رشتہ ڈھونڈے گا؟ کون گاؤں گاؤں جا کر سڑکوں کی دھول پھانکے گا؟۔کون کسی کے سامنے جھولی پھیلائے گا''

امتیاز کانیا نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔''تمہارا بھائی تمہیں چھوڑ کے چلا گیا تو کیا ہوا۔ہم تو زندہ ہیں نا۔یہ چھوکرے ہیں نا یہ تمہارے لئے رشتہ ڈھونڈیں گے۔بس تو اشارہ کر تجھے کیسی لڑکی چاہیے۔کچے دھاگے سے بندھی چلی نہ آئی تو کہنا۔ارے تمہارے بھائی نے بھی کچھ عزت کما کے رکھی ہے''

چاندرام نے جذباتی ہو کر پہلے اُس کا منہ چوم لیا اور پھر اُس کے سینے سے لگ کر رو پڑا۔

شرابیوں اور چرسیوں کے ساتھ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جب وہ پینگ کے عالم میں ہوتے ہیں تو آسمان زمین کے قلابے ملاتے ہیں۔جب نشہ اُتر جاتا ہے تو رات گئی اور بات گئی مگر امتیاز کانیا اپنا دیا ہوا وعدہ نہیں بھولا۔ایک ہفتے کے بعد اُس نے اپنے گرگوں کو لڑکی کی تلاش میں قرب و جوار کے اُن گاؤں میں روانہ کیا جہاں جہاں ہندو پریوار رہتے تھے۔اُنہوں نے گھر گھر جا کر چاندرام کے لئے رشتہ مانگا۔چاندرام کے اپنے گاؤں میں بھی کئی لڑکیاں ہاتھ پسارے کھڑی تھیں مگر چاند رام یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اس گاؤں میں اُس کا رشتہ ہونا ممکن نہیں کیونکہ اس گاؤں کا بچہ بچہ اُس کے کالے کرتوتوں سے واقف تھا۔اس لئے اُس کے سنگی ساتھی ایسے گاؤں میں گئے جہاں اُنہیں اس بات کا اطمینان تھا کہ یہاں چاند کے کالے کرتوتوں کا پرتو نہیں پڑا ہوگا۔مگر یہ دیکھ کر وہ بھونچکے رہ گئے کہ جس گھر میں بھی وہ رشتہ مانگنے گئے، چاند کا نام سنتے ہی وہ آڑے ترچھے ہونے لگے اور اُنہوں نے کھڑے کھڑے ہی اُنہیں باہر کا راستہ دکھا دیا۔وہ کہتے ہیں نا کہ بدا چھا بدنام برا۔ چاندرام کے ساتھ مسلہ یہ تھا کہ ایک تو وہ اقلیتی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اور ہندوں میں اس طرح کے کردار خال خال ہی دیکھنے کو ملتے تھے۔دوم یہ کہ ہندو آبادی میں لوگ اتنے کم تھے کہ اُنکا ساختہ پرداختہ اپنی برادری سے چھپا نہیں رہ سکتا تھا۔

امتیاز کانیا اور اُس کے ساتھیوں نے چاندرام کو ٹھکانے لگانے کے لئے اپنی طرف سے کوئی کور کسر نہیں چھوڑی۔اُنہوں نے اپنے یار کی خاطر سو طرح کے جھوٹ بولے۔چاند رام کو نیک اور پارسا ثابت کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا یہاں تک کہ جھوٹی قسمیں بھی کھائیں۔جب اس سے کام نہ بنا تو اُنہوں نے دھونس دھمکی سے کام لینے کی کوشش کی۔لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔اس علاقے کے لوگ جیسے یہ قصد کر کے بیٹھے تھے کہ چاندرام کے ساتھ کسی بھی قیمت پر رشتہ نہیں جوڑنا ہے۔آخر کون باپ اپنی بیٹی کا ہاتھ اُس آدمی کے ہاتھ میں دے جس کی ایک بھی کل سیدھی نہ ہو۔دو مہینے کی دھوڑ دوپ کے باوجود کہیں پر بھی بیل منڈھے چڑھی نہیں۔چاند کا کنوارا پن بدستور برقرار رہا۔

جس گاؤں میں چاندرام رہتا تھا اُس میں اگرچہ ہندو آبادی کے تناسب سے بہت کم لوگ تھے پھر بھی ہندو اور مسلمان شیر و شکر بن کر رہ رہے تھے۔ چاند بھی اسی برادری کا ایک فرد تھا مگر اُسے جتنا مسلم طبقہ ناپسند کرتا تھا اُس سے کہیں زیادہ اُس کے اپنی ذات برادری کے لوگ۔کیونکہ لوگوں کی نظر میں وہ نرا پاجی تھا۔وہ خدا کو بھول چکا تھا۔اُسے کبھی کسی نے مندر کا رخ کرتے نہیں دیکھا۔کبھی کسی دھارمک کاریہ میں حصہ لیتے نہیں دیکھا۔جس کا کردار اتنا داغدار ہو اور جو گمراہ ہو چکا ہو، اُس کے لئے دھرم کرم کے کیا معنی۔وہ تو محض نام کا ہندو تھا۔ہندو دھرم سے اُس کا کوئی لینا دینا نہ تھا۔اُس کے لئے حلال و حرام کے کوئی معنی نہیں تھے۔اُسے جو ملے وہ کھا لیتا تھا۔کھانے پینے میں اُسے کوئی پرہیز نہیں تھی۔کسی نے بڑے کا گوشت کھلا دیا تو شوق سے کھا لیا، ہندو کے ہاتھ کا پکا ملا تو غڑپ شڑپ کر کے کھا لیا۔گاؤں میں جتنے بھی ہندو پریوار تھے اُن میں اکثریت اُن لوگوں کی تھی جو قدامت پسند تھے۔وہ مسلمان کے ہاتھ کے پکے کھانے کو چھونا بھی پاپ سمجھتے تھے کیونکہ اُنکے لئے یہ کھانا جھوٹا تھا۔یہی حال مسلمانوں کا تھا۔وہ بھی کسی ہندو کے ہاتھ کا چھوا کھانا کھانا گناہ سمجھتے تھے۔چاندان مذہبی بندشوں کا پابند نہیں تھا۔اُس کے یہی لچھن دیکھ کر ہندوں نے اُسے ناستک قرار دیا تھا۔جب کہ مسلمانوں کے لئے وہ ایک دہریہ تھا کیونکہ وہ کسی خدا کی بندگی نہیں کرتا تھا۔

جب اُسے یہ خبر ملی کہ سبھی ہندوں نے اُسے اپنی بیٹی دینے سے انکار کر دیا تو وہ آگ ببولا ہو کر اپنی ہی برادری کو خوب صلواتیں سنانے لگا۔اتنا ہی نہیں اُس نے دوسرے دن اپنے ہی گاؤں کے دو ایک ہندوں کی جم کر ٹھکائی کر دی۔اُس کے سر پر خون سوار تھا۔اُسے لگ رہا تھا کہ ہندوں نے اُسے اپنی بیٹی نہ دیکر اُس کی بے عزتی کی تھی اس لئے وہ ان سے متنفر ہو کر انہیں تیرے بھیجنے لگا۔ وہ جہاں بھی بیٹھتا تھا، اپنی ذات برادری کے لوگوں کو پانی پی پی کر کوستا رہتا تھا۔اُس نے بھی ٹھان لی تھی کہ وہ اُن لوگوں کو سبق سکھائے گا جنہوں نے اُس کے ساتھ اپنی بیٹی کو بیاہنے سے انکار کیا تھا۔اُس نے اسی گاؤں کی ایک لڑکی جس کا نام سارہ تھا پر ڈورے ڈالنے شروع کئے۔سارہ کھلی ڈھلی لڑکی تھی۔اُس کے گاؤں کے کئی لڑکوں کے ساتھ مراسم چل رہے تھے۔بہت خوبصورت تھی اس لئے گاؤں کے منچلے اُس پر مرتے تھے۔چاند بھی دل ہی دل میں اُس سے پیار کرتا تھا۔ایک دن وہ اُس سے ملا اور صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ وہ اُس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔سارہ پہلے تو سناٹے میں رہ گئی پھر بدک کر بولی۔

''پاگل ہو گیا ہے کیا۔تو ہندو اور میں مسلمان۔میں تمہارے ساتھ کیسے شادی کر سکتی ہوں؟''

''کیوں میں کوئی آگ ہوں جو تو جل جائے گی۔ارے میں تو نام سے ہندو ہوں۔کبھی تم نے مجھے کسی مندر میں جاتے دیکھا۔کبھی پوجا پاٹھ کرتے دیکھا۔چل میں اپنا نام سبحان رکھ دیتا ہوں۔اب تو شادی کرے گی نا مجھ سے؟''

جواب میں وہ کچھ نہ بولی۔بس ایک شوخ نگاہ اُس پر ڈال کر اٹھلاتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔چاندرام بہت دیر تک گومگو کی حالت میں کھڑا رہا۔اُس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے سارہ کا اقرار سمجھ لے یا انکار۔بہر حال

دل میں ایک موہوم سی اُمید لے کر وہ وہاں سے گھر کی جانب چل پڑا۔

ہفتے عشرے تک چاندرام گاؤں سے غائب رہا۔ جب وہ گاؤں لوٹا تو وہ ایک دم بدل چکا تھا۔ پہلے وہ بے ریش و بروت رہا کرتا تھا لیکن اب اُس نے داڑھی بڑھالی تھی۔ سر پر ایک جالی دار سفید ٹوپی تھی۔ لوگوں کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ چاند مسلمان ہوگیا ہے۔ بہت جلد اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ اُس نے گاؤں کے مولوی احمد شاہ سے کلمہ پڑھا ہے اور چاندرام کی جگہ اپنا نام چاند محمد رکھ دیا۔ جب یہ خبر گاؤں کے مسلم طبقے تک پہنچی تو لوگ بلیوں اُچھل پڑے جب کہ ہندوں کے گھروں میں صف ماتم بچھ گیا۔ ایسا لگا کہ اُس کے دھرم بدلنے سے ہندو دھرم تہہ و بالا ہوگیا ہو۔ کل تک جو لوگ اُسے دہریہ مانتے تھے اور اُس سے بات کرنا بھی گناہ سمجھتے تھے اب وہی لوگ اُس کے دھرم بدلنے پر شادیانے بجا تھے۔ لوگ جوق در جوق اُس کے گھر پر اُس کے دیدار کرنے آنے لگے۔ ایک رات میں کل کا بھوت آج کا اولیا بن گیا تھا۔ کوئی اُسے نماز پڑھانا سکھا رہا تھا۔ کوئی اُسے روزوں کی اہمیت سمجھا رہا تھا۔ کوئی اُسے حدیث سے واقف کرا رہا تھا۔ غرض ہر کوئی بساط بھر کوشش میں لگا تھا کہ اس نومسلم کو عالم اسلام میں پیوست کیا جائے۔

چند روز بعد جب وہ اپنے حواریوں کو لے کے سارہ کے باپ قادر شیخ کے پاس سارہ سے نکاح کرنے کے ارادے سے پہنچا تو یہ خبر سن کر گویا اُس کے سر پر بجلی گری کہ سارہ کا تین روز پہلے ہی اسی گاؤں کے ایک لڑکے سے نکاح ہوا تھا۔ یہ خبر سن کر چاندرام کا خون کھول اُٹھا۔ اُس نے اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر قادر شیخ کی جم کر پٹائی کی۔ وہ اس قدر آگ بگولا تھا کہ اگر قادر شیخ کی بیوی اُسے نہ روکتی تو وہ قادر شیخ کا خون ہی کر ڈالتا حالانکہ اس میں قادر شیخ کی کوئی خطا نہیں تھی۔ وہ بیچارہ تو اس سارے معاملے سے بے خبر تھا۔ چاند کا سارا منصوبہ خاک میں مل گیا تھا۔ جس مقصد کے لئے اُس نے اپنا دھرم بدل دیا تھا اُس پر تو سارہ نے پانی پھیر دیا۔ اُسے سارہ کی اس بے وفائی سے بڑا گہرا صدمہ لگا۔ گاؤں کے مسلمان تو ابھی تک اُس کے دھرم بدلنے سے فراحاں اور شاداں تھے جب کہ چاند دو دھرموں کے بیچ پس کر رہ گیا تھا۔

کچھ دن وہ گھر میں بیٹھا اپنی ناکامی کا سوگ مناتا رہا۔ اپنے غم کو بھلانے کے لئے وہ خوب چرس پینے لگا تھا۔ گھر کی حالت کباڑ خانے جیسی ہوگئی تھی۔ ہر کمرہ انگڑ کھنگڑ سے بھرا پڑا تھا۔ وہ بھی اسی کاٹھ کباڑ کا ایک حصہ بن کر رہ گیا تھا۔ جب کبھی کوئی مسلم پڑوسی اُس سے ملنے آتا تھا اور اُس سے نماز پڑھنے کے لئے کہتا تو وہ جلبلا اُٹھتا تھا۔ پتا چلا کہ کچھ دن بعد اُس نے اپنی داڑھی منڈھوالی۔ ٹوپی پھینک دی اور اپنا نیا نام بھی چھوڑ دیا۔ وہ اب اپنے پرانے نام سے ہی اپنے آپ کو پیش کرنے لگا۔ جب گاؤں کے مسلم طبقے تک یہ خبر پہنچی کہ چاند نے پھر سے اپنا پہلا دھرم اپنا لیا ہے تو جہاں ہندو بغلیں بجانے لگے وہیں مسلمان بغلیں جھانکنے لگے۔ اُنہوں نے اُس سے ترک موالات کر دیا۔ باوجود اس کے ہندو اُسے اپنا ماننے کے لئے تیار نہیں تھے اور نہ ہی مسلمان اُسے اپنانے کو راضی تھے۔ وہ نہ ہندو رہا تھا نہ مسلمان۔ ایسے میں وہ جائے تو کہاں جائے۔ وہ اپنے ہی گاؤں میں ردوا کھدوا کی طرح جینے پر مجبور ہوا تھا۔

ایک رات وہ کسی کو بنا بتائے گھر سے نکل گیا۔ ایک مہینہ گزر جانے کے باوجود جب وہ لوٹ کے نہیں آیا تو لوگ یہ کہہ کر سجدہ شکرانہ بجانے لگے کہ چلو خس کم جہاں پاک ہوگیا۔ اُس کے ساتھیوں نے اُس کی بہت کھوج کی مگر اُنہیں اُس کی بو باس تک نہ ملی۔ اب تو یہ پکا ہوگیا تھا کہ وہ نابود ہوگیا ہے اس لیے اُس کے غائب ہونے پر گاؤں میں جشن کا سا ماحول تھا۔ کل تک اُس کا ایسا خوف طاری تھا کہ گاؤں کا کوئی فرو بشر اُس کے خلاف زبان کھولنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اب جب کہ وہ لاپتہ ہوگیا تھا عورتیں اُسے جی بھر کے کوسنے دئے جا رہی تھیں۔ مرد اُس پر تبرے بھیج رہے تھے۔

ایک سال بیت گیا۔ چاندرام کی گمشدگی ہنوز ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ ایک دن گاؤں میں پھر بھونچال آ گیا جب چاندرام ایک عورت اور دو بچوں کے ساتھ گاؤں میں نمودار ہوا۔ عورتوں کے کوسنے اور مردوں کی بددعائیں بے اثر ثابت ہوئیں تھیں۔ وہ تو بھلا چنگا دکھائی دے رہا تھا۔ کہنے والے سچ ہی کہہ گئے ہیں۔ سچے مر گئے، جھوٹوں کو تپ نہیں آئی۔ گاؤں کی عورتیں چھپ چھپ کے اُس عورت کو دیکھنے کی کوشش کر رہی تھیں جو چاندرام کے پیچھے پیچھے اپنے پوت لے کے چل رہی تھی۔ چاندرام کے لوٹ آنے کے ساتھ ہی گاؤں کا ماحول متحرک ہوگیا۔ جہاں دیکھو اسی بات کا چرچا تھا کہ چاندرام یہ کس حرافہ کو اُٹھا کر لایا ہے۔ عورتیں تو اس مسلے میں کچھ زیادہ ہی سرگرم دکھائی دے رہی تھیں۔ جہاں بھی چار عورتیں اکھٹی ہوتی تھیں اُن کے ہدف پر وہی عورت ہوتی تھی جسے چاندرام اپنے گھر لے آیا تھا۔ وہ جو بھی تھی گاؤں کے لئے ایک معمہ بنی ہوئی تھی۔ ایک ہفتے تک لوگ اس عورت کی تہیں کھولنے کی کوشش میں الجھے رہے۔ کوئی کہے چھنال ہے۔ کوئی کہے رانڈ ہے۔ غرض جتنے منہ اُتنی باتیں۔ اصل میں عورت کون تھی یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ بس انکلوں کی بنا پر لوگ اُس کا کردار مسخ کئے جا رہے تھے۔ چاندرام کے ساتھ اس کا کیا رشتہ تھا یہ بھی کوئی نہیں جانتا تھا۔ اُس نے تو آتے ہی اپنے آپ کو گھر کی چار دیواری میں قید کر لیا تھا۔ وہ ایک پل کے لئے بھی گھر سے باہر آتی نہیں تھی البتہ اُس کے بچے گھر کے باہر گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے۔ گاؤں کے سبھی بچوں کو یہ تاکید کی گئی تھی کہ وہ ان حرامیوں سے کسی قسم کا میل جول بڑھانے کی کوشش نہ کریں۔ بچے اپنے ماں باپ کے فرمان کا بخوبی پالن کرتے تھے۔ چاندرام کے یہ بچے جو بڑے پیارے اور بڑے معصوم تھے جب کسی بچے سے کھیلنے کی کوشش کرتے تو وہ کھیلنے کی بجائے یا تو انہیں گالیاں دیتے یا ایک دو ہاتھ جما دیتے تھے۔ وہ کہتے ہیں نا کہ تازی پر بس نہ چلا، ترکی کے کان اینٹھ لئے۔ لوگ چاندرام سے دو دو ہاتھ نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ اپنا غصہ ان بچوں پر اُتارتے تھے۔

چاندرام اس عورت کے آنے کے بعد ایک دم بدل کے رہ گیا تھا۔ وہ صبح سویرے گھر سے نکلتا تھا اور رات گئے تھکا ماندہ گھر لوٹ آتا تھا۔ پچھلے تین چار دنوں سے موسم کا مزاج بگڑ گیا تھا۔ بارش تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے آسمان میں چھید ہوگیا ہو۔ مسلسل بارش سے ندی نالوں میں پانی کی سطح

''چہارسُو''

بڑھ گئی تھی۔گاؤں کے بیچوں بیچ بہنے والا دریا اُفان پر تھا۔ایک دن کیا ہوا کہ چاند رام کے بچے دریا کنارے کھیل رہے تھے۔گاؤں کے کسی شرارتی بچے نے چاندر ام کے بچے کو پانی میں گرادیا۔جب اُس کے بھائی نے اُسے ڈوبتے ہوئے دیکھا تو اُس نے شور مچایا۔چاندرام جو اتفاق سے پاس ہی کھڑا تھا،شور سن کر بھاگتا ہوا آیا۔اُس نے جب بچے کو پانی میں ہاتھ پاوں مارتے ہوئے دیکھا تو اُس نے آو دیکھا نہ تاؤ۔وہ فوراً پانی میں کود گیا،یہ جانتے ہوئے بھی کہ اُسے تیرنا نہیں آتا۔ اُس نے بچے کو تو بچالیا مگر وہ خود کو نہیں بچا سکا۔پانی کا ایک تیز جھکڑ اُسے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔بچوں کے چیخ و پکار سن کر اُن کی ماں دوڑتی ہوئی چلی آئی۔ اُس نے لوگوں کو دہائی دی مگر کسی نے چاند کو بچانے میں مدد نہ کی۔لوگ تب تک کنارے پر کھڑے تماشہ دیکھتے رہے جب تک چاندرام ڈوب نہیں گیا۔

کسی نے پولیس کو خبر کر دی۔پولیس حرکت میں آ گئی اور چاندرام کی لاش پاس کے گاؤں سے برآمد کی گئی۔چاندرام کی بیوی کو لاش لینے کے لئے تھانے میں طلب کیا گیا۔جب وہ روتے دھوتے تھانے پہنچ گئی تو تھانے دار نے اُسے تسلی دیکر بٹھایا اور کچھ قانونی لوازمات پورے کرنے کے لئے چاندرام سے اُس کے رشتے کی بابت جانکاری مانگی تو پہلی بار یہ عقدہ کھلا کہ وہ چاندرام کی بیوی نہیں رکھیل تھی۔اُس کا نام شکنتلا تھا۔وہ تو کشتواڑ کے ایک غریب پریوار کی بیوہ تھی جس کا شوہر دو برس پہلے ایک حادثے میں مر گیا تھا۔شوہر کی موت کے بعد اُس کے رشتہ داروں نے اُس کا قافیہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔وہ نہیں چاہتے تھے کہ وہ اُن کی جائیداد کی حصہ دار بنے اس لیے اُنہوں نے اُسے ہر طرح کی اذیتیں دینی شروع کیں۔اُس پر جھوٹے الزام لگائے۔اُس کے بچے بھوک سے بلک رہے تھے۔وہ ایک ایک دانے کی محتاج بن کر رہ گئی تھی۔اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچوں کی خاطر اپنی عصمت بیچنے پر مجبور ہو جاتی۔چاندرام فرشتہ بن کر اُس کی زندگی میں وارد ہوا۔اُس نے جب اُس کی حالت دیکھی تو اُس کا کلیجہ پھٹ پڑا۔اُس نے عہد کیا کہ وہ ان بچوں کو بھوکوں مرنے نہیں دے گا۔وہ انکی کفالت کرے گا۔

اُس نے اپنا قول نبھایا۔وہ سویرے گھر سے نکلتا تھا اور سری نگر جا کر منڈی میں حمالی کا کام کر کے چار پیسے کما کر لاتا تھا اور شکنتلا کے ہاتھ پر رکھ دیتا تھا۔وہ اُسے اور اُس کے بچوں کو ہر طرح سے خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔بدلے میں اُس نے اُس سے کچھ نہیں مانگا۔شکنتلا کا ماننا تھا کہ وہ انسان نہیں فرشتہ تھا جس نے اُسے نئی زندگی دی تھی۔آج وہی فرشتہ اُس سے دور چلا گیا تھا۔

جب چاندرام کی چتا کو شکنتلا کے بچوں نے آگ دکھائی تو چتا سے شعلے لپک لپک کے اُٹھ رہے تھے جو چلا چلا کر کہہ رہے تھے کہ چاندرام برا نہیں تھا،برا تو یہ سماج ہے جس نے چاندرام کو سمجھنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔وہ تو بس اُس کے ظاہر کو تاکتے رہے،اُس کے باطن میں کسی نے جھانکنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کی۔چاندرام نشہ کرتا تھا۔وہ شراب پیتا تھا۔وہ کسی کا خون نہیں پیتا تھا۔وہ دوغلے کردار کا انسان نہیں تھا۔وہ جیسا دن میں نظر آتا تھا،ویسا ہی رات میں بھی دکھائی دیتا تھا۔وہ اُن سفید پوشوں کی طرح نہیں تھا جو دن کے اُجالے میں درس خوان ہوتے ہیں اور رات کے اندھیارے میں،عزت و عصمت کے غنیم۔وہ سماج کے اُن ٹھیکداروں جیسا بھی نہیں تھا جو دوسروں کو اخلاق کا درس دیتے ہیں اور خود اصولوں کی دھجیاں اُڑاتے ہیں۔ چاندرام فلسفی نہیں تھا۔وہ گیانی بھی نہیں تھا۔چاندرام ایک معمولی انسان تھا جس کی سرشت میں انسانیت کا شعلہ روشن تھا۔جس کے ضمیر کا شرارہ فروزاں تھا۔

آ گاہی

پادری نے اعلان کیا کہ جس نے جنت خریدنی ہے وہ ہم سے رابطہ کر سکتا ہے اور جاہل لوگ جنت حاصل کرنے کے لیے بڑی سے بڑی رقم ادا کرنا شروع ہو گئے۔

ایسے میں ایک عقلمند شخص نے جہالت کا شکار ان لوگوں کو اس احمقانہ کام سے روکنے کے لیے ہر ممکن کوشش کی لیکن سب بے سود۔۔

آخر ایک دن اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔

وہ گرجا گھر گیا اور جنت بیچنے کے انچارج پادری سے کہا:

مجھے جہنم خریدنا ہے۔کیا قیمت ہے؟

پادری حیران ہوا اور کہنے لگا:

جہنم؟

اس شخص نے کہا:

''ہاں جہنم''

پادری خوش ہوا کہ اب جہنم بیچ کر بھی کمائی کر سکوں گا۔

لہٰذا سوچے بغیر کہا:

''تین سکے''

اس آدمی نے جلدی جلدی رقم ادا کی اور کہا:

''جہنم کی دستاویز دے دو''

پادری نے کاغذ کے ایک ٹکڑے پر لکھا:

''جہنم کی دستاویز''

وہ شخص خوشی خوشی دستاویز اٹھا کر چرچ سے نکل آیا اور شہر کے مرکزی چوک پر کھڑا ہو کر چلّایا:

''میں نے جہنم خرید لیا، یہ اس کی دستاویز ہیں اور میں کسی کو بھی اس میں داخل نہیں ہونے دوں گا لہٰذا تمہیں اب جنت خریدنے کی ضرورت نہیں کیونکہ میں کسی کو جہنم میں نہیں جانے دوں گا''

یہ شخص تھا ''سقراط'' جس نے اپنے اس اقدام سے لوگوں کو انکی لاعلمی کی وجہ سے کی جانے والی حماقت سے نجات دلائی۔

دنیا میں ایک ہی خوبی ہے:

''آ گاہی''

جبکہ جہالت اک گناہ!!

"اعترافِ عشق"

حبیب جالب

(۲۴۔مارچ ۱۹۲۸ء تا مارچ ۱۹۹۳ء)

بھلا بھی دے اسے جو بات ہوگئی پیارے
نئے چراغ جلا رات ہوگئی پیارے

تری نگاہ پشیماں کو کیسے دیکھوں گا
کبھی جو تجھ سے ملاقات ہوگئی پیارے

نہ تیری یاد نہ دنیا کا غم نہ اپنا خیال
عجیب صورت حالات ہوگئی پیارے

اداس اداس ہیں شمعیں بجھے بجھے ساغر
یہ کیسی شام خرابات ہوگئی پیارے

وفا کا نام نہ لے گا کوئی زمانے میں
ہم اہل دل کو اگر مات ہوگئی پیارے

تمہیں تو ناز بہت دوستوں پہ تھا جالبؔ
الگ تھلگ سے ہو کیا بات ہوگئی پیارے

○

محمود شام

(کراچی)

اک بانگ دل نواز تھی۔ دریا کے شور میں
پنہاں تھی ایک راگنی۔ دریا کے شور میں

موجوں سے گفتگو رہی اپنی تمام رات
بزمِ سخن بپا رہی۔ دریا کے شور میں

اپنے دروں میں ڈوبنے والوں کو ہی ملا
درسِ شعور وآگہی۔ دریا کے شور میں

ہوتا ہے عزم پختہ چٹانوں کو دیکھ کر
بجتا ہے طبلِ فتح بھی۔ دریا کے شور میں

لہروں کا حسن وعشق سے ہے ربطِ لازوال
شامل ہے سازِ عاشقی۔ دریا کے شور میں

سمجھو کہ اس نے اپنے کنارے کو پالیا
گم جس کی ذات ہوگئی۔ دریا کے شور میں

سندھو کا جاں نثار ہوں۔ دل دادۂ چناب
گزری ہے میری زندگی۔ دریا کے شور میں

○

نسیم سحر

(راولپنڈی)

کیسا آغازِ سفر تھا، اب کہاں ہوں، دیکھئے !
آگ تھا مَیں ابتدا میں، اب دھؤاں ہوں دیکھئے

دو مکاں ہوتے ہوئے بھی لامکاں ہوں، دیکھئے
مَیں زمیں اور آسماں کے درمیاں ہوں، دیکھئے

جانتا ہوں میں فنا کا فلسفہ، یعنی کہ مَیں
محرمِ رازِ درونِ کُن فکاں ہوں، دیکھئے

نفرتوں کی جھیل کا ٹھیرا ہوا پانی نہیں
عشق کا اِک چشمۂ آبِ رواں ہوں، دیکھئے

یہ جو میری داستاں ہے، صرف میری ہی نہیں
داستاں در داستاں در داستاں ہوں، دیکھئے

مَیں عیاں جتنا بھی ہوں، اُس پر تو ہے سب کی نظر
میری خواہش ہے کہ مَیں جتنا نہاں ہوں، دیکھئے

اِس طرف ہیں رفتگاں اور اُس طرف آیندگاں
اِک کڑی بن کر میں ان کے درمیاں ہوں دیکھئے

بیٹھئے دو چار لمحوں کے لئے اس چھاؤں میں
مَیں مثالِ سایۂ ابرِ رواں ہوں، دیکھئے

وُہ مکیں تھا میرے دل میں، دیکھنا تھا تب مُجھے !
اب مَیں اِک ویران اور خالی مکاں ہوں، دیکھئے

یاد کے اِک منجمد لاوے میں کب سے دفن ہوں
یعنی اِک سویا ہؤا آتش فشاں ہوں، دیکھئے

لکھ رہا ہوں مَیں بظاہر صرف اپنی خودنوِشت
اِستعاروں میں حدیثِ دیگراں ہوں، دیکھئے !

مبتلائے خبطِ عظمت جو بھی ہے، کہتا ہے یہ
مَیں فلاں ابنِ فلاں ابنِ فلاں ہوں، دیکھئے

آپ چاہے جس قدر مجھ پر ستم ڈھاتے رہیں
آپ کے بارے میں اب بھی خوش گماں ہوں، دیکھئے

لمحۂ موجود میں موجودگی کے باوجود
ماضی و آیندہ میں بھی مَیں رواں ہوں، دیکھئے

نرخ گرتے جا رہے ہیں مِصر کے بازار میں
مَیں مگر ارزاں نہیں، جنسِ گراں ہوں، دیکھئے

میری پیشانی پہ لکھا ہے سفر افلاک کا
پھر بھی صدیوں سے اسیرِ خاکداں ہوں، دیکھئے

میری بدبختی نہیں تو اَور کیا کہئے اِسے ؟
اِک حقیقت ہو کے بھی وہم و گماں ہوں، دیکھئے

مَیں صدائے موسمِ گُل بن کے آیا ہوں یہاں
یعنی مَیں اعلانِ تسبیحِ خزاں ہوں، دیکھئے

آپ چاہیں تو مُجھے پیروں تلے روندیں، مگر
ساحلوں کی دلدلی ریگِ رواں ہوں، دیکھئے

کیا کہوں، جب گوش بر آواز ہی کوئی نہیں !
شہر میں ہو کر بھی صحرا کی اذاں ہوں، دیکھئے !

دوسروں کو چھاؤں کرتا ہوں مُہیّا مَیں نسیم
اور خود جلتا ہؤا اِک سائباں ہوں، دیکھئے

پنہاں

(نیویارک)

پسِ آئینۂ حسنِ نظر میں عشق ہوں میں عشق ہوں
حوالہ بس یہی اک معتبر میں عشق ہوں میں عشق ہوں

شمع کی لو نہ پروانے کا پَر میں عشق ہوں میں عشق ہوں
مرا جینا مرا مرنا امر میں عشق ہوں میں عشق ہوں

نہیں میں قد و گیسوتن بدن رخسار و لب ، میں دل فقط
مجھے وہ حسن کہتا تھا مگر میں عشق ہوں میں عشق ہوں

مرے اپنے نہیں یہ پھول پتے شاخ سائے اور پھل
میں اپنی ذات میں ہوں اک شجر میں عشق ہوں میں عشق ہوں

جو میرا حال پوچھے وہ مجھے پہلے خبر تو دے مری
مجھے ہوتی نہیں اپنی خبر میں عشق ہوں میں عشق ہوں

مرا دل اُس کا آئینہ اِسے شفاف رکھنا ہے سدا
وضیفہ بس یہی شام و سحر میں عشق ہوں میں عشق ہوں

چمن سے گر نوید گل بطرزِ رنگ و بو آ جائے تو
مجھے لگ جائیں گے تتلی کے پر میں عشق ہوں میں عشق ہوں

کوئی طوفان اس دنیا کا مجھ کو چھو نہیں سکتا کبھی
مرا تو ہے خدا کے دل میں گھر میں عشق ہوں میں عشق ہوں

وہ ہر اک شعر میں جس کے مکرر اعترافِ عشق ہے
غزل پنہاں وہی بارِ دگر میں عشق ہوں میں عشق ہوں

○

ڈاکٹر ریاض احمد

(پشاور)

رونقِ دنیا کے میلے میں جو مل جاتے ہیں لوگ
دل جنہیں ڈھونڈھے نہ جانے وہ کہاں جاتے ہیں لوگ

کیا ہوئے جن کے تعلق سے یہ روح سرشار تھی
روشنی بن کر میری آنکھوں پہ چھا جاتے ہیں لوگ

ہے یہ دنیا اک سرائے جس میں ہر لمحہ یہاں
کوچ کر جاتے ہیں کچھ تو کچھ نئے آتے ہیں لوگ

امتحانِ زندگی میں موڑ کچھ ایسے بھی ہیں
کچھ سنبھل جاتے ہیں لیکن کچھ پھسل جاتے ہیں لوگ

دوست بن جاتے ہیں اور کچھ مہرباں بھی ہمسفر
کچھ بچھڑ جاتے ہیں لیکن کچھ بکھر جاتے ہیں لوگ

کارواں ہر دم رواں رہتے ہیں راہِ زیست پر
رہنما جن کے ہوں کشتی پار کر لیتے ہیں لوگ

یہ تو خوئے زندگی ہے امتحاں ہر موڑ پر
یونہی چلتے کارواں ہیں کچھ نکل جاتے ہیں لوگ

دل گرفتہ ہوں مگر یہ سوچتا ہوں رات بھر
عمر بھر کا ساتھ کہہ کر کیوں بدل جاتے ہیں لوگ

جانے جھوٹی آن کی خاطر جہاں میں کس طرح
آفتیں ہر سمت کی دن رات سہہ جاتے ہیں لوگ

زندگی ہے امتحانِ نفس، ہر ذی روح کا
امتحاں ہوتے رہیں، عشرت میں کھو جاتے ہیں لوگ

رات یہ عقدہ کھلا مجھ پر بالآخر یوں ریاض
نفسِ امارہ ہو گر غالب تو رُل جاتے ہیں لوگ

○

اشرف جاوید

(لاہور)

ہمیں جدائی میں نقصان تو کوئی نہیں تھا
بس اک خلش تھی، پشیمان تو کوئی نہیں تھا

نہ چشمِ نم ہے، نہ غم ہے، نہ زخمِ تازہ ہے
دل ایسا بے سروسامان تو کوئی نہیں تھا

قفس کھلا تھا، جسے اُڑنا تھا، وہ اُڑ جاتا
رہائی کے لیے تاوان تو کوئی نہیں تھا

کیا ہے ترکِ تعلّق بھی دل پہ سِل رکھ کر
یہ مرحلہ کبھی آسان تو کوئی نہیں تھا

چراغ ہی میں نہ دم خم، نہ استقامت تھی
ذرا سا جھونکا تھا، طوفان تو کوئی نہیں تھا

سفر میں پاؤں ہوئے جاتے ہیں بہت بوجھل
ہمارے ساتھ میں سامان تو کوئی نہیں تھا

بلا کی رات تھی! کانٹوں پہ لوٹتے گزری
سوائے اُس کے ہمیں دھیان تو کوئی نہیں تھا

اَنا ہی مانعِ پرسش رہی سدا، ورنہ
کسی کے حال سے انجان تو کوئی نہیں تھا

زمانہ بیچ کھڑا تھا فصیل کی صورت
ہمارے ملنے کا امکان تو کوئی نہیں تھا

○

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

(لاہور)

دن محبت کے نہ مہکائے یہ قصّہ کیا ہے
چاند اُمید کے گہنائے یہ قصّہ کیا ہے

اشک آنکھوں سے مسلسل ہی رواں رہتے ہیں
اک گھڑی چین نہیں آئے یہ قصّہ کیا ہے

کس نے احساسِ ندامت کو سبوتاژ کیا
جُرم پہ کوئی نہ شرمائے یہ قصّہ کیا ہے

سبز موسم میں بھی کھلتے نہیں اظہار کے پھول
لب کوئی بھی نہ ہلا پائے یہ قصّہ کیا ہے

جس کے سب رنگ محبت کے ہوں رنگوں جیسے
ہم نہ تصویر بنا پائے یہ قصّہ کیا ہے

جھڑنے لگتے ہیں درختوں سے ہرے پات بھی
ڈھلنے لگتے ہیں گھنے سائے یہ قصّہ کیا ہے

عمر بھر جن کی طرف ہاتھ بڑھایا میں نے
وہ مرے ہاتھ نہیں آئے یہ قصّہ کیا ہے

ناچنے گانے لگے جتنے بھی تھے عکس تمام
آئنے ٹوٹ کے مُسکائے یہ قصّہ کیا ہے

ہنستے گاتے ہوئے اس بار مرے شہر کے لوگ
زندگی سے بھی ہیں اُکتائے یہ قصّہ کیا ہے

چاپ قدموں کی سُنے جاتے ہیں ہم بھی لیکن
سانپ، سائے سے لپٹ جائے یہ قصّہ کیا ہے

لوگ کہتے ہیں محبت کا امیں جس کو نبیل
جسم، دیوار میں چُنوائے یہ قصّہ کیا ہے

○

''دیوی''

سلمیٰ صنم
(بنگلور)

مندر میں دیوی درشن کرتے ہوئے دیپا نے دیکھا۔

وہ کوئی سولہ۔۔سترہ سالہ لڑکا تھا۔مدقوق جسم، خارش زدہ، بدبودار، کانپتا،لرزتا، دھواں دھواں چہرہ، منہ میں جھاگ، آنکھوں میں آگ،لڑکے پر اماں کا سایہ ہے۔بڑے پجاری مہاراج نے اس کی ماں سے کہا''اس کو ساڑی پہنا دو گلے میں متھو باندھ دو''۔ہائے اس عورت نے یہ کیا سن لیا تھا۔وہ سناٹے میں آگ۔اس پر زلزلے کی کیفیت طاری ہونے لگی۔اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے پجاری مہاراج کی جانب دیکھا اور پھر غش کھا کر دیوی کے قدموں میں جا گری۔

''اماں شکتی مان ہے۔یہ اس کی لیلا ہے کہ وہ مرد کو عورت بنا دیتی ہے''مہاراج کہہ رہے تھے۔

دیپا پلٹ آئی۔جانے ساگر کہاں تھا۔اس نے ادھر ادھر دیکھا۔ مندر میں بھکتوں اور سیاحوں کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔آگہن کا مہینہ تھا۔سون دتی (بلگام۔کرناٹک) سے تین میل دور ملا پربھا ندی پر جھکے ہوئے سدھا نچل پہاڑ کی چوٹی پر واقع یلما دیوی مندر کا جاترا قریب تھا۔وہ ایک جرنلسٹ تھی اور اپنے ساتھی جرنلسٹ دوست ساگر کے ساتھ یہاں آئی تھی۔

بھیڑ سے خود کو بچاتے ہوئے۔۔دور تک چلتے ہوئے اس نے دیکھا ساگر جوگپاس کے ایک جھرمٹ میں کھڑا ہے۔

شاید ان کا انٹرویو لے رہا ہو۔۔اس نے سوچا کم بخت ہے بھی تو بلا کا ذہین اور مضامین بھی کس قدر خوبصورت لکھتا ہے۔اس کی نثر میں تو غضب کی روانی ہے۔کیا ہوا شکل سے تھوڑا فیمیل لگتا ہے مگر ہے بڑا اسمارٹ' وہ ساگر سے خاصی متاثر تھی۔شاید اس کو چاہتی بھی تھی۔بارہا ساگر سے اپنے جذبات کا اظہار بھی کیا تھا مگر وہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا کہ اس کو خاطر میں ہی نہیں لاتا تھا۔بس وہ تھا اور اس کا قلم۔۔اب ایسی بھی کیا سرد مہری۔

وہ قریب پہنچی تو ساگر اس کی طرف گھوما

''مجھ کو ڈھونڈ رہی تھیں۔۔کیوں؟''

''ہاں''

''ان سے ملو یہ ناگما، شروتی، دیوی، پدما۔۔۔''

وہ ان سب کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔رنگ برنگی ساڑیوں میں ملبوس، ماتھے پر ہلدی، کم کم، گلے میں متھو، ہاتھوں میں ہرے کانچ کی چوڑیاں اور داڑھی مونچھ سے عاری کرخت چہرے۔

''یہ جوگپاس ہیں۔''

دیپا ایک ایک کا چہرہ تکتی رہی۔ساگر کی تحریروں میں تو انہیں دیکھا تھا مگر یوں جیتے جاگتے، دھڑکتے سانس لیتے پہلی بار دیکھ رہی تھی۔

شام دھیرے دھیرے مندر میں اتر رہی تھی اور اس کے دھندلکوں میں کچھ جوگپاس چوڑکی، ستی اور تال بجانے لگے۔کچھ گانے لگے ساتھ ہی نرتیہ کرنے لگے۔وہ اپنی دھن میں مست تھے خوش تھے اور اپنی دیوی کو خوش کرنے کے لئے گا رہے تھے ناچ رہے تھے اور شام کے دھندلکوں میں یوں جھومتے گاتے وہ کسی اور جہاں کی مخلوق نظر آرہے تھے۔

ساگر انہیں یوں دیکھ رہا تھا جیسے ان سے کوئی گہرا لگاؤ ہو۔''یہ سب مجھے میرے اپنے لگتے ہیں'' وہ بولا''یہ شہر یہ مندر یہ لوگ۔۔۔میں یہیں پیدا ہوا اسی مٹی سے۔میں یہاں کبھی کچھ لکھنے کے خیال سے نہیں آیا۔بس یہاں کا ماحول مجھے بار بار اپنی طرف کھینچ لاتا ہے اور یہ جوگپاس جیسے یہ مجھے بلا رہے ہو۔تمہیں آنا ہوگا۔۔۔تم آؤ۔۔۔''

''یہ جوگپاس بھی عجیب مخلوق ہیں۔۔پتہ نہیں کیوں ہیں'' وہ بولی تو ساگر تڑپ کر بولا''کیوں ان کے ہونے میں کیا برائی ہے''

''برا تو نہیں'' دیپا اس کو تڑپتا دیکھ کر حیران ہوئی۔

''مگر پھر بھی۔۔۔''

''ان کے ہونے میں ایک کہانی ہے۔جو پرانوں میں لکھی ہے۔''

اور پھر ساگر جوگپاس کے وجود میں آنے کی وہی کہانی سنانے لگا جو وہ اس کے مضامین میں پڑھ چکی تھی۔وہ کہانی کہتا رہا وہ سنتی رہی۔پھر جب ساز بجنا بند ہو گئے۔گیت رک گیا۔تھرکتے پیر تھم گئے تو ساگر ان کی جانب لوٹ گیا۔اور ان میں یوں گھل مل گیا جیسے وہ ان ہی میں سے ایک ہو۔ان ہی کا کوئی حصہ ہو۔۔دیپا کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

وہ جوگ لے رہے تھے۔شردھالو انہیں اَن (کھانا) استر (کپڑے) اور روپیہ دان کر رہے تھے۔ان کا آشیرواد لے رہے تھے۔۔پن کما رہے تھے۔ سب کا عقیدہ تھا کہ جوگپاس شردھالو اور دیوی کے درمیان ایک کڑی ہیں کیونکہ وہ خود نہیں آتے تھے۔دیوی انہیں بلاتی تھی۔اپنی سیوا کے لئے جگت سیوا کے لئے۔دکھیاروں کے کام آنے کے لئے۔وہ پوتر تھے پاک تھے غریب تھے مگر پھر بھی اپنے آپ میں خوش تھے۔مست و مگن تھے۔وہ بھیک نہیں جوگ لیتے تھے اور سب کو دعائیں دیتے تھے۔

دیپا نے ہر ایک سے ملاقات کی۔ان کی کہانی سنی اپنی رپورٹ میں انہیں شامل بھی کیا۔اس نے ساگر سے پوچھا''یہ جو تقدیس کا ہالہ انہوں نے اپنے گرد بنا رکھا ہے تمہیں کیا لگتا ہے یہ حقیقت ہے یا افسانہ''

''یہ حقیقت ہے دیپا یہ کھرے لوگ ہیں سچے اور پوتر انہوں نے کوئی مکھوٹا نہیں چڑھایا ہے۔کوئی دوسرا چہرہ نہیں لگایا ہے۔اور ادھر ہمیں دیکھو ہم جو مہذب ہیں۔تعلیم یافتہ ہیں اپنی مرضی کی زندگی جی نہیں سکتے۔ہم دوغلے لوگ

ہیں۔اس سماج میں جینے کیلئے مکوٹھے چڑھاتے ہیں۔چہرے پر چہرہ لگاتے ہیں۔''

یہ ساگر نہیں کوئی اور تھا جو اس کے اندر سے بول رہا تھا۔دیپا کو لگا ساگر بدل گیا ہے یہ وہ نہیں ہے جو بظاہر نظر آتا ہے یہ تو کوئی اور ہے۔آج کل وہ خوب پھیل رہا تھا۔اپنے اندر بہت کچھ سمیٹ رہا تھا۔پہلے اس کے اندر اتنا شور نہیں تھا۔اتنے جذبے نہیں تھے۔احساس کا اتنا بوجھ نہیں تھا۔

''میرے والد بہت سخت گیر تھے انہوں نے مجھے وہ بننے نہیں دیا جو میں بننا چاہتا تھا۔میں کبھی خوش نہیں رہا۔کبھی مطمئن نہیں رہا۔مگر اب نہیں دیپا اب ایسا نہیں ہوگا۔''

جیسے وہ کسی اور ہی جہاں میں گم تھا۔

اب کیا ہوگا۔۔۔دیپا نے سوچا۔۔کوئی نئی بات کوئی نئی زندگی۔۔۔کیا ساگر میرا ہو جائے گا۔

بڑی مضحکہ خیز سچوئشین تھی۔ساگر رامو کو ساڑی پہننا سکھلا رہا تھا۔ دیپا کو ہنسی آ گئی۔

''ہنس کیوں رہی ہو۔'' وہ خفا ہو گیا.

''جوگپاس کے بارے میں لکھتے ہوئے یوں لگ رہا ہے تم بھی ایک جوگپا بن گئے ہو۔''

''کیا''؟؟؟ایک پل کو ساگر یوں لرزا کہ دیپا حیران رہ گئی۔

''ارے میں تو مذاق کر رہی تھی۔" اس کی بدلتی کیفیت دیکھ کر دیپا نے تشویش بھری نظروں سے اس کی جانب دیکھا" تم نے اتنی سنجیدگی سے کیوں لے لیا''

مگر وہ فوراہی نارمل ہو گیا۔

رامو کافی خوش نظر آ رہا تھا اس کی تو شکل ہی بدل گئی تھی۔اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ایک مزدور کا بیٹا ہے۔اس سے بڑی تین بہنیں ہیں۔بہت منتوں مرادوں سے وہ پیدا ہوا تھا اور اپنے غریب والدین کا اکلوتا سہارا تھا۔پچھلے سال جانے کیسی بیماری لگی اسے کہ کسی حکیم ڈاکٹر کا علاج کام نہ آیا۔سب نے مشورہ دیا کہ دیوی کے مندر جاؤ۔۔اور بس یہاں آتے ہی اسے شفا مل چکی تھی۔

''اماں کی لیلا ہے'' وہ بولا تو دیپا اس کا چہرہ تکنے لگی۔کہتی بھی کیا؟؟۔یہ تبدیلی تو واقعی حیران کن تھی۔

وہ خراماں خراماں مندر کی جانب یوں آ رہے تھے جیسے کسی اور دنیا کے باسی ہو۔آگہن کے پورے چاند رات کو کڑکڑاتی سردی میں جوگلو باوی کے ٹھنڈے پانی سے نہا کر زرد ساڑیوں میں ملبوس، گلے میں کانوں میں کوڑیاں سجائے، ماتھے پر ہلدی کم کم لگائے ،سروں پر پھول کی لڑیوں سے لپٹی ٹوکریاں اٹھائے وہ خراماں خراماں مندر کی جانب یوں آ رہے تھے جیسے کسی اور دنیا کے باسی ہو۔ان کے ساتھ کچھ لوگ اور بھی تھے شاید ان کے رشتہ دار ہو۔

آج یلما دیوی کا جاترا تھا۔ساگر نے اسے بتایا تھا کہ آج ہی رات نئے نئے جوگپا یا جوگتی بنائے جاتے ہیں۔وہ سیدھے بڑے پجاری مہاراج کے پاس آئیں گے جو انہیں ان کے فرائض سے آگاہ کرے گا۔ان سے یہ حلف لے گا کہ وہ سماج سیوا کریں گے۔اس کے بعد وہ سب جوگ نرتیہ کریں گے۔

وہاں لوگوں کی ایک بھیڑ اکھٹا تھی۔جاترا پر آئے ہوئے شردھالو اور سیّاح یہ نظارا دیکھنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔کچھ منچلے ان جوگپاس پر پھبتی کس رہے تھے۔کچھ سیٹیاں بجا کر ان کا استقبال کر رہے تھے۔کچھ نازیبا فقرے بھی اچھال رہے تھے مگر وہ تھے کہ سب سے بے نیاز ایک جذب کے عالم میں یوں چل رہے تھے جیسے ہفت اقلیم کی دولت انہیں مل گئی ہو۔

بھیڑ سے خود کو بچاتے ہوئے دیپا اپنے موبائل سے ان کا ویڈیو بنا رہی تھی کہ اچانک وہ سامنے آ گیا۔وہ ساگر ہی تھا رامو کے ساتھ مگر اس کا یہ حلیہ۔

''یہ کیا مسخرا پن ہے''وہ چڑ گئی''تم یہاں کیا کر رہے ہو''

''جو تم دیکھ رہی ہو''وہ کافی مطمئن اور خوش نظر آ رہا تھا۔

''مطلب''

''دیپا میں وہ نہیں ہوں جو تم نے مجھے اتنا عرصہ دیکھا ہے۔میں یہی ہوں جو اب تمہیں نظر آ رہا ہوں۔آج میں نے کوئی مکھوٹا نہیں لگایا ہے۔یہ میرا اصلی چہرہ ہے''

دیپا کو لگا جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی ہے اور یلما دیوی چوٹی سے نیچے ملاپر بھاندی میں جاگری ہے۔۔!!!

جھوٹ بولنے کی عادت

ابراہیم جلیس کو جھوٹ بولنے کی بہت عادت تھی،

ایک دن حمید اختر نے جلیس سے پوچھا:

میں نے زندگی میں بڑے بڑے جھوٹے آدمی دیکھے ہیں مگر تم سے بڑا کوئی نہیں ملا تمہاری نظر میں کوئی ہے کیا جو اس میدان میں تم سے آگے ہو؟

ہاں ہے!

جلیس نے جواب دیا،

حمید نے پوچھا کون؟

میرے والد صاحب!

جلیس نے کہا،

میں بی اے میں ایک نمبر سے پاس ہوا یعنی مارجن پر اور والد صاحب نے پورے حیدرآباد میں دعوت کر دی کہ لڑکا یونیورسٹی میں ایک نمبر پہ آیا ہے (یعنی اول آیا ہے)

''مزدور کا دن''

فرخندہ شمیم
(راولپنڈی)

یکم مئی کو سرکاری تعطیل تھی۔ بدرالدین کافی دیر سے جاگے اور پھر دیر تک کروٹیں بھی ڈھیلی کرتے رہے۔ بیگم اور بچے دو دن پہلے ہی ہفتہ اتوار کی چھٹیاں اکھٹی کر کے ڈرائیور کے ساتھ ناران، کاغان چلے گیے تھے، صاحب نے سرکاری گیسٹ ہاوس میں فیملی رومز بک کروادیے تھے اور بچے موسم کی رنگینیوں اور سروں کو چھوتے بادلوں کی نیرنگیوں سے کھیلنے کو بے قرار تھے۔

بدر صاحب نے آنکھیں کھول کر پسندیدہ کافی کی خوشبو کو شامہ کیا جسے ملازم کچھ دیر پہلے طرفی میز پر رکھ گیا تھا، انہیں یاد تھا، آج یوم مئی کو ان کی مصروفیات کا شیڈول خاصا بھاری ہے۔۔۔ سرکاری افسر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ ایک دانش ور بھی تھے، سماجیات کے نہ صرف مشاہدہ کار بلکہ نباض بھی سمجھے جاتے تھے۔۔۔ ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ان کا ارادہ قومی الیکشن لڑنے کا بھی تھا، اسی لیے ہر عوامی موضوع پر بے تحاشا مواد جمع کرتے رہتے تھے، ان عوامی موضوعات میں ایک بڑا موضوع مزدور اور اس کے حقوق کا بھی تھا، جس پر آج ایک سرکاری فورم نے گفتگو کا اہتمام کر رکھا تھا اور بدر صاحب تقریب کی صدارت کرنے والے تھے۔ وہ عام سا لباس پہن کر تیار ہوے اور بنگلے میں پہلے سے کام پر لگے مزدوروں کو چھٹی دے کر مسکراتے ہوئے کہا ''آج مزدوروں کا دن ہے، چھٹی کرو اور عیش کرو''

لیکن انہوں نے یہ نشاندہی نہیں کی کہ وہ پانچ مزدور کس طرح عیش کریں۔۔۔ کیا آج تین اوقات کچھ خاص کھانا انہیں کوئی کھلاے گا، کیا کوئی یوم مئی کی خوشی میں ان کی اجرت سے کچھ زیادہ انہیں دے دے گا، کیا کوئی بااختیار ہستی ان کے ایک پڑھے لکھے نوجوان کو اپنے دفتر میں نوکری دے دے گی؟

مزدور کو ایک دن کی چھٹی سے کیا، اس نے کون سا بچوں کو پارک اور میلے میں لے کر جانا ہے، کون سا بیوی کو چوڑیاں پہنانی ہیں، کون سا کسی ضیافت پر پہنچنا ہے؟

اسے تو اس دن بھی فکر کرنی ہے۔۔۔ فکر فردا کی، فکر دیہاڑی کی۔

بدر صاحب مزدوروں کو چھٹی دے کر فخریہ انداز میں باہر نکلے تو سرکاری گاڑی کا چاق و چوبند اور باوردی ڈرائیور اس طرح چوکس کھڑا تھا جس طرح بارڈر پر کھڑا سپاہی۔، امیر لوگوں کی حفاظت بھی تو خزانوں سے کم نہیں ہوتی۔۔۔ جلدی سے اس نے پچھلی سیٹ کا دروازہ کھولا اور بدرالدین اپنے سادہ اور عام سے کپڑوں میں گاڑی کی سیٹ پر آبیٹھے، ساتھ ہی انہوں نے اپنا برانڈڈ نیا تھری پیس سوٹ بھی پورے اطمینان کے ساتھ دیکھ لیا تھا جو گاڑی کی ایک جانب کھڑکی کے پاس ہینگ تھا۔ بدرالدین نے اسے رات شاندار ہوٹل میں ایک عالی مرتبت شخصیت کی جانب سے دی گئی دعوت میں پہننا تھا۔

یوم مزدور کی تقریب میں مزدوروں کے صرف نمائندے تھے، مزدور خود نہیں تھے۔ اہل دانش روسٹرم پر آتے اور نہایت خوبصورت گفتگو کر کے چلے جاتے۔۔۔ مزدور نمائندوں نے اپنے دیہاڑی داروں کے مسائل پر بات نہیں کی، ان کے فرائض پر زور دیتے رہے۔۔۔ اہل فکر و نظر دینی تعلیمات کی روشنی میں مزدور کے حقوق بتاتے اور تالیوں کی گونج میں واپس نشستوں پر بیٹھ جاتے۔۔۔ بدرالدین کا اسلوب سب سے انوکھا تھا۔۔ وہ تخلیق کار بھی تھے، اپنے لکھے ہوئے ولولہ انگیز اشعار سنا کر کیا سماں باندھ دیا تھا تقریب میں انہوں نے۔۔۔ ان کے پیچھے دیر تک تالیاں بجتی رہی تھیں۔۔۔ تقریب ختم ہوئی تو بدرالدین کو ان کے ڈرائیور کا فون آیا۔

''سر، گاڑی اچانک خراب ہوگئی ہے۔ کوی بڑا ٹیکنیکل مسئلہ لگتا ہے، ورکشاپ لے جانا پڑے گا''

''اوہو'' بدر صاحب کا موڈ سخت خراب ہوا۔

''کتنا وقت لگے گا؟'' ان کے لہجے میں چڑچڑاہٹ تھی۔

''کچھ کہہ نہیں سکتا سر، ورکشاپ جا کر ہی پتہ چلے گا''

ڈرائیور نے سعادت مندی سے بتایا۔

بدر صاحب سخت جز بز ہوئے۔

اب کیا ہوگا۔۔۔ بڑی گاڑی تو بیگم صاحبہ کے ساتھ ناران کاغان گئی ہوی تھی۔۔۔ وہ پریشان ہوگئے۔

''سر، اگر آپ مناسب سمجھیں تو کسی کولیگ سے لفٹ لے لیں'' گھر تک پہنچیں، میں گاڑی ٹھیک کراتے ہی کوٹھی پر پہنچ جاؤں گا۔

ڈرائیور نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''تم جانتے ہو فیروز کہ میں نے کبھی کسی کا احسان نہیں اٹھایا ہے۔۔۔ یہ لوگ بعد میں دفتروں میں بتاتے پھرتے ہیں''

تو سر رائیڈ؟

''رائیڈ پر چلے جائیں'' وفادار ملازم نے ترنت مشورہ دیا۔

''نہیں، نہیں مجھے صرف اپنی کار میں کمفرٹ ہے''

مگر سر، اس میں وقت لگ سکتا ہے، کیا آپ اتنا انتظار کر لیں گے؟

یہی تو مسئلہ ہے، رات کا فنکشن بھی تھوڑی دیر میں شروع ہونے والا ہے، وقت بہت کم ہے۔

''اچھا سر پھر ایک اور حل ہے'' ڈرائیور کو کچھ سوجھا

کیا؟

سر، میٹرو بس سے چلے جائیں۔

باقی صفحہ ۶۲ پر ملاحظہ کیجیے

آن لائن جنازہ

ڈاکٹر مشتاق احمد وانی
(جموں کشمیر)

شبیر ساحل کو جب اُن کے ایک دوست سورج ونشی نے موبائل فون پہ مایوس کن خبر سُنائی کہ آپ کے کالج کے پرنسپل مشہور چند کی حرکتِ قلب بند ہونے کی وجہ سے موت ہوگئی ہے۔دن کے ایک بجے اُن کی لاش کو انتم سنسکار ہاوس میں بجلی سے چلنے والی آگ کی مشین کے حوالے کردیا جائے گا تو وہ حیرت وافسوس کے ساتھ دیر تک زندگی کی بے وفائی اور آخرت کی سچائی کے بارے میں سوچتے رہے۔شبیر ساحل خود کالج میں سائنس کے پروفیسر تھے۔پرنسپل مشہور چند کے ساتھ اُن کی پیشہ ورانہ دوستی ہی نہیں بلکہ وہ اُنھیں اپنے گھر کا ایک فرد خیال کرتے تھے۔آج شبیر ساحل کو پرنسپل مشہور چند کی موت نے حیرت میں ڈال دیا تھا۔اُن کے ساتھ گزرے دن، مہینے سال اُنھیں یکے بعد دیگرے یاد آرہے تھے۔مشہور چند اپنی بہترین پرنسپل شپ اور دیگر سماجی کاموں کی وجہ سے کافی مشہور ومقبول ہوچکے تھے۔وہ ایک خوب صورت وضع دار شخصیت کے مالک اور علم اقتصادیات کے ماہر تھے۔شبیر ساحل فوراً اپنے گھر سے گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے پرنسپل مشہور چند کے گھر پر پہنچ گئے۔وہاں اُن کے خاندان کے افراد اور پڑوسیوں کا ہجوم تھا۔مشہور چند کی لاش کو فرش پر رکھا گیا تھا۔اُن کی اہلیہ، بیٹے اور بیٹیاں سینہ پیٹ پیٹ کر رو رہے تھے۔رشتے دار اور محلے کے لوگ اُن کی ڈھارس بندھا رہے تھے۔دیکھتے دیکھتے پروہت نے اپنے مخصوص انداز میں میت کے قریب آکر منتروں کا اُچارن کیا۔کچھ ہی وقت کے بعد مشہور چند کی لاش کو گھر کے باہر ایک جگہ پہ پانی کی بالٹی میں دُودھ، دھی اور تُلسی کی مٹّی ڈال کر نہلایا گیا۔نہلانے کے بعد لاش کو لال رنگ کے کفن میں لپیٹ کر لکڑی کے تختے پر رکھا گیا۔چار آدمی اپنے سر کے بال منڈوائے، سفید رنگ کی دھوتیاں باندھے آگے آئے، اُنھوں نے سب سے پہلے ارتھی کو کندھا دیا۔ایک آدمی نے یکسُری آواز میں سنکھ بجایا۔اس طرح مشہور چند اپنے گھر اور گھر والوں سے ہمیشہ کے لیے رُخصت ہوگئے۔کوئی ایک گھنٹے کے بعد اُن کی لاش انتم سنسکار ہاؤس پہنچادی گئی۔انتم سنسکار ہاؤس کے منیجر نے دو ہزار روپے کی رسید کاٹی اور لاش اپنے کرمچاریوں کے حوالے کی۔اُنھوں نے لکڑی کے تختے سے لاش کو اُٹھا کر لوہے کی صندوق نُما ٹرالی میں رکھ دیا۔اُنھوں نے مشہور چند کے بیٹوں اور رشتے داروں کو آخری بار اُن کا چہرہ دیکھنے کو کہا۔بیٹے اُن کا چہرہ دیکھتے ہوئے ایک بار پھر زور سے رودیے۔میت کے ساتھ آئے تمام لوگوں نے اپنے اپنے ہاتھ میت کے سامنے جوڑے، اُس کے بعد لاش جلانے والوں نے مشہور چند کی لاش کو الیکٹرک مشین کے حوالے کردیا اور لواحقین کو دو گھنٹے کے بعد اُن کی ہڈیوں کی راکھ لے جانے کو کہا۔لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔شبیر ساحل یہ سب کچھ پہلی بار دیکھ رہے تھے۔اُنھیں تیس سال پہلے کا وہ زمانہ یاد آیا جب وہ دیہات میں رہا کرتے تھے۔اُس زمانے میں جب کسی ہندو بھائی کی وفات ہوتی تھی تو گاؤں کے لوگ بلا لحاظ مذہب وملّت مرنے والے کی خبر سُن کر آنسو بہاتے تھے۔میت کو باری باری کندھا دیتے تھے۔گھر سے کندھے پر لکڑی اُٹھا کر دریا کے کنارے شمشان گھاٹ پر جاتے تھے۔چِتا بنائی جاتی تھی۔سب کی آنکھوں کے سامنے چِتا کو آگ لگائی جاتی تھی۔دیکھتے دیکھتے آگ کے شعلے آسمان کی طرف اُٹھنے لگتے تھے۔جب پوری طرح چِتا جلنے لگتی تھی تو اُس کے بعد شمشان گھاٹ پہ آئے لوگ بہت چھوٹی چھوٹی لکڑیاں مُٹھی کی صورت میں چِتا پر پھینکتے تھے، اسے ''دھرم لکڑی'' کہتے تھے۔مرنے والے کے گھر کے دو تین افراد تب تک چِتا کے پاس رہتے جب تک مرنے والے کا وجود راکھ کا ڈھیر نہ بن جاتا۔شبیر ساحل کے دل ودماغ میں ایک طرف یادوں کا ہجوم سوار ہورہا تھا اور دوسری طرف احساس، مایوسی اور حیرت نے یہ سوچنے پر مجبور کردیا تھا کہ سائنسی اور تکنیکی ترقی نے آج کے انسان کو جہاں کئی طرح کی سہولتیں فراہم کردی ہیں تو وہیں ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک ہونے کا جذبہ ختم کردیا ہے۔اب انسان نہ صرف جیتے جی مشینوں کے ساتھ رہتا ہے بلکہ مرنے کے بعد بھی اُس کا وجود مشینوں کے حوالے کردیا جاتا ہے! پرنسپل مشہور چند کے انتم سنسکار میں بہت زیادہ لوگ نہیں تھے۔شبیر ساحل یہی باتیں سوچتے ہوئے اپنے گھر پہنچے۔تب اُنھیں یہ شعر یاد آگیا:

سارے جھگڑے ہی زندگی تک ہیں
کون مرتا ہے پھر کسی کے لیے

قریب ایک ہفتے کے بعد شبیر ساحل کو ایک اور مایوس کن خبر اپنے ایک دوست اشتیاق احسن نے موبائل فون پہ سُنائی۔اُس نے کہا

''یار۔۔۔شبیر!۔۔۔ایک بڑے دُکھ کی بات یہ ہے کہ آج میرے، آپ کے اور بہت سے لوگوں کے مُحسن وخیر خواہ عدالت علی خان صاحب اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں! اُن کی نماز جنازہ جمعہ کے بعد چار بجے صدا بصحرا قبرستان میں رکھی گئی ہے۔یہ ہم سب کے لیے بڑے دُکھ کی بات ہے لیکن میں کچھ گھریلو مسائل کی وجہ سے اُن کے جنازے میں شریک نہیں ہوسکوں گا۔آپ سے گزارش ہے کہ آپ ''محفل یاراں'' واٹس ایپ گروپ پہ عدالت علی خاں صاحب کے انتقال کی خبر بھی ڈالیں اور ایک لینک تیار کریں تاکہ میں آن لائن جنازے میں شرکت کرسکوں''

شبیر ساحل نے اشتیاق سے کہا

''یار۔۔۔! یہ تو مجھے پتا ہے کہ وہ چند مہینوں سے بیمار تھے لیکن اُن کی موت کی خبر سُن کر میں مایوس ہوگیا۔کیا آپ اُن کے جنازے میں نہیں آئیں گے؟ یار اشتیاق! عدالت علی خان صاحب کے ہم سب پر بڑے احسانات ہیں۔

میرامشورہ ہے آپ جنازے میں ضرور شرکت کریں''

''یار!۔۔۔اُن کے جنازے میں شریک نہیں ہوسکوں گا کچھ گھریلو مسائل ہیں۔اسی لیے کہہ رہا ہوں کہ میں آن لائن جنازے میں شریک ہوں گا''

شبیر ساحل نے فوری طور پر آن لائن جنازے کا لینک تیار کیا۔ عدالت علی خان کے انتقال کی خبر اور لینک ''محفل یاراں'' واٹس ایپ گروپ پہ ڈال دیا۔کچھ ہی دیر میں پچاسوں دوستوں نے بڑے دُکھ کے ساتھ اپنے اپنے تعزیتی کلمات کا اظہار کیا اور آن لائن جنازے میں شریک ہونے کی رضامندی ظاہر کی۔

عدالت علی خان ایک بہت بڑی دانش گاہ میں علم سیاسیات کے قابل،مشہور اور بڑے اثر ورسوخ والے پروفیسر تھے۔اُن کے دَور میں کئی تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں کو دانش گاہ کے مختلف شعبہ جات میں ملازمت ملی۔نہ صرف اپنی دانش گاہ میں بلکہ دوسری دانش گاہوں کے تدریسی اور انتظامیہ عملے کے ساتھ بھی اُن کے بڑے اچھے تعلقات تھے۔اتنا ہی نہیں بلکہ بڑے بڑے سرکاری آفیسران کے ساتھ اُن کی دوستی تھی۔وہ جس کسی کو بھی کوئی کام بتاتے تھے وہ ہر حال میں اُن کا کام کرتا تھا،لیکن آج اُن کی موت کی خبر اُن کے احسان مندوں کے لیے ایک عام سی بات تھی۔

شبیر ساحل اپنے گھر سے عدالت علی خان کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے نکل پڑے۔اُنھوں نے اپنے موبائل فون کا بیٹری بیک اپ اور موبائل سٹینڈ ساتھ اُٹھایا۔کوئی ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہ اپنی گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے صدا بصحرا جنازہ گاہ میں پہنچے۔اُنھوں نے گاڑی سڑک کے کنارے کھڑی کردی۔جنازہ گاہ میں عدالت علی خان کا جسد خاکی ایک تابوت میں رکھا گیا تھا۔اُن کے لواحقین اور کچھ ہی لوگ وہاں موجود تھے۔چار بجنے میں ابھی آدھا گھنٹہ باقی تھا۔شبیر ساحل نے سامنے چبوترے پر موبائل فون سٹینڈ پر اپنا موبائل فون فِٹ کردیا۔جب دن کے چار بج گئے تو امام صاحب نماز جنازہ پڑھانے کے لیے آگے بڑھے اور چند لوگوں پر مشتمل نماز جنازہ کی امامت بلند آواز میں فرمانے لگے۔

''نیت کرتا ہوں نماز جنازہ فرض کفایہ،چار تکبیروں کے ساتھ،ثنا واسطے اللہ کے،درود واسطے محمدؐ کے اور دُعا واسطے حاضر میت کے،پیچھے اس امام کے،رُخ میرا کعبہ شریف کی طرف اللہ اکبر''

امام صاحب نمازِ جنازہ پڑھانے لگے۔جنازے میں مشکل سے تیس آدمی ہوں گے۔پہلی تکبیر کے بعد جب مولانا نے دوسری تکبیر کہی تو اسی دوران کسی مقتدی کے موبائل فون پہ یہ رِنگ ٹیون بجنے لگی:

اِدھر زندگی کا جنازہ اُٹھے گا
اُدھر زندگی اُن کی دلہن بنے گی

☆

Tips

1. The STOMACH is
injured when you do not have breakfast in the morning.

2. The KIDNEYS are
injured when you do not even drink 10 glasses of water in 24 hours.

3. GALLBLADDR is
injured when you do not even sleep until 11 o'clock and do not wake up to the sunrise.

4. The SMALL INTESTINE is
injured when you eat cold and stale food.

5. The LARGE INTESTINES are
injured when you eat more fried and spicy food.

6. The LUNGS are
injured when you breathe in smoke and stay in polluted environment of cigarettes.

7. The LIVER is
injured when you eat heavy fried food, junk, and fast food.

8. The HEART is
injured when you eat your meal with more salt and cholesterol.

9. The PANCREAS is
injured when you eat sweet things because they are tasty and freely available.

10. The Eyes are
injured when you work in the light of mobile phone and computer screen in the dark.

11. The Brain is
injured when you start thinking negative thoughts.

12. The SOUL gets
injured when you don't have family and friends to care and share with you in life their love, affection, happiness, sorrow and joy.

بغاوت سے پچھتاوے تک

افشاں بلوچ
(کراچی)

''یار کم از کم اتنا تو سوچو کہ اگر کنول نے موبائل دیکھ لیا تو تمہارے گھر قیامت آجائے گی اور میں تمہیں پریشان نہیں دیکھ سکتی''

سیما نے عاشر کا ہاتھ دباتے ہوئے بڑی اضطراری سے کہا۔

''کوئی نہیں دیکھے گا! فون کو پاس ورڈ لگا ہوا ہے۔ تم کیوں ڈر رہی ہو کچھ ویڈیوز ہی تو ہیں'' عاشر نے نرم لہجے میں سیما کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

شام کا وقت تھا۔ دونوں ایک ریستوران میں بیٹھے کافی پی رہے تھے۔ شہر کے خوبصورت علاقے میں واقع یہ ریستوران اٹالین طرز پر سجایا گیا تھا۔ یہ جگہ اتنی جاذب نظر تھی کہ اٹلی سے آیا ہوا اٹالین بھی احساس کمتری کا شکار ہو سکتا تھا۔

عاشر ایک پڑھا لکھا نوجوان تھا جس نے حسن بھی پایا تھا اور طبیعت کی کشش بھی اسے عطا ہوئی تھی۔ عاشر کا نکاح کنول کے ساتھ دو سال پہلے ہوا تھا۔ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی گھریلو اختلافات کی بنیاد پر عاشر نے والدین کا ساتھ چھوڑ کر الگ جگہ مکان لیا اور رہنے لگا۔ اس کے دن اچھے گزرنے لگے۔ کمپنی سے ملنے والی تنخواہ بھی معقول تھی اور زندگی سے کچھ خاص شکایت بھی نہیں تھی جو کہ آج کل کے نوجوانوں میں اکثر پائی جاتی ہے۔ والدین کے ساتھ باہمی اختلافات میں بھی کنول نے بڑی دیدہ دلیری سے عاشر کا ساتھ نبھایا تھا اور اب تک عاشر ہی کنول کی زندگی کا وہ مرکز تھا جس کے اردگرد کنول کا مدار تھا۔

چھ ماہ پہلے عاشر کی کمپنی میں سیما کی ملازمت ہوئی اور اتفاقاً دونوں کا ڈیپارٹمنٹ بھی ایک تھا۔ سیما تیکھے نقوش والی وہ لڑکی تھی جس میں اکیسویں صدی کی جدت اپنے تمام حسن اور ولولے سے موجزن تھی۔ رفتہ رفتہ سیما اور عاشر کی دوستی ہوئی۔ سیما کو عاشر کا شادی شدہ ہونا کبھی رکاوٹ نہیں لگا اور متعدد بار اس نے عاشر کو شادی کے لیے کہا۔ مگر عاشر ہر بار زبانی کلامی عہد و پیمان تک جاتا، مجبوریوں کا ذکر کرتا اور شادی کی پیشکش کو ٹال دیا کرتا۔ دراصل وہ کنول کی تکلیف کا سوچ کر ڈر جاتا مگر اس کے دل میں سیما کے لیے جو الفت موجود تھی اسے سیما کے اور قریب کرتی گئی۔ رفتہ رفتہ عاشر کے لیے دلچسپی کا مرکز کنول سے ہٹ کر سیما کی ذات میں منتقل ہو گیا۔ کنول بھی پچھلے کچھ عرصے سے عاشر میں پیدا ہونے والی اجنبی سی بے اعتنائی محسوس کر رہی تھی۔ عاشر دیر سے گھر آتا اور زیادہ وقت فون میں مصروف رہتا۔ کنول نے کئی بار عاشر سے گلہ بھی کیا مگر وہ دفتری مصروفیات کا ذکر کر کے بات ٹال دیا کرتا تھا۔ کنول نے کئی مرتبہ عاشر کا فون بھی دیکھنے کی کوشش کی مگر پاس ورڈ توڑنے کا فن نہیں تھا۔ مزید یہ کہ عاشر ہر دوسرے روز پاس ورڈ بدل دیا کرتا تھا۔

جلد ہی عاشر اور سیما کی دوستی ناجائز جنسی تعلقات تک پہنچ گئی۔ عاشر کو موقع کی تلاش رہتی اور وہ موقع پاتے ہی سیما کے گھر پہنچ جاتا۔ جب کنول قربت سے محروم ہوئی تو اس کے دل میں مشکوک ناگ ڈسنے لگے اور اس کی راتوں کی نیند حرام ہو گئی۔ کئی مرتبہ کنول اور عاشر کا جھگڑا یہاں تک پہنچا کہ عاشر نے بڑی بے دردی سے کنول کو مارا۔ کنول نے رو رو کر گو خود کو نڈھال کر لیا مگر عاشر میں تبدیلی واقع نہ ہوئی۔

ایک دن خلاف معمول عاشر جلدی گھر آیا اور اپنی کتابیں چھاننے لگا۔ اتفاقاً کنول پہلو میں کھڑی ہوئی تھی کہ عاشر نے فون کھولا اور عین اسی وقت پاس ورڈ کنول کے ذہن میں تصویر بن گیا۔ کنول نے سوچ لیا کہ جو بھی ہے عاشر کے فون میں ہے۔ وہ موقع کا انتظار کرنے لگی۔

عاشر کچھ کاغذات اٹھا کر باہر نکل گیا۔ اس دن وہ واقعتاً دفتری دباؤ کی وجہ سے اتنا چڑچڑا ہو چکا تھا کہ اسے اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ کنول نے پاس ورڈ دیکھ لیا ہے۔ شام کو ریستوران میں مغرب کے بعد تک سیما کے ساتھ بیٹھ کر عاشر جب گھر آیا تو تھوڑی دیر ٹی وی دیکھنے کے بعد سو گیا۔ کنول اسی موقع کی تلاش میں تھی!

عاشر کا فون بیڈ کے ساتھ موجود سائیڈ ٹیبل پر رکھا تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا۔ کنول نے دبے پاؤں فون اٹھایا اور کمرے سے نکل گئی۔ تجسس اور غم کی وجہ سے اس کی آنکھیں ذرا اور کھل گئیں وہ آج یہ معمہ حل کرنے کا تہیہ کر چکی تھی۔

پاس ورڈ کے تصور کو اچھے سے یاد کرتے ہوئے اس نے سکرین پر نظر آنے والے ہندسے دبانا شروع کیے تو موبائل فون کھل گیا۔ کنول کا تجسس اور بھی بڑھ گیا۔ اس نے جلدی سے گیلری کھولی تو آگے عاشر اور سیما کی انتہائی قابل اعتراض تصاویر نے اس کی دنیا ہی بدل ڈالی! اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہونا شروع ہوئے اور فون ہاتھوں سے پھسل کر قالین پر گر پڑا۔ اب کنول زار و قطار رو رہی تھی۔ سسکیوں کی آواز بھی اس قدر بلند نہ تھی کہ عاشر سن سکتا وہ بدستور سویا رہا۔ روتے روتے جب کنول کے حلق میں سوئیاں چبھنے لگیں تو اس نے موبائل اٹھایا، بے دلی سے کمرے میں روشنی کی۔ جب کنول کی نظر عاشر کے چہرے پر پڑی تو وہ اتنے زور سے چیخی کہ عاشر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''یہ کیا ہے! کیا ہے یہ'' کنول نے چیختے ہوئے کہا۔

جب عاشر کی آنکھوں کے سامنے سے منظر صاف ہوا تو اس کا ذہن رک گیا۔ اس نے کنول کو کندھوں سے پکڑنے کی کوشش کی مگر کنول دور ہٹ گئی۔

عاشر نے نرم لفظوں میں معافی مانگنا شروع کر دی مگر کنول کے لفظ آنسو بن چکے تھے!

جب عاشر سے کچھ نہ بن پڑا تو اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور گھر سے باہر نکل گیا۔ کنول بدستور روتی رہی۔ رات گہری ہو چکی تھی اور کنول سوچ رہی تھی کہ وہ کسے بتائے۔ وہ عاشر کے گھر والوں کو بتا نہیں سکتی تھی اور اس کے اپنے گھر

والے سینکڑوں کلومیٹر دور تھے۔ کنول کے لیے رات صدی کے برابر ہوگئی۔ جب فجر کی اذانیں شروع ہوئیں تو اسے مہینوں بعد خدا یاد آیا!

سورج طلوع ہونے کے بعد عاشر گھر لوٹا اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ کنول کی نگاہ جیسے ہی عاشر پر پڑی وہ حواس باختگی کے عالم میں عاشر پر حملے کے لیے دوڑی مگر عاشر نے اسے غصے سے ایک طرف دھکیلا، کپڑے تبدیل کیے اور دفتر چلا گیا۔ اس کو اپنے گناہ کا احساس ہو رہا تھا اور وہ کنول کی حالت کی وجہ سے بھی پریشان تھا۔ دفتر میں اس کی نگاہیں سیما کی نگاہوں سے ملیں مگر آج سیما کو ایک نظر دیکھنا بھی عاشر کے لیے دقت طلب کام تھا۔ سیما نے اس بوجھل پن کی وجہ پوچھی مگر عاشر خاموش رہا۔

سوجی ہوئی آنکھوں اور بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ کنول رات گئے عاشر کا انتظار کرتی رہی مگر وہ نہ آیا۔ غم کی اس حالت میں ڈوبی ہوئی یہ عورت اس قدر خوبصورت لگ رہی تھی کہ اس وقت کئی عاشر اس کی ان بکھری ہوئی زلفوں کے اسیر ہو سکتے تھے مگر وقت کی بڑی خوبصورتی یہ بھی ہے کہ وہ غم کو کئی شکلوں میں بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔ آہستہ آہستہ جب انتظار کی نظر منجمد ہوگئی تو کنول کا غم غصے میں بدلنے لگا۔ وہ سوچنے لگی کہ اسے پولیس کو بتا دینا چاہیے مگر یہاں بدنامی کا ڈر تھا۔ عورت مرد کو بدنام نہیں کرتی!

اس نے اپنی ماں سے رابطہ کیا۔ ماں نے کچھ دیر تسلیاں دیں اور کچھ دن بعد آنے کا وعدہ کیا۔ یہی دن کنول کے لیے کاٹنا مشکل تھے۔ وہ کبھی سوچتی کہ سامنے پڑی ہوئی گولیاں چبانا شروع کر دے کبھی سوچتی اپنی رگ کاٹ لے مگر اتنی ہمت اسے عطا نہیں ہوئی تھی۔ عورت کی فطری نزاکتیں خود کو ختم کرنے کے شدید خلاف تھیں۔ حسن غم کی لہر کے باوجود بھی خود کو زندہ رکھنے کے حق میں تھا!

رات رینگ رینگ کر آدھی ہو چکی تھی جب عاشر کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا بوجھل پن احساس گناہ کے ساتھ نمایاں تھا۔ وہ آ کر کنول کے قریب بیٹھ گیا اور کچھ بولنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ کنول اس پر جھپٹ پڑی۔ عاشر کو دور ہٹنا پڑا۔

''مجھے معاف کر دو!'' عاشر نے التجا کرتے ہوئے کہا۔۔۔

''اپنی اوقات دیکھو معافی کے قابل بھی نہیں!'' کنول چیختے ہوئے دوبارہ جھپٹ پڑی۔ غصہ اس کے حلق سے باہر آنے کو تھا۔

کچھ دیر تک تو عاشر کنول کو بات کرنے پر راضی کرنے کی کوشش کرتا رہا مگر جب کچھ نہ بن پڑا تو دوبارہ گھر سے باہر نکل گیا۔ کنول بھی رونے لگی۔ اسے رونے میں دقت محسوس ہو رہی تھی اور اپنی شادی کا دن بہت برا لگ رہا تھا۔ وہ خود کو کائنات کی بدقسمت ترین عورت محسوس کر رہی تھی۔ یہ گھاؤ بہت گہرا تھا۔

تھوڑی دیر بعد کنول نے فون پر آصف کا نمبر ملایا۔

''عاشر! بھابھی کی کال آ رہی ہے یار'' آصف نے کہا۔

''سن لے یار! پلیز میرا نہیں بتانا کہ میں یہاں ہوں'' عاشر نے افسردگی سے کہا۔

کنول نے کال کے دوران آصف کو عاشر کی غیر موجودگی کا بتایا اور اگلے دن گھر آنے کے لیے کہا۔

آصف عاشر کا بہت پرانا دوست تھا اور اس کے اہل وعیال سے واقف تھا۔ کنول بھی کبھی کبھار آصف سے رابطہ کر لیتی تھی جب عاشر کو گھر آنے میں دیر ہو جایا کرتی۔ آصف کا عاشر کے گھر آنا بھی معمول کی بات تھی۔ ان دونوں کے درمیان اعتبار کی ایک مضبوط بنیاد موجود تھی۔

اگلے روز عاشر تو آصف کے مکان سے ہی کمپنی چلا گیا اور آصف تھوڑا دن جوان ہونے پر کنول سے ملنے کے لیے آ گیا۔

کنول نے جب آصف کو عاشر کی غیر موجودگی کا بتایا تو آصف سب جانتے ہوئے بھی انجان بن گیا اور کنول بھی شدت کرب سے یہ اندازہ نہ لگا سکی کہ عاشر کے پاس جانے کے لیے سوائے آصف کے گھر کے اور کوئی جگہ نہیں۔ کنول نے آصف کو سب کچھ بتانا شروع کر دیا۔ اس کی آنکھوں کے سرخ ڈورے آنسوؤں سے شفاف ہونے لگے اور آواز ٹوٹنے کے قریب ہونے لگی۔ آصف کے لیے یہ منظر پر تجسس بھی تھا اور قابل ترس بھی وہ پہلی دفعہ کنول کو اس اذیت میں دیکھ رہا تھا۔ بولتے بولتے کنول کا لہجہ بکھر گیا اور وہ زار و قطار رونے لگی۔ آصف نے تسلیاں دیں مگر بے سود اور آخر کار یہ رونا سسکی بن گیا۔ شدت جذبات میں آصف نے کنول کے سر پر ہاتھ رکھ کر عاشر کو سبق سکھانے کا وعدہ کیا اور تھوڑی دیر بعد گھر سے باہر چلا گیا۔

آصف کے جانے کے بعد کنول ایک مرتبہ پھر تنہائی اور اداسی کے گرداب میں ڈوبنے لگی۔ اس کے اندر بغاوت پیدا ہو رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ عاشر کے گناہ اس کے زخم کیوں بن گئے ہیں؟ اس لمحے میں محبت کا وہ تسلسل جو دو انسانوں میں برقرار رہتا ہے کنول کے لیے بے معنی ہو چکا تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ سے بالاتر تھی کہ وہ عاشر سے محبت کی بنیاد پر یہ سب محسوس کر رہی ہے۔ کنول کو رہ رہ کر احساس ہو رہا تھا کہ اگر عاشر کی جگہ اس نے یہ گناہ کیا ہوتا تو وہ اب تک پچھتاوے سے مر چکی ہوتی۔ مرد بہت بے رحم ہے! وہ گناہ بھی کرتا ہے اور زندہ بھی رہتا ہے! یہ نسوانی نزاکت بھی قید ہے۔ عورت ظالم بھی نہیں اور غیر محفوظ بھی ہے! کنول سوچ رہی تھی کہ عاشر کا تزکیہ آوارگی ہے، میں کہاں جاؤں؟ اس گھر کے برتن توڑوں؟ جس گھر کو میں نے اتنے ارمانوں سے سجایا تھا۔ جلد ہی یہ بات کنول کے دل میں گھر کر گئی کہ اگر عاشر آزاد ہے تو میں بھی آزاد ہوں! میں بھی اپنے جذبات کو اپنے دل کی مرضی پر موڑ دوں گی اور اس کا دل اس لمحے شدید بغاوت میں غرق ہو چکا تھا۔

اس کے اندر ایک آواز آزادی اور بغاوت کی شدید لہر کے باوجود بھی اسے اپنی طرف متوجہ کر رہی تھی مگر یہ آواز اس قدر موہوم تھی کہ کنول کا ذہن ادراک نہ کر سکا۔

آصف کنول کے پاس سے اٹھ کر آنے کے بعد ادھر ادھر پھرتا رہا۔ سارا دن اسے کنول کا چہرہ یاد آتا رہا۔ اسے کنول کی آنکھوں میں محرومی کی وہ

سرخیاں ملی تھیں کہ جنہوں نے آصف کی سوچوں کا رخ اپنی طرف موڑ لیا تھا۔ اسے کنول پر ترس آرہا تھا اور اس ترس میں ہلکی سی لرزش انسیت کی شامل ہو رہی تھی۔

اس کے برعکس عاشر کا معمول بھی معمول نہیں رہا تھا وہ غیر معقول حد تک لاپرواہ ہو چکا تھا۔ وہ رات گئے گھر آتا اور اگر کچھ معاملہ سلجھانے کی کوشش کرتا تو کنول اس کا چہرہ نوچنے کے درپے ہو جاتی۔ وہ دن کو دفتر رہنے لگا اور رات کا اکثر حصہ آصف کے مکان پر گزارنے لگا۔ دن یونہی گزرتے گئے اور آصف کا کنول کے پاس آنا جانا بڑھتا گیا۔ آصف سب احوال عاشر کو بتایا کرتا اور عاشر سے مشورے لیا کرتا جبکہ عاشر کا کہنا تھا کہ کنول کو جلد از جلد نارمل کیا جائے۔ آصف کنول کے پاس آتا اس سے باتیں کرتا اور اسے ہنسایا کرتا۔ جس سے کنول کی حالت تو بہتر ہو جاتی مگر اس میں موجود بغاوت مزید شدت پکڑ لیتی۔ دھیرے دھیرے آصف کا آنا کنول کے لیے ایک معمولی بات بن گیا مگر عاشر کا وجود دیکھنے کو بھی کنول کا دل رضامند نہ ہوتا اور جیسے ہی اس کی نظر عاشر پر پڑتی وہ غصے سے بے قابو ہو جایا کرتی اور مجبوراً عاشر کو گھر سے باہر جانا پڑتا تھا۔

کنول کے لیے اپنے خاوند کو برداشت کرنا بہت مشکل ہو گیا اور اس کا دل آصف کی باتوں میں لگنے لگا۔ آصف بھی ہر سوچ کے پردے پر کنول کو خوش کرنے کے کردار تخلیق کرتا رہتا۔ یوں زندگی نے کچھ اور دن پلکوں سے ڈھلکا دیے۔

ایک دن حسب معمول کنول صبح کے وقت سوچ میں گم تھی جب اسے یوں محسوس ہوا جیسے گھر کی دیواریں اسے سننے کے لیے بیتاب ہیں۔ جیسے یہ پتھر جواب دیں گے! فوراً دیواروں کی جانب دیکھتے ہوئے کنول نے کہا۔۔۔

''عاشر تو تمہارے قابل بھی نہیں میں تو پھر کنول ہوں، جیتا جاگتا انسان ایک عورت!''

''مگر اب تو میں ٹھیک ہوں! ہاں، بالکل بہتر ہوں۔ عاشر جائے جو کرنا ہے اسے وہ کرے۔ عاشر کو اس گھر میں کبھی میں برداشت نہیں کروں گی۔ اسے مجھ کو طلاق دینا ہوگی لازمی دینے ہوگی اور طلاق کی شرائط پوری کرتے کرتے اس کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ مجھے ملک کا قانون انصاف لے کر دے گا!''

تھوڑی دیر بعد ہی آصف آ گیا اور کنول کو سوچ میں گم دیکھ کر استفسار کیا۔

''کیا ہوا؟ کس سوچ میں گم ہیں''

''میں نے عاشر سے طلاق لینے کا فیصلہ کر لیا ہے!''

کنول کی بغاوت جس حد تک پہنچ چکی تھی وہ جائز تھی بلکہ یہ بغاوت بھی نہیں تھی یہ اس کا حق تھا۔

آصف یہ بات سن کر ششدر رہ گیا مگر اس نے کنول کے فیصلے کی تائید کی۔ اس سے کنول کے اندر کی بغاوت اور شدید ہو گئی۔ رات کو عاشر جب گھر لوٹا تو کنول کا فیصلہ سن کر دم بخود رہ گیا۔ کافی دیر بحث و مباحثہ کے بعد بالآخر عاشر دوسرے کمرے میں جا کر سو گیا مگر نیند کی اسے بھیک نہ ملی۔ وہ مسلسل ازالے کا سوچتا رہا۔ سیما سے تعلق اس کا گناہ تھا مگر کنول کے لیے اس کے دل میں چاہت تھی جس کی قدر و قیمت کو آصف بخوبی جانتا تھا۔ کچھ دن تک طلاق ہی گھر میں ہونے والی بحث کا موضوع رہا۔

کنول کے لیے دل کا غبار نکالنے کا واحد راستہ آصف تھا۔ باقی سارا وقت عاشر کے خلاف بغاوت اس کے وجود میں دہکتی رہتی۔ اس کا یہ روپ بغاوت تھی کہ ناراضگی مگر طلاق کے تقاضے کی حد تک جائز تھی۔ اس دلیل نے کنول کے دل کو عاشر کے لیے مزید تنگ کر دیا تھا۔ کبھی کبھی اس کا دل یہ بھی کہتا تھا کہ عاشر کو معاف کر دیا جائے مگر فوراً وہ تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم جایا کرتی تھیں۔

زندگی کے قافلے میں لمحے ماتم خوانی کرتے ہیں اور انسان یہ نہیں سمجھ پاتا کہ یہ کس سانحے کی آہ و زاری ہے۔ ماضی کی دیوار سے لہو پگھلنے لگا ہے یا مستقبل کے کسی خوف کو کوئی شکل مل گئی ہے۔ یونہی گزرتے دنوں میں آصف اور کنول کے درمیان کا تکلف اٹھ سا گیا اور انس بھری قربت نے ڈیرے ڈال دیے۔ عاشر ان حالات کو بالکل نہ سمجھ پایا۔ اسے آصف بھی مایوس محسوس ہوتا اور کنول بھی زبان کو انگارہ کیے ہوئے دکھائی دیتی۔

آصف اور کنول کی یہ قربت اتنی بڑھی کہ کنول کو حمل ہو گیا! اور جیسے ہی کنول کو اس بات کا اندازہ ہوا وقت اس کے لیے الٹی سمت گھومنے لگا۔ اب اسے اپنے باغی روپ سے نفرت ہونے لگی خود سے وحشت ہونے لگی اور گزرتے لمحوں میں کسی کسی لمحے میں عاشر معصوم نظر آنے لگا کیونکہ اس کے خیال میں تو مرد ہی فطرتاً خطا کار تھا مگر اس سے یہ سب کیسے ہو گیا؟ یہ سوال اژدہا بن گیا، بغاوت کردار کا داغ بن گئی اور اس احساس سے جان لیوا چیز کوئی اور نہ تھی۔

یہ خبر سن کر آصف تو جیسے زمین میں دھنس گیا۔ اسے شدید احساس ہوا کہ کاش وہ کنول کو جانتا ہی نہ ہوتا۔ کاش وہ عاشر کا دوست ہی نہ ہوتا! اس نے کنول سے کہا۔

''بچہ ضائع کروا دو ضائع کروا دو پلیز!'' اس کے لہجے میں منت تھی بے بسی تھی۔

''میں کوئی اتنی نیک نہیں مگر بچہ ضائع کروانے کا سوچ کر مجھے ایک آواز ضرور آتی ہے وہ یہ کہ زنا جتنا بڑا جرم ہو قتل سے کم ہے۔ تم اس بچے کے باپ ہو!'' کنول نے ایسے فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ آصف کی ساری امیدیں دم توڑ گئیں۔

آصف اسی شام شہر سے ہجرت کر گیا اس نے فون بند کر دیا۔ وہ دونوں عاشر اور کنول سے شدید خوفزدہ ہو چکا تھا۔

کنول بھی فرار ڈھونڈنے کے لیے کچھ دن کے لیے والدین کے گھر چلی گئی۔ شدید پچھتاوے کی پیدائش سے طلاق کا تقاضا اسے گزرے ہوئے وقت کا کوئی لطیفہ لگتا۔ عاشر کی زندگی میں بھی کچھ ٹھہراؤ آ گیا مگر وہ اس طرح آصف کے جانے پر ضرور حیران تھا۔

زندگی کی نمو کب تک چھپائی جاسکتی ہے۔ زندگی باطن سے خروج کرتی ہے اور ظاہر میں وارد ہوتی ہے اور یوں ہوتی ہے کہ باقی ہر شے کو شکست فاش دے دیتی ہے۔ زندگی نے بول کر اپنے ثبوت دیے ہیں کنول بھی کب تک اس بات کو چھپا سکتی تھی۔ کنول جب اپنے والدین کے گھر سے واپس آئی تو اس نے عاشر کو حمل کے بارے میں بتادیا مگر خوف کی وجہ سے یہ صاف چھپالیا کہ یہ حمل کس سے ہوا ہے!

عاشر کو یہ خبر سن کر ہی ایسا محسوس ہونے لگا جیسے کائنات کی ہر شے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی ہو۔ جیسے اس کے گناہ کا ازالہ اتنی جلدی ہو گیا ہو کہ احساس گناہ کے پرورش پانے سے پہلے خوشی نصیب ہو جائے۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبائیں اور اس نے فرط جذبات میں بڑھ کر کنول کو سینے سے لگالیا۔

’’شکر ہے شکر ہے اب تو طلاق بھی نہیں ہوسکتی! قدرت نے مجھے موقع دیا ہے۔ اتنے وقت میں کنول تمہارا دل بھی بدل جائے گا بس معاف کر دو مجھے۔ مجھے بہت احساس ہو چکا ہے تم فکر مٹا ڈالو ہر قسم کی کہیں بچے پر کوئی اثر نہ پڑ جائے‘‘ عاشر کے لہجے میں خوشی نے بہار پیدا کر دی تھی۔ مگر اس کا ایک ایک لفظ کنول کے لیے شدید پچھتاوے کا اشارہ تھا۔ کنول یہ الفاظ سن کر اندر سے ختم ہو رہی تھی اسے اپنی زندگی سے اتنی نفرت کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔

کنول یہ سن کر رو پڑی۔ بے اختیار اس کے آنسو بہنے لگے اسے خود سے وحشت ہونے لگی اور اسے عاشر دنیا کا نیک ترین مرد محسوس ہونے لگا۔ رات کو کافی دیر تک عاشر اس کے ساتھ پیار بھری باتیں کرتا رہا مگر کنول اندر ہی اندر خود کو کوستی رہی۔ دن گزرتے گئے۔ عاشر نے خود کو کنول کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ وقت کی اس حسین خماری میں آصف بھی اس کے ذہن سے محو ہو گیا۔

جوں جوں کنول کا بوجھل پن زیادہ ہوتا گیا اسکی آواز خاموش ہوتی گئی۔ اس کی آنکھیں ویران ہوتی گئیں اور رخسار گلاب کی سوکھی ہوئی پتیوں کی مانند ہوتے گئے جن کی سرخی مائل رنگت پیلاہٹ سے بدلتی گئی۔ عاشر ان سب علامات کی وجہ پیٹ میں موجود بچے کو سمجھتا رہا وہ کنول کی ذہنی اذیت سے لاعلم ہو چکا تھا۔ وہ ایک روبوٹ بن کر رہ گیا تھا جس کی حسِ ادراک ختم ہو چکی تھی۔ اور کنول تھی کہ جب بھی حقیقت بتانے کا سوچتی تو اسے لگتا جیسے عاشر خنجر لے کر کھڑا ہے اور پہلے ہی وار میں بچے کی گردن کاٹ دے گا اور کنول کو دھیمی موت مرنے کے لیے چھوڑ دے گا۔ کبھی اس کے ذہن میں آتا کہ عاشر اسے باندھ کر کسی جنگل میں پھینک آئے گا۔ اسے آصف سے نفرت ہوتی مگر اس سے کہیں زیادہ اپنے آپ سے نفرت ہوتی۔ کبھی وہ رونا چاہتی تو صرف افسوس ہوتا آنسو نہ ڈھلکتے۔ ایک مرتبہ تو اس نے یہ بھی خود کلامی میں کہا۔۔۔

’’کاش! یہ بچہ خود ہی مر جائے۔ حرام تو پہلے سے ہی اس دنیا میں اتنا موجود ہے کہ اور حرام کی گنجائش نہیں۔ کہیں میں بھی تو حرام نہیں ہوں؟‘‘ کنول کی ذہنی اذیت اب دیوانگی کا در کھٹکھٹا رہی تھی۔

ایسی جان لیوا کیفیت میں جو واحد شے اس کے دل کو تسلی دیتی وہ یہ تھی کہ کنول کو اپنی زندگی سے زیادہ اس بچے کی زندگی عزیز تھی جس نے ابھی زندہ ہونا تھا اور آنکھیں کھولنا تھیں۔ وہ اس بات پر فخر مند تھی کہ احساس گناہ کی اتنی شدت کے باوجود بھی اس نے زندگی کا راستہ نہیں روکا تھا۔ اور اس کیفیت میں اسے اپنی موت عزیز تھی۔ مگر یہ افتخار اتنا طاقتور نہیں تھا کہ اس کے دل میں موجود پچھتاوے کے ناگ کو مار ڈالے۔ دن بہ دن کنول کی حالت دگرگوں ہوتی گئی۔ وہ ختم ہو رہی تھی اور عاشر خوش تھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ اسے علم نہیں تھا کہ کنول پر کیا بیت رہی ہے۔ اس کے جرم نے کنول پر جو زخم لگایا تھا اب اسے کنول کی اپنی نزاکت گہرا کر رہی ہے۔ وہ بہت خوش تھا اس بات پر کہ وہ باپ بننے والا ہے اس کی نسل چلنے لگی ہے!

کنول کی شخصیت ہر گزرتے لمحے کے ساتھ موہوم ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے گناہ کا سارا بوجھ اپنے ہی کندھوں پر لاد لیا تھا۔ آصف بھی اس کے ذہن سے اترتا جا رہا تھا مگر وہ اسے ہر وقت یاد رہتا۔ جسم میں ہر اٹھتے درد کے ساتھ اسے اپنی سسکیاں اور آصف کے قہقہے سنائی دیتے۔ عاشر کی خوشی اور اسکی خدمت گزاری دیکھ کر کنول کا احساس گناہ اور بڑھتا جا رہا تھا۔ اب تو عاشر نے ایک خادمہ بھی مقرر کر دی تھی۔ عاشر کنول کے پاؤں بھی زمین پر پڑتے ہوئے نہ دیکھنا چاہتا تھا۔ اسے دل میں کنول کے لیے ایسی محبت محسوس ہوتی جیسے اس نے کنول کو اپنے اندر سمو لیا ہو!

جوں جوں پیدائش کے دن قریب آتے گئے کنول کی خاموشی سناٹا بنتی گئی۔ عاشر نے لاکھ جتن کیے مگر اس رویے میں کوئی فرق نہ آیا۔ کنول کی والدہ بھی کنول کے پاس آ گئی تھیں مگر کنول کو یہ سب لوگ دیوار میں جڑے ہوئے مجسمے نظر آتے۔

ایک رات جب کنول کے پہلو میں بیٹھا ہوا عاشر اسے ہنسانے کی کوشش میں مصروف تھا کہ اس نے کنول سے پوچھا۔

’’ہم اپنے بچے کا کیا نام رکھیں گے؟‘‘

یہ سنتے ہی کنول زاروقطار رو پڑی۔ اسے ہچکیاں جاری ہو گئیں۔ بہت دیر رونے کے بعد جب آنسو بجھنے لگے تو کنول نے کپکپاتی ہوئی آواز میں کہا۔

’’عاشر! خدا کے لیے مجھے معاف کر دینا۔ خدا کا واسطہ ہے! میں نے تمہیں معاف کر دیا تم بھی مجھے معاف کر دینا۔ یہ آصف کا بچہ ہے! مجھ پر ظلم مت کرنا مجھے معاف کر دینا‘‘ کنول پھر سے رونے لگی۔

یہ سنتے ہی عاشر کے ذہن کو سمتیں بھول گئیں وہ چکرا کر رہ گیا اس نے بولنا چاہا مگر اس سے کچھ نہ بولا گیا۔

کچھ دیر رونے کے بعد کنول نے پھر ہمت باندھی اور کہا۔

’’خدا کا واسطہ عاشر میری ماں کو نہیں بتانا اتنی بدکردار بیٹی کا سن کر وہ مر جائیں گی اس سے اچھا ہے میں ہی مر جاؤں یہ بچہ مر جائے آصف مر جائے!‘‘

باقی صفحہ ۱۱۳ پر ملاحظہ کیجیے

حسرت

تابش خانزادہ
(لاس انجلس)

خالو عطا چھ فٹ کے لمبے چوڑے چکلے ساٹھ کے پیٹے میں تھے۔ بظاہر ان کی ٹینس کی سفید یا پیلے بالوں والی گیند سے کوئی مماثلت نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے باوجود ہمارے ہاں خالو عطا اور ٹینس کی گیند کا نام ہر جگہ ساتھ ساتھ آتا ہے۔ یوں کہہ لیں کہ جب بھی خالو عطا کا ذکر ضرور ہوتا ہے، ساتھ ٹینس کی گیند کی بات ہوتی ہے۔

وہ میرے ہی نہیں جگت خالو ہیں اور ماشاءاللہ اچھے کھاتے پیتے اور مالدار ہیں۔ کئی برس پہلے خالو عطا نے پی ڈبلیو ڈی میں پہلا ٹھیکہ حاصل کرنے کی خوشی میں شہر کے ایک پرائمری سکول کے بچوں میں ٹینس کی گیندیں مفت تقسیم کروائیں۔ ریلوے کا ٹھیکہ ملا تو انہوں نے شہر کے مڈل سکول میں تقریباً ایک ہزار گیندیں تقسیم کی تھیں۔ اس کے بعد تو یوں لگا جیسے ہمارے شہر میں ٹینس کی گیندوں کی بارش ہونے لگی تھی۔ اسلامیہ سکول نے کرکٹ جیتی تو خالو نے یہاں بھی ٹینس کی گیندوں کا انعام دیا تھا۔ یوم پاکستان کے موقع پر پورے شہر کے بچوں میں پریڈ کے موقع پر گیندیں تقسیم ہوئیں اور یوں سارے شہر میں جگہ جگہ ٹینس کی گیندیں ہی گیندیں دکھائی دینے لگی تھیں۔ شہر کا کوئی طالب علم آٹھویں، نویں، دسویں یا بارہویں کے بورڈ کے امتحان میں اوّل یا دوم یا سوئم آتا تو خالو عطا ان کے لیے ٹینس گیندوں کا ایک ایک ڈبا بھجوا دیتے تھے۔ یونیورسٹی کے کسی امتحان میں کوئی اوّل آتا تو خالو اُسے ٹینس کے دو ڈبے روانہ کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ یونیورسٹی کے چانسلر نے خالو سے درخواست کرتے ہوئے کہا، یونیورسٹی کے طلباء گیند کھیلنے کی عمر سے گزر چکے ہوتے ہیں، آپ انہیں کوئی اور تحفہ دیا کریں۔ لیکن خالو نے چانسلر کی درخواست ڈنکے کی چوٹ پر مسترد کرتے ہوئے کہا تھا میں گیند کا تحفہ دوں گا یا پھر کچھ نہیں دوں گا۔

کسی رشتہ دار کے ہاں بچہ ہوتا تو خالو جھٹ سے ٹینس کی گیندوں کا ایک آدھ ڈبا بھجوا دیتے تھے۔ جب میری چھوٹی بہن پیدا ہوئی تو یہ خبر خالو سے اس لیے چھپائی گئی تھی کہ کہیں وہ ٹینس کی گیندوں کا ڈبہ نہ بھجوا دیں۔ پھر وہی ہوا جس کا خدشہ تھا خالو کو کسی طرح اطلاع ملی اور وہ حسبِ عادت ٹینس کی گیندوں کا ایک ڈبا لے کر ہمارے ہاں پہنچ گئے۔ امّی نے بڑی محبت سے انہیں کہا بھائی صاحب، گیندیں لڑکوں کے کھلونے ہیں، لڑکیاں تو گڑیوں سے کھیلتی ہیں۔ خالو نے امّی کی ایک نہ سنی اور ڈبا سنبل بہن کے سرہانے چھوڑ کر چلتے بنے۔

خالو عطا کی محبت کی وجہ سے اُن کے دیے ہوئے گیند کے تحفے کو ہر کوئی خوشی سے قبول کر لیتا تھا اور اسی نسبت سے ان کا نام گیند والے خالو پڑ گیا تھا اور وہ اپنی کنیت سے نہ صرف بخوبی واقف بھی تھے بلکہ اپنے لیے فخر سے استعمال بھی کرتے تھے۔ میری بات آپ کی سمجھ میں شاید اب تک آ گئی ہو گی کہ خالو عطا اور ٹینس کی گیند میں کوئی گہرا نفسیاتی یا جذباتی تعلق تھا۔

ایک روز میں خالو کا گیند سے جذباتی لگاؤ کی وجہ کریدنے کے لیے ان کے گھر جا پہنچا۔ وہ گھر بھی گویا ٹینس کی گیندوں کا ایک عجائب خانہ تھا۔ انہوں نے بیٹھک کی دیواروں پر شیشے کی الماریوں میں ہر جانب ٹینس کی گیندیں ہی گیندیں اس انداز میں سجا رکھی تھیں کہ جیسے لوگ اپنے گھروں میں بڑی بڑی مہنگی عجائبات اور تصاویر سجاتے ہیں۔ دنیا میں ٹینس کی گیندیں بنانے والی کوئی ایسی کمپنی نہیں تھی جس کی بنائی ہوئی گیند خالو کے خزانے میں موجود نہ ہو گی۔ کوئی فرانسیسی تو کوئی جاپانی، کوئی روسی تو کوئی امریکی گیند۔ اتنی بیش قیمت گیندوں کے درمیان شیشے کے ایک قیمتی کیس میں میری نظر ایک میلی کچیلی گیند پر پڑی جس پر کمپنی اور بنانے والے ملک کے نام کی بجائے لکھا تھا، میری پہلی گیند۔

میں نے وہ گیند اٹھا کر خالو سے اُس کے بارے میں استفسار کرتے ہوئے کہا خالو یہ گندی اور پرانی گیند اتنی قیمتی گیندوں کے درمیان ایسے لگتی ہے جیسے مخمل میں ٹاٹ کا پیوند۔ خالو نے گیند میرے ہاتھ سے لی اور مجھے اپنے سامنے کرسی پر بٹھاتے ہوئے بولے، چلو میں آج تمہیں اس گیند کی قدر و قیمت بتاتا ہوں۔ بچپن میں میری صرف اور صرف ایک خواہش تھی کہ کاش میرے پاس بھی کھیلنے کے لیے ٹینس کی ایک گیند ہوتی۔ لیکن غربت کی وجہ سے والدین مجھے گیند خرید کر دینے سے قاصر تھے اور میں کئی برس مسلسل گیند سے کھیلنے کے خواب دیکھتا رہا تھا۔ اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے میں نے دس سال کی عمر میں آفیسرز کلب کے ٹینس کورٹ میں کھیلنے والوں کی نوکری اس شرط پر کی تھی کہ اگر میں ایک ماہ تک سکول کے بعد دو گھنٹے روزانہ کھیل کے دوران اُن کی دُور پھینکی ہوئی گیندیں اٹھا اٹھا کر انہیں لا کر دوں گا تو مجھے ایک گیند بطور معاوضہ دیں گے۔ یہ میری پہلی کمائی کی گیند ہے، تم میری خوشی کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے جو یہ گیند پا کر مجھے ہوئی تھی اور وہ میری زندگی کا پہلا خوش نصیب ترین دن تھا۔ میں بچوں میں گیندیں اسی لیے تقسیم کرتا ہوں کہ کہیں میری طرح کسی اور بچے کی گیند سے کھیلنے کی حسرت باقی نہ رہ جائے۔ اس کے ساتھ خالو کی آواز بھر آئی۔ انہوں نے اپنی بھیگی آنکھوں سے چوم کر وہ گیند میرے ہاتھ پر رکھ دی۔ میں نے بھی اپنی آستین سے آنسو پونچھتے ہوئے گیند چومی اور عقیدت سے واپس رکھ دی۔

''حقیقت''

اگر تم جان لو کہ لوگ مرنے والے کو کتنا جلد بھول جاتے ہیں، تو تم لوگوں کو متاثر کرنے کے لئے زندگی گزارنا چھوڑ دو گے!

کرسٹوفر والکن

"صبح کے آثار"

نویدسروش

(میرپورخاص)

کیسے سمجھوتا کروں اپنے بھلا کردار پر
اُس نے پابندی لگا دی ہے مرے اظہار پر

زندگی کے اگلے لمحے کا کسے معلوم ہے
زندگی اپنی تو گزری ہے سدا بیگار پر

رات خاصی کٹ چکی ہے اب بھلا گھر جائیں کیا
بات کر لیتے ہیں اب کچھ صبح کے آثار پر

میرے جسم و روح زخمی ہیں مسلسل وار سے
اب بھروسہ کیا کریں ہم دل کی اس دیوار پر

فن کی قیمت پوچھتے کیا ہو کسی فنکار سے
منحصر ہے یہ تمہاری فکر کے معیار پر

دوسروں پر ہنسنے والوں کو یہ اندازہ کہاں
لمحے صدیاں کیسے بنتے ہیں کسی دلداد پر

اب تو بس پیاری ہے مجھ کو اپنی تنہائی سروش
تم رہو آباد جلوت کے حسیں دربار پر

○

عنبرنظام

(جودھ پور)

اپنی صورت میں وہ نظر آیا
کیا کہوں کب سے یہ ہنر آیا

ہر کی فصل پکڑنے والی ہے
یاد کے پیڑ پر ثمر آیا

شب کی دہلیز ہو گئی روشن
دیکھنا کون بام پر آیا

رات دریا میں کون ڈوبا ہے
دیکھنے کس کو شہر بھر آیا

ہم سفر چھانو کا تصور تھا
میں کڑی دھوپ سے گزر آیا

قربتوں کا کرشمہ ہے عنبر
رنگ پیڑوں کا جھیل پر آیا

○

شیباکوثر

(بہار)

دل سمندر میں ٹھکا نہ اچھا
خود کو دنیا سے بچانا اچھا

کر کے احساں نہ اذیت دینا
کر کے نیکی ہے بھلانا اچھا

اس جہاں کے نئے رشتوں سے
اپنا ہر رشتہ پرانا اچھا

کان دیوار کے بھی ہوتے ہیں
راز دل، دل میں چھپانا اچھا

لوگ پھرتے ہیں نمک لے لے کر
زخم ان کو نہ دکھانا اچھا

بس یہی بات تو خوش رکھتی ہے
آئے گا، آگے بھی زمانہ اچھا

تشنگی اپنی مٹانے کے ہی لئے
حوض کوثر ہے تو پینا اچھا

○

جواز جعفری
(لاہور)

سر افق وہ جو تابندہ تر ستارا ہے — زمین کے بعد یہی اگلا گھر ہمارا ہے
کوئی بھی کام نہیں ہو سکا بجز تری یاد — سو آج پھر بڑا مصروف دن گزارا ہے
پس نظر ہے کسی اور کہکشاں کا جمال — کسے دکھاؤں عجب دل کشا نظارا ہے
میں تجھ کو کھو کے محبت کے اس مقام پہ ہوں — کہ تجھ کو پانا بھی اک طرح کا خسارا ہے
پڑا ہوا ہوں ازل سے زمیں کے ساحل پر — مری نظر میں کوئی دوسرا کنارا ہے
سخن کے بحر میں ہے سیر گاہ خاص و عام — وہ اک جزیرہ جسے میں نے خود ابھارا ہے
وہ شہر چھوڑ رہا ہے اسے بتائے کون ؟ — وہ بے نیاز مرا آخری سہارا ہے
رواں دواں ہوں کسی اجنبی زمیں کی طرف — پس غبار یہ کس نے مجھے پکارا ہے
میں اس سے ملنے سے پہلے ہرا بھرا تھا جواز — سو موت بن کے مجھے زندگی نے مارا ہے

○

اصغر شمیم
(کولکتہ)

خوشیوں کا انتظام ابھی تک نہیں ہوا — مجھ سے یہ ایک کام ابھی تک نہیں ہوا
ورثے میں شاعری کا خزانہ مجھے ملا — غزلوں کا میں امام ابھی تک نہیں ہوا
کیسے بتاؤں دل میں مرے کیا ہے دوستو — دل سے میں ہمکلام ابھی تک نہیں ہوا
آٹھوں پہر گزر گئے اس کے حصول میں — پنچھی وہ زیر دام ابھی تک نہیں ہوا
کیسے کہوں کہ کرتا ہوں دل پر حکومتیں — کوئی مرا غلام ابھی تک نہیں ہوا
اصغر یہی سبب ہے کوئی جانتا نہیں — شعر و سخن میں نام ابھی تک نہیں ہوا

○

عبدالعزیز
(گلگت)

آ غمِ دہر بھول جاتے ہیں — زور سے قہقہہ لگاتے ہیں
جی جلانے سے کچھ نہیں ہوگا — آؤ مل کر دیا جلاتے ہیں
جن پہ قدغن لگائی جاتی ہے — وہ مباحث فروغ پاتے ہیں
صرف اتنا قصور ہے اپنا — آنکھ رکھتے ہیں خواب آتے ہیں
لازماً موسمِ خزاں میں عزیز — دن بہاروں کے یاد آتے ہیں

○

تبسم انوار
(کینیڈا)

بلبل قفس میں قید تھا پر دیکھتی رہی — پھر سر اٹھا کے اپنا ہی گھر دیکھتی رہی
کس رخ پہ ہے ہوا کا سفر دیکھتی رہی — روز اک چراغ بام پہ دھر دیکھتی رہی
وابستہ جن سے روشنی کوئے وفا میں تھی — کیسے بجھے وہ شمس و قمر دیکھتی رہی
ان جھریوں میں میرے مہ وسال دفن ہیں — میں آئینے میں اپنا سفر دیکھتی رہی
آتش بجھا کے حق کی سبھی چل پڑے، پہ میں — جو راکھ میں دبا تھا شرر دیکھتی رہی
اتنی دروغ گوئی اور ایسی صفائی سے — میں اس کی گفتگو کا ہنر دیکھتی رہی
جس رہ ملے تھے ہم وہیں بچھڑے سو پھر مجھے — ہر روز دکھ سے راہ گزر دیکھتی رہی
ماں کی دعائیں گر نہ پڑیں راہ میں کہیں — مڑ مڑ کے اپنا زادِ سفر دیکھتی رہی
خود سے بچھڑتے وقت تبسم کا جو تھا حال — دیکھا نہ جا رہا تھا مگر دیکھتی رہی

○

حیدر فاروق
(اسلام آباد)

کسی کاغذ کے ٹکڑے پر میں پہلے گھر بناتا ہوں — پھر اُس کے بام و در پر بے ارادہ ڈر بناتا ہوں
اُٹھاتا ہوں زمیں سے کوئی ٹکڑا آئنے کا میں — پھر اُس میں جھانکتا ہوں اور چشمِ تر بناتا ہوں
مری مٹی ستاروں کے بدن معمور کرتی ہے — کبھی جو موج میں آؤں تو کوزہ گر بناتا ہوں
یہ خود میری سمجھ سے بالاتر ہے کس لیے حیدر — میں اُنگلی سے فضا میں فاختہ کا پَر بناتا ہوں

○

ڈاکٹر ریشا قمر
(کرناٹک)

عجز و خلوص جب مرے پیکر میں آ گیا — سارا کمال پھر مرے دفتر میں آ گیا
دل کا تھا باب گرچہ مقفّل وہ اجنبی — دستک دیے بغیر مرے گھر میں آ گیا
اس آسماں نے مجھ پہ مصیبت جو توڑ دی — میرا وجود کرب کے محور میں آ گیا
میں منتظر رہی کوئی مشقِ ستم تو ہو — وہ مصلحت شناس کہ لشکر میں آ گیا
میری وفا پہ تم کو جو کچھ اعتبار تھا — تو کیسا انقلاب یہ تیور میں آ گیا؟
وہ میری زندگی کی تمنا، وہ میری جان — بگڑا تو پھر زمانے کی ٹھوکر میں آ گیا
میرے ہر ایک لفظ، مری سوچ کا محل — بے لوث آج دامنِ دلبر میں آ گیا
کس کو ریشا درد کا انبار چاہیے — جتنا ہنود قسمتِ دختر میں آ گیا

○

تیمور حسن
(لاہور)

تجھے زندگی کا شعور تھا، ترا کیا بنا؟ — تو خاموش کیوں ہے مجھے بتا، ترا کیا بنا؟
نئی منزلوں کی تلاش تھی سو بچھڑ گئے — میں بچھڑ کے تجھ سے بھٹک گیا، ترا کیا بنا؟
مجھے علم تھا کہ شکست میرا نصیب ہے — تو امیدوار تھا جیت کا، ترا کیا بنا؟
میں مقابلے میں شریک تھا فقط اس لیے — کوئی آ کے مجھ سے یہ پوچھتا، ترا کیا بنا؟
تجھے دیکھ کر تو مجھے لگا تھا کہ خوش ہے تو — تیرے بولنے سے پتہ چلا، ترا کیا بنا؟
جو نصیب سے تری جنگ تھی وہ میری بھی تھی — میں تو کامیاب نہ ہو سکا، ترا کیا بنا؟

○

حنیف نجمی
(چھتیس گڑھ)

عجب کیا ہے جو اس رُت میں یہ منظر ہی نظر آئے — کہ پھول آنے سے پہلے کچھ درختوں پر ثمر آئے
ترے غم کا کم از کم مجھ میں اتنا تو اثر آئے — مرے صورت میں دنیا کو تری صورت نظر آئے
اندھیرے میں اجالا ہے اجالے میں اندھیرا ہے — اب ایسے میں بھلا کس کو تمیز خیر و شر آئے
پرندے عہدِ طفلی میں رہے آزاد و آوارہ — قفس میں قید ہو کر رہ گئے جب بال و پر آئے
بساطِ خاک پر بے حد قد آور لگ رہے تھے جو — بلندی پر پہنچ کر وہ بہت چھوٹے نظر آئے
یہ روز و شب اندھیروں کی ثنا اچھی نہیں لوگو — کہیں ایسا نہ ہو سورج زمیں پر ہی اتر آئے
ہوس جاہ و حشم کی اور نہ خواہش مال و زر کی ہے — بس اک دُھن ہے کہ مجھ کو شعر کہنے کا ہنر آئے
وہی اغوا کی خبریں قتل و غارت کے وہی قصّے — کبھی تو شہر سے تیرے کوئی اچھی خبر آئے
اترنا تھا ہی نجمی اس بلندی سے تمہیں اک دن — چلو اچھا ہوا تم اپنی مرضی سے اتر آئے

○

مہناز انجم
(اسلام آباد)

عکس ہے بوقلموں میرا بھی — آئینہ خانہ ہے یوں میرا بھی
گیروی لگتی ہوں قرطاس پہ میں — میرے کام آیا ہے خوں میرا بھی
حسن کاری ہے تری مرگ طلب — اور خودکش ہے فسوں میرا بھی
مجھ کو خوش خوش نظر آتا نہیں وہ — یعنی غارت ہے سکوں میرا بھی

○

- ناول -

خاکِ شفا

پیرزادہ آلِ انوار

(میاں)

قسط ۱۳

''لاد ، دو۔۔۔ لادنے والا ساتھ دو۔۔۔ ابّا حضور کہا کرتے تھے۔۔۔مگر۔۔۔دو۔۔۔اور۔۔۔والا ساتھ دو۔۔۔پہلی مرتبہ دیکھا۔۔۔!''

''کچھ تو شرم کر۔۔۔ اُس شریف آدمی نے۔۔۔کڑے وقت میں ہاتھ نہ تھاما ہوتا۔۔۔تو۔۔۔کب کے۔۔۔ہوتے۔۔۔!''

''تیرے اندر بڑا عیب یہ ہے۔۔۔!''

''بول۔۔۔بول۔۔۔رُک کیوں گیا۔۔۔!''(غیاث نے عمران کے چٹکی لیتے ہوئے چابک مار کر دُلکی چلنے پر مجبور کیا)

''ابے یہ ہی۔۔۔اور۔۔۔کیا۔۔۔!''

''میں بھی تو یہ ہی پوچھ رہا ہوں۔۔۔!''

''بات۔۔۔بے۔۔۔بات۔۔۔تیرے اندر کا مولوی۔۔۔باہر نکل آتا ہے۔۔۔اور۔۔۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ۔۔۔شروع کر دیتا ہے۔۔۔!''

''کسی کا احسان ماننا۔۔۔حسنِ خلق کی تعریف کرنا۔۔۔ نیکی کو سراہنا۔۔۔بری بات ہے کیا۔۔۔؟''

''کون ماں کا۔۔۔کہتا ہے بری بات ہے۔۔۔اختلاف۔۔۔فرشتہ بننے پر ہے۔۔۔وہ۔۔۔کیا نام ہے۔۔۔لمبی زلفوں والے لکھنو کے شاعر کا۔۔۔ ہاں۔۔۔یاد آیا۔۔۔عادل لکھنوی۔۔۔لگتا ہے۔۔۔یہ شعر تیرے لیے ہی کہا ہے اُس نے:''

وفا کے جذبے کا نام دُم ہلانا ہے
جو دُم کھڑی ہے وہ نفرت کا تازیانہ ہے

''نہیں یار۔۔۔یہ دُم ہلانا نہیں۔۔۔بلکہ۔۔۔!''

''ٹھیک ہے۔۔۔ٹھیک ہے میرے باپ۔۔۔!۔۔۔تُو جیتا۔۔۔ میں ہارا۔۔۔اُس کی قسمت اچھی تھی۔۔۔ہم مل گئے۔۔۔ہماری قسمت اچھی ہو گی۔۔۔ہمیں بھی کوئی مل جائے گا۔۔۔قسم پیدا کرنے والے کی۔۔۔اس سے دوگنی۔۔۔بلکہ۔۔۔ چوگنی خدمت نہ کی۔۔۔تو۔۔۔ میرا نام بدل کے رکھ دینجو۔۔۔!''

''مثلاً۔۔۔کس طرح کا نام۔۔۔پسند فرمائیں گے جناب۔۔۔آلِ حضور۔۔۔بندہ پرور۔۔۔عالی جاہ۔۔۔والے۔۔۔یا۔۔۔؟

''دِکھادی نا اپنی ذات۔۔۔!''

''اچھا اچھا ٹھیک ہے۔۔۔ جب وقت آئے گا دیکھا جائے گا۔۔۔ فلحال۔۔۔تو۔۔۔اُس کے گُن گا۔۔۔جس نے اس انجان شہر میں۔۔۔نہ صرف انجان لوگوں کا ہاتھ تھاما۔۔۔ بلکہ۔۔۔اپنے گھر میں پناہ بھی دی۔۔۔ اور۔۔۔چلتے چلتے۔۔۔بمبئی کے ٹکٹ کے ساتھ سفر خرچ کے لیے۔۔۔سو روپے کا پھرّ ابھی تھما دیا۔۔۔تھوڑے نا بہت۔۔۔سو روپے(نوٹ عمران کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے)

فالتو باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے۔۔۔ہمیں سٹیشن کی راہ لینی چاہیے۔۔۔(وجے نے سنجیدگی سے دونوں کا بازو ہلاتے ہوئے اپنی جانب متوجہ کیا)

''یار کہہ تو ٹھیک رہا ہے تُو۔۔۔!''(وجے کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے عمران نے رکشے والے کو ہاتھ دیا)

''یہ کیا کر رہا ہے۔۔۔؟''

''دیکھ نہیں رہا۔۔۔رکشہ روک رہا ہوں۔۔۔!''

''نواب زادے۔۔۔یہ عیاشیاں نہیں چلیں گی۔۔۔!(سوکا نوٹ طے کر کے جیب میں رکھتے ہوئے) نہ تو رکشے والے کے پاس سو روپے کا چھٹا ہو گا۔۔۔نہ۔۔۔یہ نوٹ سٹیشن سے پہلے ٹوٹے گا۔۔۔سمجھ آئی۔۔۔!''

''ٹھیک ہے میرے باپ۔۔۔ بالکل ٹھیک ہے۔۔۔!''(سٹیشن کی جانب قدم بڑھاتے ہوئے)

☆

''ابے لبنڈو۔۔۔ہم تو۔۔۔مالا مال ہو گئے بے۔۔۔!''

''ہُنڈی نکل آئی۔۔۔یا۔۔۔سٹہ نکل آیا۔۔۔؟''(وجے نے طنز کے نشتر چلائے)

''ابے نہیں بے۔۔۔ والے۔۔۔ یہ دیکھ۔۔۔ یہ۔۔۔ٹکٹ خریدنے کے بعد بھی۔۔۔قریب ساٹھ روپے بچ گئے۔۔۔!''

''ساٹھ روپے۔۔۔؟''(غیاث نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے منہ پھاڑ کر حیرت کا اظہار کیا)

''کیا بمبئی قریب ہے۔۔۔؟''

''اوں۔۔۔آں۔۔۔نہیں تو۔۔۔ ناگ پور سے۔۔۔ پانچ سو تئیس میل کا فاصلہ ہے۔۔۔!''

''پانچ سو تئیس۔۔۔پہنچیں گے کب۔۔۔؟''(غیاث نے عمران سے ہاتھ نچا کر پوچھا)

''کھڑکی کے قریب کھڑا قُلی بتلا رہا تھا۔۔۔سترہ سے اٹھارہ گھنٹے لگتے ہیں۔۔۔!''

''سترہ سے اٹھارہ۔۔۔؟''

''ابے ہاں بے۔۔۔ ہاں۔۔۔ سترہ سے اٹھارہ۔۔۔ بہرہ ہو گیا ہے۔۔۔ سنائی نہیں دیتا۔۔۔ اُمراؤتی۔۔۔ کارنجا۔۔۔ مینگر۔۔۔ اورنگ

آباد۔۔۔اور۔۔۔پونا سے ہوتی ہوئی جائے گی۔۔۔!''

''پانچ۔۔۔چھ۔۔۔سات (انگلیوں پر گنتے ہوئے) اس کا مطلب ہے۔۔۔بارہ بج جائیں گے پہنچتے پہنچتے۔۔۔!''

''ہماری بلا سے (عمران نے وجے کے سوال کا لاپرواہی سے جواب دیتے ہوئے) بارہ بجے پہنچائے۔۔۔یا۔۔۔تیرہ بجے۔۔۔یار ہوری تو لمبی تان کے سوئیں گے۔۔۔اور۔۔۔خوابوں میں اجمل سلطان پوری کے ساتھ عشق کی پینگیں بڑھائیں گے۔۔۔!''

میں تیرا شاہ جہاں ، تو میری ممتاز محل
آ تجھے پیار کی انمول نشانی دے دوں
ہائے یہ ناز، یہ انداز، یہ غمزہ، یہ غرور
اس نے پامال کئے کتنے شہنشاہوں کے تاج
نیم باز آنکھوں میں یہ کیف یہ مستی یہ سرور
پیش کرتے ہیں جسے اہلِ نظر دل کا خراج
یہ تبسم، یہ تکلم، یہ سلیقہ، یہ شعور
شوخ، سنجیدہ و حیا دار، حسیں سادہ مزاج
آ تیرے واسطے تعمیر کروں تاج محل
تجھے پیار کی انمول نشانی دے دوں
میں تیرا شاہجہان، تو میری ممتاز محل
موگرا، موتیا، رابیل، چمبیلی، چمپا
سوسن و یاسمین و نسترن و سرو سمن
رات رانی، گل نچکن ، گل نسرین ، شہلا
پھول لب، پھول دہن، پھول ذقن، پھول بدن
میری سورج مکھی گل چاندنی جوہی بیلا
ہار سنگھار و گل کچنار و گلنار چمن
میری نرگس میری گل شب و میری پھول کنول
آ تجھے پیار کی انمول نشانی دے دوں
شمع، خورشید، قمر، برق، شرر، سیارے،
ہیں تیرے ہی رخِ انوار کی ان سب میں چمک
لال، یاقوت، شفق، پھول، حنا، انگارے
ہیں تیرے ہی لب ورخسار کی ان سب میں جھلک
وہی اڑتے ہوئے چھینٹے ہیں یہ جگنو سارے
تیرے ساغر سے ازل ہی میں جو گئے تھے چھلک
بادہ حسن میرے جامِ شفق رنگ میں ڈھل
تجھے پیار کی انمول نشانی دے دوں
میں تیرا شاہ جہاں تو میری ممتاز محل
آ تجھے پیار کی انمول نشانی دے دوں
میں تیرا قیس تو لیلیٰ ٔ شبستانِ جمال
میں تیرا وامق جانسوز، تو عذرائے زماں
خدو خال و رخ و گیسو کی کوئی مثال
میں شہنشاہ جہانگیر ہوں تو نور جہاں
میری شیریں سخنی میں تیرا فرہادِ خیال
شاعرِ ہند ہوں میں اورتو میری اردو زباں
اے میرے گیت کی جاں، اے میری محبوب غزل
آ تجھے پیار کی انمول نشانی دے دوں
میں تیرا شاہ جہاں تو میری ممتاز محل
کہ تو ہے اقبال کی نظموں کا حسیں درسِ حیات
میر، غالب، ظفر و ذوق کا اندازِ کلام
جوش کی نظم مسلسل گری کے قطعات
داغ کی سادہ زباں ، نوح کا طوفانِ خرام
تیرے اوصاف کے پہلو ہیں جگر کے حالات
تو میری جانِ رباعی ہے، میں تیرا خیام
میں تیرا حافظ شیراز، تو صہبائے غزل
آ تجھے پیار کی انمول کی نشانی دے دوں

''یار۔۔۔! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا۔۔۔بمبئی شہر ہے۔۔۔یا۔۔۔شیطان کی آنت۔۔۔جب سٹیشن نظر آتا ہے۔۔۔جب دل کی دھڑکن تیز ہوتی۔۔۔اور۔۔۔منزل قریب نظر آنے لگتی ہے۔۔۔تو۔۔۔کوئی نہ کوئی یہ کہہ کر۔۔۔ارمانوں پہ اوس ڈال دیتا ہے۔۔۔یہ ورلی ہے۔۔۔یہ بوریوالی ہے۔۔۔یہ باندرہ ہے۔۔۔یہ اندھیری ہے۔۔۔یہ مہالکشمی ہے۔۔۔یہ جوگیشوری ہے۔۔۔بمبئی نہ ہوئی عمرو یار کی زنبیل ہوگئی۔۔۔اِدھر دل پہ آرے چل رہے ہیں۔۔۔اُدھر بمبئی ہے۔۔۔کہ سالی آنے کا نام نہیں لے رہی۔۔۔اب ہم شاعر تو ہیں نہیں۔۔۔کہ۔۔۔معین احسن جذبی کی طرح۔۔۔حالِ دل اشعار میں بیان کردیں:

کتنے بے خواب حسینوں کی تسلّی کے لیے
بند ہوتی ہوئی آنکھوں کے سلام آئیں گے
کتنے جلتے ہوئے گلرنگ لبوں کی خاطر
سرد ہوتے ہوئے ہونٹوں کے پیام آئیں گے
کتنے افسردہ ستاروں کو بنا کر خورشید
کتنے خورشیدِ درخشاں لبِ بام آئیں گے
اپنے سینے میں چھپائے ہوئے لاکھوں ظلمات
ضوفگن کتنے ابھی ماہِ تمام آئیں گے
ہر قدم آگے بڑھانے کے لیے خون کی بھینٹ
ایسے بھی، اے غمِ دل! کتنے مقام آئیں گے

تشنگی پینے پہ مجبور کرے یا نہ کرے
زہر آلودہ ابھی سینکڑوں جام آئیں گے

☆

''ہاں بے ہاں عمران۔۔۔کیا ہوا۔۔۔؟''

''تیری۔۔۔تو۔۔۔کا۔۔۔!''

''ابے تاؤ کیوں کھا رہا ہے۔۔۔سیدھی طرح بتا۔۔۔مبین چچا ملے کے نہیں۔۔۔؟''

''لو۔۔۔اور سنو۔۔۔مبین چچا۔۔۔قسمت کی لکیر میں روڑا نصیب کا۔۔۔!''

''ابے اول فول کیوں بک رہا ہے۔۔۔صحیح بات بتا۔۔۔پتہ تو ٹھیک ہے نا۔۔۔؟''

''پتے کو چاٹوں۔۔۔یا۔۔۔چُوموں۔۔۔بول۔۔۔بتا۔۔۔بتا بتا۔۔۔کیا کروں۔۔۔؟''

''مطلب۔۔۔؟''

''ایک تو اُس بیٹی۔۔۔کے جنے ٹیکسی والے نے۔۔۔تھوڑے نا بہت۔۔۔سات روپے اینٹھ لیے۔۔۔اِدھر۔۔۔لاٹ صاحب کے دروازے پر موٹا سا تالا منہ چڑا رہا ہے۔۔۔!''

''یعنی۔۔۔ہوا ہوائی کے گھر پہ نہیں۔۔۔!''

''نہیں۔۔۔!''

''شکر ہے۔۔۔!''(لمبی سانس چھوڑتے ہوئے وجے نے خوشی کا اظہار کیا)

''یار۔۔۔گھر مل گیا ہے۔۔۔تو۔۔۔مبین چچا بھی مل ہی جائیں گے۔۔۔اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔۔۔؟''

''یہ تو مجھے بھی پتہ ہے۔۔۔کہ۔۔۔مبین صاحب بہادر۔۔۔مل ہی جائیں گے۔۔۔مگر۔۔۔کب۔۔۔اتنی دیر ہم کیا کریں۔۔۔کہاں جائیں۔۔۔؟''

''سیدھی سی بات ہے۔۔۔پیٹ کی آگ بجھانے ہوٹل جائیں گے۔۔۔ہوٹل۔۔۔اور۔۔۔کہاں جانا ہے۔۔۔؟''

''ابے یہ بیرا ہے۔۔۔کہ۔۔۔بہرا۔۔۔!''

''مجھے تو گونگا لگتا ہے۔۔۔!''

''تُو یہاں کیوں۔۔۔آیا ہے۔۔۔!''

''ہاں صاب۔۔۔بولو کیا مانگتا۔۔۔!''

''کھانے میں کیا ہے۔۔۔؟''

''آلو گوبی۔۔۔آلو مٹر۔۔۔مٹر پنیر۔۔۔چنے کی دال۔۔۔اُرد کی دال۔۔۔آلو گوشت۔۔۔بھنڈی گوشت۔۔۔مٹر قیمہ۔۔۔آلو قیمہ۔۔۔بریانی۔۔۔حلیم۔۔۔نہاری۔۔۔اور۔۔۔پائے۔۔۔!''

''اس سے پہلے کیا کام کرتا تھا بھائی۔۔۔؟''

''بولے تو۔۔۔؟''(حیرانی سے کندھے پر پڑے جھاڑن سے منہ صاف کرتے ہوئے)

ریل گاڑی چلاتا ہوگا۔۔۔!(وجے نے گرہ لگائی)

''مسخری نئیں مانگتا صاحب۔۔۔دھندے کا ٹیم اے۔۔۔آرڈر بولو۔۔۔آرڈر۔۔۔!''

ہاں بے ہاں بولو۔۔۔کیا کھاؤ گے۔۔۔؟''

''جوتُو کھائے گا۔۔۔''(غیاث اور وجے ہم آواز تھے)

''پنڈت۔۔۔تُو بیف کھائے گا۔۔۔؟''

''تُو تو ایسے دیدے پھاڑ رہا ہے جیسے۔۔۔پہلی بار کھا رہا ہوں۔۔۔؟''

''تو پھر مٹر قیمہ منگالوں۔۔۔!''

''منگالے۔۔۔منگالے۔۔۔جو جی چاہے منگالے۔۔۔میری جان۔۔۔پیٹ میں چوہوں کا دنگل ہو رہا ہے۔۔۔!''

''ہاں تو پہلوان۔۔۔! کتنے کی پلیٹ لگائی ہے مٹر قیمے کی۔۔۔؟''

''کٹنگ مانگتا۔۔۔یا۔۔۔سالم۔۔۔؟''

''لو کر لو بات۔۔۔بمبئی میں سالن بھی کاٹ کر ملتا ہے۔۔۔چھری سے کاٹتے ہو۔۔۔یا قینچی سے۔۔۔؟''(عمران نے اپنی طرف سے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی)

''دھندے کا ٹیم اے صاحب۔۔۔دھندے کا۔۔۔کٹنگ بولے تو ہاف۔۔۔سالم بولے تو فُل۔۔۔!''

''بڑے بھائی۔۔۔لگے ہاتھوں قیمت بھی بتلا دو۔۔۔؟''

''بولے تو۔۔۔فل پلیٹ تین آنے کا۔۔۔ہاف پلیٹ دو آنے کا۔۔۔!''

''بھیّا تم فل ہی لے آؤ۔۔۔!''(بیرے کو آواز دیتے ہوئے) روٹیاں زیادہ لانا۔۔۔!''

''بولے تو کچھو مر۔۔۔!''(عمران نے ہاتھ کے اشارے سے ہاں کہہ دیا)

''یار۔۔۔! آنکھیں باہر نکل آئیں کھانا کھا کے۔۔۔یقین کر۔۔۔بھوک کے مارے۔۔۔آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔۔۔!''

''اب کالی گھٹائیں چھانے والی ہیں۔۔۔ڈیڑھ۔۔۔ڈیڑھ پلیٹ قیمے کی۔۔۔اور۔۔۔سترہ روٹیاں سُوڑ گئے ہو۔۔۔سلاد اس کے علاوہ۔۔۔!''

''بیٹا جی۔۔۔! ابھی سے چیں بول گئے۔۔۔ابھی تو چائے بھی پینی ہے۔۔۔!''

''پیئو میری جان۔۔۔دل کھول کے پیئو۔۔۔باپ کا مال ہے۔۔۔!''

''باپ کا نہیں۔۔۔صادق سرحدی کا۔۔۔!''(وجے نے گرہ لگائی)

''بل رکھوانچی۔۔۔اور۔۔۔جلدی سے تین چائے لے آؤ۔۔۔!''

''بولے تو۔۔۔صاب۔۔۔یہ بمبئی ہے۔۔۔ادر۔۔۔لفڑانی مانگتا!''

''ٹھیک ہے۔۔۔ٹھیک ہے۔۔۔بمبئی ہے تو ہوا کرے۔۔۔جلدی سے تین چائے لے آ۔۔۔!''

''کٹنگ مانگتا۔۔۔یا۔۔۔سالم۔۔۔!''

''پیسے بول۔۔۔پیسے۔۔۔''

''فل کپ ایک آنہ۔۔۔کٹنگ دو پیسہ۔۔۔!''

''ہاں بے ہاں۔۔۔بولو۔۔۔!''

''کھانا ڈٹ کے کھایا ہے۔۔۔ تو۔۔۔ چائے کیوں ہاف پئیں۔۔۔!''

''جلدی سے تین فل لے آؤ پہلوان۔۔۔!''

''اچھا پہلوان۔۔۔نام تو بتاؤ اپنا۔۔۔!''

''اکھا ناگ پاڑہ۔۔۔اپن کو۔۔۔چھوٹو بولتا۔۔۔!''

''اوہ۔۔۔چھوٹو تو لقب ہوانا۔۔۔اصل نام بتا۔۔۔اصل۔۔۔؟''

''مالوم پڑے گا۔۔۔تو۔۔۔بتلا دے گا۔۔۔!''

''مطلب۔۔۔؟''

''مطلب وطلب کچھ نہیں صاب۔۔۔ ادھر اچ فٹ پاتھ پر پیدا ہوتا۔۔۔ادھر اچ مر جاتا۔۔۔!''

''باپ رے۔۔۔یہ بمبئی ہے۔۔۔یا۔۔۔!''

''ابے بس کر دے۔۔۔بس کر دے۔۔۔چھوڑ دے بے چارے کی جان۔۔۔!(عمران کے ہاتھ سے بل چھینتے ہوئے غیاث نے غصے کا اظہار کیا)

ساڑھے چار پلیٹ مٹر قیمہ۔۔۔ تیرہ آنے۔۔۔ اور۔۔۔ دو پیسہ۔۔۔سترہ روٹیاں۔۔۔آٹھ آنے۔۔۔اور۔۔۔دو پیسہ۔۔۔ایک پلیٹ کچومر یعنی سلاد۔۔۔ایک آنہ۔۔۔تین کپ چائے۔۔۔تین آنے۔۔۔کُل ملا کے بن گئے جناب۔۔۔ ایک روپیہ دس آنے۔۔۔ اب کیا جائے۔۔۔؟''
(عمران نے دونوں کی جانب دیکھتے ہوئے دریافت کیا)

''کرنا کیا ہے۔۔۔ ایک روپے بارہ آنے دے دے۔۔۔ دو آنے۔۔۔کافی ہیں ٹپ کی مد میں۔۔۔!''

''نہیں یار۔۔۔! دل بھر آیا۔۔۔ چھوٹو کی داستان سن کے۔۔۔ میں۔۔۔دو روپے دے رہا ہوں (ایک ایک روپے کے دو نوٹ پلیٹ میں رکھتے ہوئے)

☆

''دیکھو بھئی لبنڈو۔۔۔بات یہ ہے کہ میں شاعر وائر تو ہوں نہیں۔۔۔نا ہی مجھے شعر ویر سے لگاؤ ہے۔۔۔مگر۔۔۔بچپن میں ابا جی سے یگانہ چنگیزی کا یہ شعر اتنی بار سنا ہے۔۔۔کہ۔۔۔حفظ ہو گیا ہے۔۔۔

پکارتا رہا کس کس کو ڈوبنے والا
خدا تھے اتنے مگر کوئی آڑے آ نہ گیا

''مجھے اس وقت۔۔۔دو باتیں کھائی جا رہی ہیں۔۔۔!''

''وہ کیا۔۔۔؟''(عمران کے لہجے میں فکرمندی نمایاں تھی)

''پہلی بات تو یہ۔۔۔کہ۔۔۔میں تم تینوں میں سوائے ایک کے۔۔۔کسی کو پہچانتا تک نہیں۔۔۔اور۔۔۔یہ جو اپنا پیر صاحب کا برخوردار ہے۔۔۔کیا نام ہے میاں صاحبزادے (حافظے پر زور دیتے ہوئے)

''عمران۔۔۔!''

''اللہ تمہارا بھلا کرے۔۔۔عمران۔۔۔اس کو بھی میں اتنا ہی جانتا ہوں۔۔۔کہ۔۔۔ یہ پیر صاحب کا برخوردار ہے۔۔۔کیا کرتا ہے۔۔۔اور کیا نہیں کرتا۔۔۔ اس کی بابت بھی میری معلومات ۔۔۔ نہ ہونے کے برابر ہیں۔۔۔!''

''جی۔۔۔!''(تینوں نے کمزور آواز میں آواز ملا کر)

''اچھا تم مجھے یہ بتاؤ۔۔۔بیٹھے بٹھائے۔۔۔تمہیں سوجھی کیا جو تم منہ اُٹھائے بمبئی چلے آئے۔۔۔وہ بھی۔۔۔چٹھی۔۔۔پتر۔۔۔اور اطلاع کے بغیر۔۔۔سب کچھ ٹھیک ہے نا۔۔۔کوئی گڑبڑ تو نہیں۔۔۔؟''

''گڑبڑ۔۔۔کیسی گڑبڑ۔۔۔؟''

''یہ دونوں کون ہیں۔۔۔؟''

''یہ غیاث ہے۔۔۔اور۔۔۔ یہ وجے ہے۔۔۔ہم تینوں کی دانت کاٹے کی دوستی ہے۔۔۔!''

''آگے چلو۔۔۔آگے۔۔۔!''

''آگے۔۔۔؟''(دروازے کی جانب بے بسی سے دیکھتے ہوئے)

''بمبئی آنے کی وجہ کیا ہے۔۔۔صاف، صاف بتاؤ۔۔۔صاف، صاف۔۔۔؟''

''بمبئی۔۔۔''(لمبا سانس کھینچ کر)

''ہاں۔۔۔ہاں۔۔۔بمبئی۔۔۔!''

''چچا۔۔۔ہمیں۔۔۔ایکٹر بننے کا شوق ہے۔۔۔!''(عمران بات کرتے ہوئے جھٹ سے ہوا ہوائی کے قریب ہو گیا)

''ایک کو۔۔۔یا۔۔۔تینوں کو۔۔۔؟''

''تینوں کو۔۔۔!''(عمران، غیاث اور وجے نے بہ یک آواز جواب دیا)

''بھئی واہ۔۔۔کیا کہنے۔۔۔ یک نہ شد دو شد تو سنی تھی۔۔۔تین شد۔۔۔پہلی بار سن رہا ہوں۔۔۔ بلکہ۔۔۔ دیکھ رہا ہوں۔۔۔میاں۔۔۔! باؤلے ہوئے ہو۔۔۔ یا۔۔۔ بھنگ پی رکھی ہے۔۔۔ نا میں لاٹ صاحب ہوں۔۔۔اور۔۔۔نا وائسرائے ہند۔۔۔ایک معمولی سا آوارہ گرد ہوں۔۔۔جسے۔۔۔تلاشِ معاش یہاں کھینچ لائی ہے۔۔۔بمبئی آ کر کون کون سے پاپڑ نہیں بیلے میں نے۔۔۔کس کس در کی خاک نہیں چھانی۔۔۔میرا نام ہوا ہوائی یونہی نہیں پڑا ۔۔۔ آج یہاں۔۔۔کل وہاں۔۔۔ پرسوں جانے کہاں۔۔۔

اور۔۔۔تم لوگوں کے رہنے کا کیا ہوگا۔۔۔کوئی ٹھور ٹھکانہ ہے بمبئی میں تمہارا۔۔۔؟''

''نہیں۔۔۔!''(تینوں نے مریل آواز میں کہا)

''پھر رہوگے کہاں۔۔۔؟''

''یہیں۔۔۔آپ کے پاس۔۔۔!''

''یہ ممکن نہیں۔۔۔؟''

''کیوں۔۔۔؟''(اس بار صرف عمران کی آواز اُبھری)

''اس لیے۔۔۔اس لیے (اٹکتے ہوئے) اس لیے۔۔۔کہ۔۔۔یہاں کوئی اور بھی رہتا ہے میرے ساتھ۔۔۔!''

''کون۔۔۔؟''

''سب کچھ بتانا ضروری نہیں۔۔۔!''

☆

''ابے یار۔۔۔تم اب تک سوئے پڑے ہو۔۔۔میں سارے زمانے کی سیر کر آیا۔۔۔اُٹھو اُٹھو۔۔۔جلدی اُٹھو۔۔۔پانچ منٹ ہیں تمہارے پاس۔۔۔منہ پہ چھپکا مارو۔۔۔اور۔۔۔فٹافٹ نیچے آجاؤ۔۔۔!''

''نیچے آجائیں۔۔۔مگر۔۔۔کہاں۔۔۔؟''

''گاڑی میں۔۔۔اور۔۔۔کہاں۔۔۔؟''

''سٹوڈیو لے جاؤ گے۔۔۔؟''

''چلو تو سہی۔۔۔پھر دیکھو کتنی عیاشی کراتا ہوں۔۔۔!''

''میاں کیا کہہ رہے ہو۔۔۔؟''(غیاث نے، ہوا ہوائی اور عمران کو ایک ساتھ تعجب سے متوجہ کیا)

''زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں۔۔۔بڑے شہروں میں۔۔۔کھانے پینے۔۔۔گھومنے پھرنے کو عیاشی کہتے ہیں۔۔۔!''

''اچھا۔۔۔!''(تینوں کے لہجے میں مایوسی کا عنصر نمایاں تھا)

''یہ ہے بمبئی کا مشہور بھنڈی بازار۔۔۔!''

''یہاں بھنڈی تو کہیں نظر نہیں آ رہی۔۔۔!''(چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے)

''ابے میرے باپ۔۔۔میں کہاں پھنس گیا۔۔۔اب میں تمہیں اس کا کیا جواب دوں۔۔۔ماسوائے ابّا جی کو یاد کرنے کے''

کچھ تو تنہائی کی راتوں میں سہارا ہوتا
تم نہ ہوتے نہ سہی، ذکر تمہارا ہوتا

یہ یگانہ چنگیزی کا نہیں۔۔۔شاعر رومان اختر شیرانی کا شعر ہے۔۔۔اختر شیرانی بھی ابّا جی کے بڑے چہیتے ہوا کرتے تھے۔۔۔خون کی جگہ۔۔۔عشق و محبت۔۔۔بڑے میاں کی رگوں میں دوڑتا تھا۔۔۔!

''کون بڑے میاں۔۔۔!''

''ابے۔۔۔ابّا جی۔۔۔اور۔۔۔کون۔۔۔یہ لو۔۔۔ایک جنا۔۔۔گاڑی کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھے۔۔۔میں یہ پیکٹ پکڑا کے ابھی آیا۔۔۔کوئی چیز چھیڑنا نہیں۔۔۔!''(مڑ کر ہدایت دیتے ہوئے)

☆

''چل بھئی چل لونڈے ساتھ والی سیٹ پر ہو جا۔۔۔ابے یار۔۔۔اُترنے کی کیا ضرورت ہے۔۔۔یہیں سے اُدھر کو پھسکڑا مار جا۔۔۔اب جناب۔۔۔!ہم چلیں گے سٹوڈیو۔۔۔مگر۔۔۔ایک بات یاد رکھنا۔۔۔کتنا بڑا ہیرو۔۔۔یا۔۔۔کتنی بڑی ہیروئن مل جائے۔۔۔اُسے دیکھ کر۔۔۔اُچھل کود مت کرنا۔۔۔اور۔۔۔نہ۔۔۔آٹوگراف وغیرہ کے چکر میں پڑنا۔۔۔سمجھ آئی۔۔۔!''

''کیوں جی۔۔۔آٹوگراف کیوں نہیں۔۔۔!''

''ابے اس طرح ایکٹر بدک جاتا ہے۔۔۔جب اسے پتہ لگ جائے کہ سامنے والا اس کا فین ہے۔۔۔تو۔۔۔وہ ایکٹنگ شروع کر دیتا ہے۔۔۔یا۔۔۔وہاں سے کھسک جاتا ہے۔۔۔سمجھے۔۔۔!(ساتھ بیٹھے عمران کے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے)اب چلیں۔۔۔!''

''چلیں۔۔۔!''

''اِدھر سے چلیں۔۔۔یا۔۔۔اُدھر سے۔۔۔ہاں بھئی لونڈو۔۔۔کون سا سٹوڈیو دیکھو گے۔۔۔موہن سٹوڈیو اندھیری۔۔۔یا۔۔۔رنجیت سٹوڈیو دادر۔۔۔میرا خیال ہے پہلے چلتے ہیں۔۔۔فینس سٹوڈیو مہالکشمی۔۔۔ایک منٹ۔۔۔ایک منٹ۔۔۔(چند قدم چلنے کے بعد گاڑی کو ریورس گیئر لگاتے ہوئے)اس عمارت کو غور سے دیکھو۔۔۔!اس طرح مزا نہیں آئے گا۔۔۔گاڑی سائڈ پر لگاتا ہوں۔۔۔!''اس گھر کے بارے کچھ بتانے سے پہلے۔۔۔سائل دہلوی کو یاد کرنا ضروری ہو جاتا ہے:

خزاں کا جو گلشن سے پڑ جائے پالا
تو صحنِ چمن میں نہ گل ہو نہ لالہ

کسی زمانے میں یہ گھر۔۔۔رنگ۔۔۔روشنی۔۔۔اور۔۔۔خوشبو کا گہوارا ہوتا تھا۔۔۔بڑے بڑے راجے۔۔۔مہاراجے۔۔۔نواب۔۔۔سیٹھ۔۔۔ساہوکار۔۔۔شیلا کی ایک جھلک دیکھنے۔۔۔اور۔۔۔اُس کا گانا سننے کے لیے ہفتوں۔۔۔مہینوں لائن میں لگا کرتے تب جا کر اُن کی مراد بر آتی۔۔۔!

شیلا کے کوٹھے پر گانا سننے کے آداب۔۔۔اور۔۔۔شرائط کی پابندی لازمی تھی۔۔۔بازاری۔۔۔یا۔۔۔راہ چلتے تماشائی کو۔۔۔شیلا کے کوٹھے کے نزدیک بھی پھٹکنے نہ دیا جاتا۔۔۔شیلا کا مجرا ہفتے میں پانچ دن ہوا کرتا تھا جس میں شرکت کے لیے باقاعدہ درخواست گزاری جاتی۔۔۔دروازہ کے باہر دربان۔۔۔اور۔۔۔دربان کے ساتھ نگہبان۔۔۔کاغذ، قلم دوات لیے گانا سننے کے خواہش مندوں کے کوائف لکھتے ہوئے اُن کی بابت تمام معلومات درج کرتے جن کی جانچ پڑتال۔۔۔زری بائی خود کیا کرتی۔۔۔زری بائی کی منظوری کے بعد۔۔۔گانا سننے کے خواہش مندوں کو آدابِ محفل کی لمبی فہرست تھما دی جاتی۔۔۔!

شیلا کی محفل میں شرکت کے لیے ۔۔۔ اچکن ۔۔۔ شیروانی ۔۔۔ کھلے یا، بند گلے کا کوٹ ۔۔۔ یا ۔۔۔ واسکٹ لازمی تھی ۔۔۔ سر پر ۔۔۔ ترکی ۔۔۔ رامپوری ۔۔۔ حیدرآبادی ۔۔۔ علی گڑھی ٹوپی کے علاوہ ۔۔۔ پگڑی ۔۔۔ صافہ کی ۔۔۔ شرط لازمی تھی ۔۔۔ شیلا کے کوٹھے پر کسی قسم کا نشہ ۔۔۔ مثلاً ۔۔۔ شراب ۔۔۔ سگریٹ ۔۔۔ حقّے کی قطعی ممانعت تھی ۔۔۔ البتہ گلوری نوشِ جان کرنا لازمی شرط تصور کیا جاتا ۔۔۔ چاندی کی طشتری میں ۔۔۔ ایک سے زائد مہذب ۔۔۔ مؤدب ۔۔۔ تہذیب یافتہ خادمین ۔۔۔ حاضرین محفل کے سامنے ۔۔۔ چاندی کے ورق میں لپٹی گلوریوں کے ساتھ ۔۔۔ حیدرآبادی ۔۔۔ مرادآبادی ۔۔۔ لکھنوی زردے ۔۔۔ سونف ۔۔۔ سپاری ۔۔۔ الائچی ۔۔۔ گل قند ۔۔۔ حتیٰ کے متھرا کی قلاقند اتنے سلیقے ۔۔۔ قرینے ۔۔۔ اور ۔۔۔ نفاست سے سجی ہوتی ۔۔۔ کہ ۔۔۔ دیکھنے والے کی اشتہا سوا ہو جاتی ۔۔۔!

زری بائی کے کوٹھے پر پیسے اُچھالنا ۔۔۔ لُٹانا ۔۔۔ یا ۔۔۔ وارنا قطعی طور پر ممنوع تھا ۔۔۔ چاق و چوبند خدمات گار گلوری کی طشتری اُٹھائے ۔۔۔ اشارۂ ابرو کے منتظر رہتے ۔۔۔ جونہی کوئی نگاہ اُن کی نگاہوں سے چار ہوتی ۔۔۔ خادم مستعدی سے اُن کی خدمت میں گلوری کی طشتری بڑھا دیتے ۔۔۔ اور ۔۔۔ وہ صاحب نفاست ۔۔۔ نزاکت سے گلوری اُٹھا کر منہ میں رکھنے کے بعد ۔۔۔ اپنا نذرانہ آہستگی سے طشتری میں رکھ دیتے ۔۔۔!

شیلا کا مجرا دیکھنے ۔۔۔ یا ۔۔۔ شیلا کا گانا سننے کے لیے ۔۔۔ وقت کی پابندی لازمی تھی ۔۔۔ رات نو بجے سے ایک منٹ پہلے ۔۔۔ اور ۔۔۔ گیارہ بجے سے ایک منٹ بعد ۔۔۔ زری بائی کے کوٹھے پر ۔۔۔ کسی قسم کی محفل آرائی ۔۔۔ گانا بجانا کسی نے سنا نہ دیکھا ۔۔۔!

ہندوستان بھر میں بلا کا حسن ۔۔۔ خوبصورتی ۔۔۔ جوبن ۔۔۔ اور ۔۔۔ جوانی رکھنے والی شیلا اپنے کوٹھے سے باہر کبھی مجرا کرنے نہیں گئی ۔۔۔ بڑے بڑے نذرانے ۔۔۔ پیشکش بھی ۔۔۔ شیلا کے پائے استقامت میں لغزش پیدا نہ کر سکے ۔۔۔ مگر ۔۔۔ ایک وقت ایسا بھی آیا ۔۔۔ جب ملک ۔۔۔ اور ۔۔۔ قوم کی خاطر ۔۔۔ شیلا کو اپنے اصولوں کو قربان کرنا پڑا ۔۔۔!

اٹھارہ سو انتالیس میں برطانوی حکومت اور افغانستان کے درمیان جنگ کے نتیجے میں پشین کا علاقہ ۔۔۔ برطانوی حکومت کے قبضے میں آ گیا تھا ۔۔۔ اٹھارہ سو بیالیس میں افغانیوں نے یہ علاقہ برطانوی حکومت سے چھین لیا تھا ۔۔۔ مگر ۔۔۔ اٹھارہ سو اُناسی میں برطانوی حکومت نے دوبارہ پشین کو اپنے تسلط میں لے لیا ۔۔۔ قلعہ عبد اللہ ۔۔۔ پشین کا نہایت اہم علاقہ ہے ۔۔۔ جغرافیائی طور پر بھی ۔۔۔ اور جنگی طور پر بھی ۔۔۔ اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے بعد ۔۔۔ حکومت برطانیہ ۔۔۔ انگریزی محاورے By Hook or By Crook کے مطابق ۔۔۔ ہر قیمت پر برصغیر کو اپنے زیرِ نگیں رکھنے پر بضد تھی ۔۔۔!

ایک خدشہ ۔۔۔ خوف ۔۔۔ بلکہ ۔۔۔ ہوّا ۔۔۔ اُسے روس کا بھی ستا رہا تھا ۔۔۔ تاجِ برطانیہ کو خوف تھا ۔۔۔ کہ ۔۔۔ روسی فوجیں بلوچستان کے مشرق سے داخل ہو کر ۔۔۔ پورے علاقے میں اپنا تسلط جما سکتی ہیں ۔۔۔ لہٰذا ۔۔۔ فوجی نوعیت کے اس علاقے خوجک میں ۔۔۔ ایک سُرنگ بنانے کا فیصلہ کیا گیا ۔۔۔ جس کی لمبائی ۔۔۔ دو اعشاریہ تینتالیس میل لمبی اور ۔۔۔ پانچ اعشاریہ چھ فٹ چوڑی تجویز کی گئی ۔۔۔ مقصود ۔۔۔ اس سرنگ کے ذریعے ۔۔۔ برطانوی فوجوں کی خفیہ نقل و حمل کو دنیا کی نظروں سے پوشیدہ رکھنا تھا ۔۔۔ مذکورہ سُرنگ شمالی ایشیا میں ۔۔۔ طویل ترین سُرنگ بتلائی جاتی ہے ۔۔۔!

اسی طویل ترین سُرنگ ۔۔۔ اور ۔۔۔ ریلوے ٹریک کی تعمیر کے لیے ٹھیکہ اٹھارہ سو نواسی میں کراچی کے واجا دُرّہ خان پلوچ کو جو اصل میں ۔۔۔ باہو نزد قلات کے رہنے والے تھے ۔۔۔ کو دیا گیا ۔۔۔ واجا خان اس سے قبل برطانوی حکومت کی نگرانی ۔۔۔ اور ماتحتی میں ۔۔۔ بلوچستان سے بنگلور ۔۔۔ اور رنگون و برما میں ۔۔۔ ریلوے لائن بچھانے پر برطانوی حکومت سے انعام ۔۔۔ و ۔۔۔ اعزاز حاصل کر چکے تھے ۔۔۔!

برطانیہ کے نامور آرکیٹیکٹ اوگی لوگن کو ۔۔۔ اس سُرنگ کی تعمیر کے لیے خاص طور سے طلب کیا گیا ۔۔۔ اوگی لوگن کی بیگم ۔۔۔ میری جین اٹھارہ سو ستاون کی جنگ آزادی کے خوف ۔۔۔ اور ۔۔۔ بلوچستان کے دور دراز مقام خوجک جانے کے حق میں نہ تھی ۔۔۔ تمام تر دلیلوں ۔۔۔ اور ۔۔۔ تاویلات کو ۔۔۔ نظر انداز کرتے ہوئے ۔۔۔ اوگی لوگن نے ۔۔۔ ذمہ داری قبول کرتے ہوئے ہندوستان آنے کا پروگرام بنایا ۔۔۔ تو ۔۔۔ اُس کی بیگم ۔۔۔ چار و ناچار ۔۔۔ شوہر کے ہمراہ ہندوستان آ گئی ۔۔۔!

واجا خان ایک تجربہ کار ٹھیکیدار کی شہرت کے حامل تھے ۔۔۔ مگر ۔۔۔ خوجک کا نام سنتے ہی ۔۔۔ راج ۔۔۔ مستری ۔۔۔ مزدور ۔۔۔ لوہار ۔۔۔ بڑھئی ۔۔۔ حتیٰ کہ ۔۔۔ بیرے ۔۔۔ خانساے ۔۔۔ مسالچی ۔۔۔ مالی ۔۔۔ جا کی ۔۔۔ نائی ۔۔۔ دھوبی ۔۔۔ موچی ۔۔۔ بھنگی ۔۔۔ سب بدک گئے ۔۔۔ اور ۔۔۔ خوجک آنے سے کترانے لگے ۔۔۔ حکومت برطانیہ کی ترغیبات ۔۔۔ اور ۔۔۔ ترسیلات بھی لوگوں کو خوجک سرنگ میں کام کرنے پر آمادہ نہ کر سکی ۔۔۔ تبھی ۔۔۔ ٹھیکیدار واجا خان پلوچ کے بیٹے ۔۔۔ واجا محمد دُرّہ خان آنریری جج کراچی نے ۔۔۔ برطانوی حکومت کو انوکھی تجویز بھجائی ۔۔۔!

پہلے تو زری بائی نے انگریز حکومت کو صاف صاف انکار کر دیا ۔۔۔ واجا دُرّہ خان کے توسط سے بمبئی کے ڈپٹی کمشنر سروال متھیوز ۔۔۔ جب زری بائی کے پاس خود چل کر گئے ۔۔۔ اور ۔۔۔ کئی طرح کی پیشکش بھی ساتھ لے گئے ۔۔۔ تو ۔۔۔ زری بائی اس شرط پر تیار ہوئی ۔۔۔ کہ شیلا کے لیے ۔۔۔ کھانے پینے ۔۔۔ رہنے سہنے کا خاص انتظام ۔۔۔ و ۔۔۔ انصرام ہونا چاہیے۔

شیلا صبح سویرے سیر کی عادی تھی ۔۔۔ صندل ۔۔۔ آنولہ ۔۔۔ عرقِ گلاب ۔۔۔ اور ۔۔۔ کیوڑے سے نہاتی تھی ۔۔۔ تازہ پھل ۔۔۔ خشک میوے ۔۔۔ سبزی ۔۔۔ دودھ ۔۔۔ دہی ۔۔۔ شہد ۔۔۔ اور ۔۔۔ زیتون کے

علاوہ کچھ نہ کھاتی تھی۔۔۔ برطانوی حکومت نے شیلا کی ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے۔۔۔ شیلا باغ۔۔۔ شیلا باغ سٹیشن۔۔۔ اور۔۔۔ دیگر تمام سہولیات کا انتظام کر کے زری بائی کو معائنے کی دعوت دی جس کے بعد شیلا۔۔۔ سفرِ خوجک کے لیے آمادہ ہوئی۔۔۔ دن بھر مزدور اس سرخوشی میں۔۔۔ جی جان سے محنت کرتے۔۔۔ کہ۔۔۔ رات کو شیلا کا ناچ دیکھنے کو ملے گا۔۔۔!

خوجک سُرنگ کی تعمیر میں سب سے بڑا حصّہ۔۔۔ اس کے انجینئر۔۔۔ اوگی لوگن کا ہے۔۔۔ سرنگ کی تعمیر کے لیے۔۔۔ پہاڑوں کو توڑنے کے لیے دھماکے کیے جاتے تھے۔۔۔ شومئی قسمت۔۔۔ انہیں دھماکوں میں ایک دن۔۔۔ سرنگ کے تعمیر کار اوگی لوگن کی بیوی۔۔۔ میری جین اپنی جان گنوا بیٹھی۔۔۔ خدا کا کرنا دیکھیئے۔۔۔ سُرنگ کی کھدائی کے بعد۔۔۔ اوگی لوگن کو شک گزرا۔۔۔ کہ کھدائی کا زاویہ ٹیڑھا ہے۔۔۔ لہٰذا۔۔۔ اوگی لوگن نے۔۔۔ ناکامی کے خوف سے خودکشی کر لی۔۔۔ تیسرا اہم حصہ شیلا کا ہے۔۔۔ جو۔۔۔ شہرت و ناموری کو ٹھکرا کر ملک اور قوم کے لیے۔۔۔ سنگلاخ پہاڑوں کے بیچ۔۔۔ صرف اس لیے ناچتی رہی۔۔۔ کہ۔۔۔ سُرنگ کے محنت کش۔۔۔ شیلا کی منہ زور جوانی۔۔۔ بے باک جسمانی خطوط۔۔۔ اور۔۔۔ کافر اداؤں کے زیرِ اثر۔۔۔ ہر خطرہ کا مقابلہ کرنے پر۔۔۔ خوشی خوشی آمادہ ہو جاتے۔۔۔!

☆

''باپ رے۔۔۔! بارہ ہونے کو آئے۔۔۔ اور۔۔۔ ہم وہیں کے وہیں ہیں۔۔۔ میرا تو کچھ پینے کو جی کر رہا ہے۔۔۔ کیا پیئو گے۔۔۔ سوڈا واٹر۔۔۔ یا۔۔۔ چائے۔۔۔؟''

''جو آپ پیئو گے۔۔۔ ہم بھی وہی پی لیں گے۔۔۔!''

''بولے تو۔۔۔ تین۔۔۔ (پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے) چار کٹنگ مانگتا۔۔۔ (جیب سے سگریٹ کی ڈبی نکال کر سُلگاتے ہوئے)

سگریٹ کون۔۔۔ کون۔۔۔ پیتا ہے تم میں سے۔۔۔؟

سگریٹ۔۔۔؟ آں۔۔۔ ہم۔۔۔ میں۔۔۔ سے۔۔۔ کوئی نہیں۔۔۔ کوئی بھی نہیں۔۔۔ پیتا۔۔۔ (کوئی ہکلایا۔۔۔ کسی کے چہرے کا رنگ اُڑا۔۔۔ اور۔۔۔ کوئی مصنوعی طریقے سے کھانستے ہوئے گلا صاف کرنے لگا)

''چچا۔۔۔! ایک بات بتائیں۔۔۔؟'' (سگریٹ والی بات کو غائب غلّہ کرتے ہوئے)

''پوچھو۔۔۔!''

''بات بات پہ آپ کہتے ہو۔۔۔ مجھے۔۔۔ شعر ویر نہیں آتے۔۔۔ پھر بھی۔۔۔ شعر سنانا نہیں بھولتے۔۔۔!''

''ابے یار۔۔۔! یہ سب ابّا جی کا خنّاس ہے۔۔۔ وگرنہ میں تو۔۔۔ بولتی غزل کا قائل ہوں۔۔۔ بولتی غزل کا۔۔۔!''

''بولتی غزل''

''سب کچھ آج ہی پوچھے گا۔۔۔ کل کے لیے بھی کچھ چھوڑ دے۔۔۔ یہ لے۔۔۔ تیری باتوں میں راستہ ہی بھول گیا۔۔۔ مگر۔۔۔ نہیں۔۔۔ یہ تو ہم۔۔۔ مہادیو بچہ روڈ کے قریب آ گئے ہیں۔۔۔ بھائی صاحب۔۔۔ اے بھائی صاحب۔۔۔ (راہ گیر کو آواز دیتے ہوئے) آپ بتا سکتے ہیں کہ مہادیو بچہ روڈ کہاں ہے۔۔۔؟''

''رائٹ جا کر۔۔۔ لیفٹ مارنے کا۔۔۔!''

''یہ روڈ مہادیو ہوا جی بچے کے نام سے منسوب ہے۔۔۔!''

''یہ کون صاحب ہیں۔۔۔؟''

''ہیں نہیں۔۔۔ تھے۔۔۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں۔۔۔ ملک کے مختلف علاقوں سے۔۔۔ روزگار کی تلاش میں۔۔۔ لوگ بمبئی آ گئے۔۔۔ اُس زمانے میں۔۔۔ ہوٹل۔۔۔ ریسٹورنٹ۔۔۔ کینٹین۔۔۔ کا چلن نہیں تھا۔۔۔ یا۔۔۔ مزدور۔۔۔ اور۔۔۔ کاریگر۔۔۔ بھوکے رہتے۔۔۔ یا۔۔۔ چنے مُرمُرے کھا کر پیٹ کی آگ بجھاتے۔۔۔ اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے۔۔۔ مہادیو ہوا جی بچے نے اٹھارہ سو پانچ میں لگ بھگ ایک سو آدمی پر مبنی ٹیم کے ساتھ۔۔۔ گھر کا کھانا پہنچانے کا کام شروع کیا۔۔۔ انیس سو تیس کے آتے آتے۔۔۔ نہ صرف اس کام میں تیزی آ گئی۔۔۔ بلکہ۔۔۔ گھر کا کھانا دفتر۔۔۔ یا۔۔۔ کارخانوں میں پہنچانے والوں کی تعداد بھی بڑھ گئی۔۔۔ اس کام کو منظم طریقے سے کرنے کے لیے۔۔۔ بچے صاحب نے۔۔۔ ڈبے والوں کی یونین بنانے کی کوشش شروع کر دی۔۔۔ اور۔۔۔ کچھ ہی دنوں میں۔۔۔ نوتن بمبئی ٹفن سپلائرز ٹرسٹ کے نام سے ایک فلاحی ٹرسٹ بنا لیا گیا۔۔۔!''

لنچ بکس کو۔۔۔ مطلوبہ شخص تک پہنچانے کے لیے کئی طرح کی نشانیاں لگائی جاتی ہیں۔۔۔

۱۔ گاہک کا کوڈ ورڈ

۲۔ مذکورہ سٹیشن کا خاص رنگ

۳۔ ہر سٹیشن سے جانے والے ٹفن کی تعداد

۴۔ ڈبا لینے کے مقام۔۔۔ اور۔۔۔ جمع کرنے کے مقام کا خاص نشان

ہر ڈبے والے کو۔۔۔ دو سائیکل۔۔۔ ٹفن کے لیے لکڑی کا ایک ٹوکرا۔۔۔ سفید کرتا پاجامہ۔۔۔ سفید گاندھی کیپ مہیا کی جاتی ہے۔۔۔ وقت کے ساتھ ٹفن پہنچانے کے معاوضے کا تعین یونین کرتی ہے۔۔۔ کھانا پہنچانے والے کارکن کے لیے ہر قسم کے نشے۔۔۔ بیڑی۔۔۔ سگریٹ۔۔۔ اور۔۔۔ شراب سے پرہیز لازمی گردانا گیا ہے۔۔۔ خلاف ورزی کرنے والے کو جرمانہ۔۔۔ یا۔۔۔ یونین سے الگ کرنے کی سزا بھی دی جا سکتی ہے۔۔۔!

ڈبہ پہنچانے والے کارکن کے لیے آٹھویں جماعت تک تعلیم لازمی ہے۔۔۔ تا کہ وہ ڈبے کا رنگ۔۔۔ نشان۔۔۔ اور۔۔۔ نمبر آسانی سے پڑھ سکے۔۔۔ عام طور پر ایک کارکن سائیکل پر جا کر گھر گھر سے ڈبہ وصول کرتا ہے۔۔۔ اور۔۔۔ مرکزی مقام پر لا کر جمع کرا دیتا ہے۔۔۔ وہاں سے ڈبوں کی چھانٹی ہوتی ہے۔۔۔ اُس کے بعد یہ ڈبے۔۔۔ لوکل ٹرین کے ذریعے منزل

مقصود کی جانب روانہ کیے جاتے ہیں۔۔۔ ہر سٹیشن پر۔۔۔ مطلوبہ ڈبے مقامی ڈبے والے کو سونپ دئے جاتے ہیں۔۔ جو انہیں۔۔۔ اُن کی منزل تک پہنچاتا ہے۔۔۔ اسی طرح خالی ڈبوں کو واپس اُن کی منزل تک پہنچایا جاتا ہے۔۔۔ ایک ڈبہ والا کارکن روزانہ اوسط۔۔۔ چالیس میل کا سفر طے کرتا ہے۔۔۔!

نوتن فلاحی ڈبہ ایسوسی ایشن میں۔۔۔ کل نو ممبر ہوتے ہیں۔۔۔ جو۔۔۔ پانچ سال بعد۔۔۔ تمام ڈبہ ممبران کے ووٹوں سے دوبارہ منتخب کیے جاتے ہیں۔۔۔ نامور مصنف پرمکھ چکرورتی کے مطابق۔۔۔ ڈبہ سروس کی جانب سے۔۔۔ مہینہ۔۔۔ دو مہینہ میں۔۔۔ شاید ایک۔۔۔ یا۔۔۔ دو غلطی کا امکان۔۔۔ یا نشان دہی کی جاتی ہے۔۔۔ جو کہ۔۔۔ چھ لاکھ ڈبوں کے حساب سے نہ ہونے کے برابر ہے۔۔۔!

بمبئی ڈبہ والوں کی یونین چار ستونوں پر کھڑی ہے:

۱۔ ایمانداری
۲۔ وقت کی پابندی
۳۔ باہمی نظم وضبط
۴۔ ثقافتی ہم آہنگی

بمبئی ڈبہ ایسوسی ایشن کی کامیابی کے دو راز بتلائے جاتے ہیں:

۱۔ کام ہی زندگی ہے
۲۔ گاہک شاندار ہے

بمبئی ڈبہ والوں کا مراٹھی زبان میں ایک ترانہ بھی ہے جس کو۔۔۔ تمام کارکن۔۔۔ ٹولیوں کی شکل میں کام کے دوران باجماعت گاتے۔۔۔ اور۔۔۔ اپنے کام سے سچی لگن کا عہد کرتے ہیں۔۔۔!

☆

''یار۔۔۔! آدمی سوچتا کچھ ہے۔۔۔ ہو کچھ جاتا ہے۔۔۔ یا۔۔۔ تمہاری قسمت اچھی ہے۔۔۔ یا۔۔۔ میرا دن خراب ہے۔۔۔ ایک کے بعد ایک اڑچن آ جاتی ہے۔۔۔!''

لو جی۔۔۔ تھا جس کا انتظار۔۔۔ وہ شاہکار آ گیا۔۔۔ یہ ہے فینس سٹوڈیو۔۔۔ کبھی اس کا نام شیراز تھیٹر۔۔۔ پھر۔۔۔ شیراز سٹوڈیو ہو گیا۔۔۔ آج یہ فینس سٹوڈیو کے نام سے جانا جاتا ہے۔۔۔!''

''یہ شیراز کون ہے چچا۔۔۔؟''

''شیراز۔۔۔ آہ۔۔۔ شیراز علی۔۔۔ لمبی کہانی ہے بیٹا جی۔۔۔!''

''شیراز علی ایک جانے مانے فلمساز۔۔۔ تقسیم کار۔۔۔ اور۔۔۔ سرمایہ کار تھے۔۔۔ شیراز علی نے اپنے ادارے کی فلموں میں کئی نامور اداکار۔۔۔ گلوکار۔۔۔ اور۔۔۔ ہدایتکار کو آگے بڑھنے میں مدد دی۔۔۔ مثلاً۔۔۔ شوکت حسین رضوی۔۔۔ لیلا چٹنس۔۔۔ کے۔ سی۔ ڈے۔۔۔ فانی مجومدار۔۔۔ اے۔ آر۔ کاردار وغیرہ۔۔۔ شیراز علی نے کئی مشہور۔۔۔ اور۔۔۔ ہٹ فلمیں پروڈیوس کیں۔۔۔ جن میں سرفہرست انیس سو چوالیس کی سپرہٹ فلم ''زینت'' بھی شامل ہے۔۔۔ زینت شوکت حسین رضوی کی بطور ڈائریکٹر پہلی فلم تھی۔۔۔ اس سے پہلے وہ فلم ایڈیٹر کے طور پر جانے جاتے تھے۔۔۔ زینت فلم کی تکمیل کے دوران ہی شوکت حسین رضوی۔۔۔ اور۔۔۔ نور جہاں کی محبت پروان چڑھی۔۔۔ ازاں بعد شادی کی صورت نمایاں ہوئی۔۔۔!

زینت فلم میں نخشب جارچوی کی لکھی قوالی:

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا

''بہت مشہور ہوئی۔۔۔ اس قوالی کے حوالے سے بھی دلچسپ قصّہ سنتے چلو۔۔۔!''

''وہ کیا۔۔۔!''

''ایک مرتبہ۔۔۔ بڑے میاں کے ساتھ فیض عام کالج میرٹھ کے مشاعرے میں جانے کا اتفاق ہوا۔۔۔!''

''بڑے میاں کون۔۔۔؟''

''میرے ابّا جی۔۔۔ اور۔۔۔ کون۔۔۔ باتوں باتوں میں۔۔۔ فلم زینت کی قوالی زیر بحث آئی۔۔۔ تو۔۔۔ مشہور شاعر روش صدیقی نے نخشب جارچوی کے خوب لتّے لیے۔۔۔!

''وہ کیوں۔۔۔؟''

''کہنے لگے۔۔۔ کوئی مجھے یہ بتلا دے۔۔۔ کہ۔۔۔ نخشب جارچوی کے کتنے ہاتھ ہیں۔۔۔؟''

''مطلب۔۔۔؟''

جب ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا۔۔۔ تو۔۔۔ دل کا ہے سے پکڑا۔۔۔؟ ۔۔۔ بے خیالی میں میرے منہ سے نکل گیا کہ یہ تو ٹھیک بات ہے۔۔۔ بس جی پھر کیا تھا۔۔۔ روش صاحب۔۔۔ نخشب کو چھوڑ۔۔۔ میرے پیچھے پڑ گئے۔۔۔!''

''وہ کیوں۔۔۔؟''

''بولے۔۔۔ میاں اگر غلطی نخشب نے کی ہے۔۔۔ تو۔۔۔ اُس کی گرفت بھی۔۔۔ اُسی کینڈے کا شخص کر سکتا ہے۔۔۔ کسی ہما شما کو اس کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔۔۔ اب تو جان تبھی چھوٹے گی۔۔۔ جب نخشب کا مصرعہ درست کر کے بتلاؤ گے۔۔۔!''

''اچھا جی۔۔۔ پھر کر دیا آپ نے۔۔۔!''

''ابے بھائی۔۔۔ میرے تو پسینے چھوٹ گئے۔۔۔ بغلیں جھانکنے کے سوا۔۔۔ کوئی چارہ نہ تھا۔۔۔ خدا معلوم میرے اندر کہاں سے جرأت آ گئی۔۔۔ آؤ دیکھا نہ تاؤ۔۔۔ تاڑ سے خود ساختہ شعر جڑ دیا۔۔۔!''

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کیے کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا
ہم غم کے بھنور میں ڈوب گئے ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا

''پھر کیا ہوا۔۔۔؟''

''ہونا کیا تھا۔۔۔ مبارک۔۔۔ سلامت کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔۔۔ ہرکوئی۔۔۔ ابّا جی کو۔۔۔ مبارک دے رہا تھا۔۔۔!''

''کس بات کی۔۔۔؟''

''اللہ جانے۔۔۔! بات ہو رہی تھی۔۔۔ شیراز علی کی فلم زینت کی۔۔۔ زینت کی کامیابی کے بعد۔۔۔ شیراز علی نے فلم ''پھول'' بنانے کا اعلان کیا۔۔۔ شیراز علی کے پرانے کرم فرما۔۔۔ اور۔۔۔ اپنے وقت کے سپر سٹار نذیر صاحب نے۔۔۔ شیراز علی پر زور دیا۔۔۔ کہ۔۔۔ وہ کسی نہ کسی طرح۔۔۔ نذیر صاحب کے بھانجے۔۔۔ کریم الدین آصف کو چانس دے۔۔۔ شیراز علی نے نذیر صاحب کی بات مانتے ہوئے۔۔۔ کریم الدین آصف کو۔۔۔ کے۔ آصف کا نام دے کر۔۔۔ اپنی فلم ''پھول'' کی ہدایت سونپ دی۔۔۔! ''پھول'' انیس سو پینتالیس کی سپر ہٹ فلم ثابت ہوئی۔۔۔ کے۔ آصف کی کام سے لگن۔۔۔ اور۔۔۔ فنی مہارت کو دیکھتے ہوئے۔۔۔ شیراز علی نے۔۔۔ کے۔ آصف کی ہدایت میں ''انارکلی'' بنانے کا اعلان کیا۔۔۔ ''انارکلی'' امتیاز علی تاج کے ڈرامے ''انارکلی'' سے ماخوذ تھی۔۔۔ لہٰذا۔۔۔ شیراز علی نے۔۔۔ ''انارکلی'' کا نام تبدیل کر کے ''مغلِ اعظم'' کر دیا۔۔۔ چندر موہن۔۔۔ نرگس۔۔۔ وینا۔۔۔ اور۔۔۔ سپرو۔۔۔ مغلِ اعظم کے اہم اداکار تھے۔۔۔ درگا کھوٹے جودھا بائی کا کردار نبھا رہی تھیں۔۔۔ میوزک ڈائریکٹر کی ذمہ داری انل بسواس۔۔۔ کو سونپی گئی۔۔۔ کہانی منظر نامہ مکالمے۔۔۔ کمال امروہی۔۔۔ وجاہت مرزا۔۔۔ احسان رضوی۔۔۔ اور۔۔۔ امان مرزا لکھ رہے تھے۔۔۔ مغلِ اعظم کی شوٹنگ انیس سو چھیالیس میں شروع ہو گئی۔۔۔ اور۔۔۔ انیس سو سینتالیس کے آتے آتے۔۔۔ فلم کی قریب بارہ ریلیں تیار ہو چکی تھیں۔۔۔ ملک کے بٹوارے کے سبب فلموں کا کام بری طرح متاثر ہوا۔۔۔ انہیں دنوں شوکت حسین رضوی نے بطور فلمساز۔۔۔ اور۔۔۔ ہدایتکار۔۔۔ دلیپ کمار۔۔۔ اور۔۔۔ نور جہاں کو لے کر۔۔۔ ''جگنو'' بنائی۔۔۔ ''جگنو'' سپر ہٹ ثابت ہوئی۔۔۔ اور۔۔۔ دلیپ کمار راتوں رات سپر سٹار بن گئے۔۔۔ اُدھر۔۔۔ چندر موہن کے انتقال کے باعث کے۔ آصف شہزادہ سلیم کے کردار کے لیے موزوں اداکار کی تلاش میں تھے۔۔۔ دلیپ کمار نے پچیس ہزار کی خطیر رقم ایڈوانس لے کر۔۔۔ مغلِ اعظم سائن کر لی۔۔۔ اس کے باوجود۔۔۔ کے آصف دلیپ کمار کو شہزادہ سلیم کے کردار میں قبول کرنے میں پس وپیش کر رہے تھے۔۔۔ اُن کی خواہش شیام کو شہزادہ سلیم بنانے کی تھی۔۔۔ شیام نے وعدہ بھی کر لیا تھا۔۔۔ مگر۔۔۔ اُن کی زندگی نے وفا نہ کی۔۔۔!

ہندوستان کی تقسیم سے نیا ملک پاکستان وجود میں آ گیا تھا۔۔۔ شیراز علی مسلم لیگ کے پُر جوش کارکن۔۔۔ اور۔۔۔ قائداعظم محمد علی جناح کے قریبی ساتھی سمجھے جاتے تھے۔۔۔ لہٰذا۔۔۔ اُن کا بمبئی میں رہنا اُس وقت ناممکن ہو گیا جب کٹر ہندوؤں نے شیراز علی کے سٹوڈیو کو آگ لگا دی۔۔۔ شیراز علی بمبئی سے پاکستان جاتے وقت اپنی پراپرٹی بے نام چھوڑ گئے تھے۔۔۔ حالات میں جب ٹھہراؤ آیا۔۔۔ تو۔۔۔ انیس سو اکیاون میں کے۔ آصف نے مغلِ اعظم کو نئے سرے سے بنانے کا اعلان کیا۔۔۔ شیراز علی نے اس کے فوری بعد۔۔۔ بمبئی آئے اور اپنے قریبی دوست۔۔۔ نامور بزنس مین شاہ پور جی مستری سے بات چیت کر کے۔۔۔ بمبئی میں اپنی جائیداد۔۔۔ اور۔۔۔ اثاثوں کو شاہ پور جی مستری کے حوالے اس شرط کے ساتھ کیا۔۔۔ کہ۔۔۔ شاہ پور جی نہ صرف فینس سٹوڈیو کی تعمیر نو کریں گے۔۔۔ بلکہ۔۔۔ مغلِ اعظم کو بھی پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے۔۔۔ شاہ پور مستری جی۔۔۔ مغلوں، خاص طور سے بادشاہ اکبر کے بہت مداح تھے۔۔۔ لہٰذا۔۔۔ انہوں نے یہ ذمہ داری خوشی خوشی قبول کر لی۔

مغلِ اعظم کی تکمیل۔۔۔ اور۔۔۔ ریلیز کے وقت شیراز علی کو بمبئی مدعو کیا گیا جہاں محکمہ انکم ٹیکس نے شیراز علی کو۔۔۔ عدم ادائیگی انکم ٹیکس کے سبب گرفتار کر لیا۔۔۔ شیراز علی کئی مہینوں تک ہندوستانی جیل میں مقید رہے۔۔۔ شیراز علی کے دوستوں شاہ پور جی مستری۔۔۔ دلیپ کمار۔۔۔ کے۔ آصف نے شیراز علی کو ضمانت پر رہا کرایا۔۔۔ مگر۔۔۔ شیراز علی پر ملک چھوڑنے کی پابندی برقرار تھی۔۔۔ پھر پاکستان سے شیراز علی کے بیٹے سعید شیراز کرکٹ میچ دیکھنے کی غرض سے ہندوستان آئے۔۔۔ اور۔۔۔ تمام قانونی کارروائی مکمل کرنے کے بعد اپنے والد کو پاکستان لے گئے۔۔۔ شیراز علی انیس سو بہتر میں کراچی میں انتقال کر گئے۔۔۔ آہ ساغر نظامی:

روح بلبل نے خزاں بن کے اُجاڑا گلشن
پھول کہتے رہے ہم پھول ہیں صیاد نہیں

☆

''ابے لونڈوں۔۔۔ بھوک ڈوک لگی ہے۔۔۔ کہ نہیں۔۔۔؟''

''سچی بات ہے۔۔۔ اب تو۔۔۔ بھوک کے بعد پیٹ میں۔۔۔ چوہوں کی دھما چوکڑی مچی ہوئی ہے۔۔۔!''

''چند منٹوں کی بات ہے۔۔۔ حاجی علی کی درگاہ کی حلیم بریانی کھا کر۔۔۔ سب چوہے بلّے۔۔۔ رفو چکّر ہو جائیں گے۔۔۔!''

''حاجی علی کی درگاہ۔۔۔؟''

''بس ذرا سے فاصلے پر ہے۔۔۔ حاجی علی کی درگاہ۔۔۔!''

''کبھی نام نہیں سنا۔۔۔؟''

''حاجی علی بخارا کے صاحبِ حیثیت تاجر تھے۔۔۔ ایک دن انہوں نے دیکھا کہ ایک غریب عورت۔۔۔ ہاتھ میں خالی برتن لیے۔۔۔ سڑک پر چلاتی جا رہی ہے۔۔۔ حاجی علی نے عورت کو روک کر چلّانے کی وجہ دریافت کی۔۔۔ تو۔۔۔ خاتون نے بتلایا کہ اس برتن میں تیل لے کر جا رہی تھی کہ اُس کا پیر پھسلا۔۔۔ اور۔۔۔ سارا تیل بہہ گیا۔۔۔ جس پر اس کے شوہر نے بہت تشدد کیا۔۔۔ حاجی علی نے عورت کی روداد سن کر اپنی انگلی زمین پر دبائی۔۔۔ تو۔۔۔ زمین سے تیل اُبلنے لگا۔۔۔ خاتون نے خوشی خوشی خالی برتن۔۔۔ تیل سے بھرا۔۔۔ اور۔۔۔ اپنے گھر کی راہ لی۔۔۔ رات کو خواب میں پیر علی شاہ نے دیکھا۔۔۔ کہ۔۔۔ زخمی زمین۔۔۔ پیر علی شاہ کے جبر کے باعث۔۔۔ زار و قطار

رورہی ہے۔۔۔!

اُس دن کے بعد پیر علی شاہ نے اپنا مال مطع غریبوں میں تقسیم کر کے والدہ سے اجازت طلب کی۔۔۔اور۔۔۔حجِ سعید کی سعادت حاصل کرنے کی غرض سے مکّے کی راہ لی۔۔۔اس سفر میں پیر علی شاہ کے چھوٹے بھائی بھی اُن کے ہمرکاب تھے۔۔۔دونوں بھائی حج کی سعادت حاصل کرنے کے بعد۔۔۔دنیا کی سیاحت کرتے ہوئے بمبئی پہنچے۔۔۔اور۔۔۔سمندر کے بیچ و بیچ ورلی کے سامنے والی پہاڑی پر مستقل قیام کر لیا۔۔۔کچھ عرصہ بعد بھائی نے پیر حاجی علی سے واپس چلنے کی درخواست کی۔۔۔تو۔۔۔انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا۔۔۔ کہ۔۔۔وہ زندگی بھر یہیں رہ کر۔۔۔اسلام کی تبلیغ کریں گے۔۔۔پیر حاجی علی کا جواب سن کر۔۔۔بھائی نے رخصت کی اجازت چاہی۔۔۔پیر حاجی علی نے خوشی خوشی بھائی کو رخصت کیا۔۔۔اور۔۔۔اللہ کی یاد میں غرق ہو گئے۔۔۔دن گزرے۔۔۔مہینے۔۔۔اور سال۔۔۔حاجی علی کی حیثیت و مرتبہ۔۔۔بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔۔۔اور۔۔۔ایک وقت ایسا آیا۔۔۔کہ۔۔۔پیر حاجی علی کا مسکن مرجعۂ خلائق کی حیثیت اختیار کر گیا۔۔۔!

چودہ سو اکتیس عیسوی میں اپنے انتقال سے قبل۔۔۔پیر حاجی علی نے وصیت کی کہ اُن کے جسدِ خاکی کو سپردِ خاک کرنے کے بجائے۔۔۔عین اُسی جگہ۔۔۔سپردِ آب کیا جائے۔۔۔جہاں سمندر کے بیچ و بیچ پہاڑی پر اُن کا مسکن ہے۔۔۔پہلے پہل تو۔۔۔زائرین۔۔۔اور معتقدین۔۔۔پیر حاجی علی کے مسکن پر زیارت۔۔۔دعا۔۔۔درود کے لیے حاضر ہوتے۔۔۔پندرہویں صدی کے آخر تک۔۔۔اپنی مدد آپ کے تحت پیر حاجی علی کا مزار سمندر کے بیچ و بیچ اُسی مقام پر تعمیر ہوا۔۔۔جہاں پیر حاجی علی کا مسکن تھا۔۔۔!

ہر جمعرات۔۔۔ ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی۔۔۔ اور۔۔۔ دیگر مذاہب کے ماننے والے۔۔۔اور۔۔۔ جمعہ کے روز۔۔۔بمبئی۔۔۔اور۔۔۔ گردونواح سے بڑی تعداد میں معتقدین۔۔۔عقیدت و احترام سے پیر حاجی علی کے مزار پر۔۔۔ نذر و نیاز چڑھاتے۔۔۔ اور۔۔۔ من کی مرادیں پاتے ہیں۔۔۔یہ سلسلہ۔۔۔صدیوں سے جاری و ساری ہے۔۔۔شاید۔۔۔صدیوں تک جاری و ساری رہے گا۔۔۔اس موقع پر بہزاد لکھنوی کا یاد آنا بذاتِ خود حاجی علی کے جذبۂ حق و صداقت کی دلیل ہے:

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آ جائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے
اے رہبر کامل چلنے کو تیار تو ہوں پر یاد رہے
اس وقت مجھے بھٹکا دینا جب سامنے منزل آ جائے

☆

''اماں۔۔۔!دیکھ کے چلو بھائی۔۔۔اللہ نے آنکھیں دیکھنے کے لیے دی ہیں۔۔۔!''

''درست فرمایا آپ نے۔۔۔دیکھنے۔۔۔ بلکہ پہچاننے کے بعد ہی ٹکرایا ہوں۔۔۔!''

''اماں تم۔۔۔!''

''نہیں۔۔۔کُتے کی دم۔۔۔!''(گلے ملتے ہوئے)

''ایک دم سے غائب ہو گئے۔۔۔نہ دعا۔۔۔نہ سلام۔۔۔!''

''ٹھیک کہتے ہو مبین میاں۔۔۔قصّہ یوں ہے۔۔۔چھوڑ و ساری باتوں کو۔۔۔بیڑی نکالو۔۔۔بیڑی۔۔۔؟''

''بیڑی تو کب کی چھوڑ دی۔۔۔اب تو۔۔۔کیونڈر پیتے ہیں کیونڈر۔۔۔!''(جیب سے پیکٹ نکالتے ہوئے)

''آؤ کہیں بیٹھ کے۔۔۔گپ شپ لگاتے ہیں۔۔۔ساتھ میں چائے بھی پیتے ہیں۔۔۔!''

''وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔(منہ اور ناک سے سگریٹ کا دھواں نکالتے ہوئے)میرے ساتھ مہمان ہیں۔۔۔وگرنہ ضرور چلتا۔۔۔!''

''مہمان۔۔۔کون مہمان۔۔۔یہ بچے۔۔۔؟''

''جی۔۔۔جی۔۔۔بچے۔۔۔!''

''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔۔۔تعارف تو کراؤ بچوں سے۔۔۔!''

''بس یوں سمجھ لو بھتیجے ہیں میرے۔۔۔!''

''تینوں۔۔۔!''

(کچھ توقف کے بعد)''ہاں۔۔۔تینوں۔۔۔!''

''کس سلسلے میں آئے ہیں بمبئی۔۔۔؟''

''سیر سپاٹا۔۔۔!''

''کیوں بھئی بچو۔۔۔کیا کچھ دیکھا۔۔۔ہمیں بھی تو بتاؤ۔۔۔؟''

''ارے بھئی یہ پوچھو۔۔۔کیا کچھ نہیں دیکھا۔۔۔!''(جملہ اُچکتے ہوئے ہوا ہوائی نے جواب دیا)

''مثلاً۔۔۔!''

''مثلاً۔۔۔شیلا کا کوٹھا۔۔۔!''

''بہت اچھے۔۔۔!''

''ماداؤ جی بچے کی حویلی۔۔۔!''

''یہ سیر سپاٹا ہے۔۔۔یا۔۔۔آثارِ قدیمہ کا سروے۔۔۔!''

''نہیں بھئی۔۔۔ایسی بھی بات نہیں۔۔۔ابھی فینس سٹوڈیو سے آ رہے ہیں فلم کی شوٹنگ دیکھ کر۔۔۔!''

''ہوں۔۔۔اچھا۔۔۔یہ ہوئی نا بات۔۔۔اور بتاؤ۔۔۔اور۔۔۔!''

''اور۔۔۔ اور بس۔۔۔ ابھی حاجی علی کے مزار پر حلیم بریانی کھائی۔۔۔اور۔۔۔تم سے ملاقات ہو گئی۔۔۔!''

''یعنی مجھے بھی دیکھ لیا۔۔۔لگے ہاتھوں۔۔۔!''

''کم از کم تم۔۔۔آثارِ قدیمہ نہیں ہو۔۔۔!''

''یہ تو درست کہا تم نے۔۔۔میں آثارِ قدیمہ تو ہرگز نہیں ہوں۔۔۔یاد

آیا۔۔۔آج شام فلم فیئر کے پہلے ایوارڈ کی تقریب ہورہی ہے۔۔۔!''

''معلوم ہے۔۔۔خوب معلوم ہے۔۔۔ اگر یہ لونڈے نہ آئے ہوتے۔۔۔تو۔۔۔ مجھے بھی وہیں ہونا تھا۔۔۔!''

''کہو تو چلیں۔۔۔ بچے بھی خوش ہو جائیں گے۔۔۔ کیوں بھئی لونڈوں۔۔۔فلم ولم کا شوق ہے۔۔۔کہ نہیں۔۔۔؟''(تینوں لڑکوں نے زبان کے بجائے سر ہلا کر جواب دیا)

''اماں وہ تو ٹھیک ہے۔۔۔مگر۔۔۔پاس کہاں سے آئیں گے۔۔۔ ایک نہیں۔۔۔دو نہیں۔۔۔پورے پانچ۔۔۔!''

''میاں۔۔۔پاس واس کی ماں کا۔۔۔اگر ادریس دہلوی کو بھی پاس کی ضرورت ہے۔۔۔تو۔۔۔لعنت ہے ایسی صحافت۔۔۔اور۔۔۔ایسے مراسم پر۔۔۔تم چلو تو سہی۔۔۔اگر کسی مادر۔۔۔نے لفظ پاس کا ذکر بھی کیا ناں۔۔۔ تو۔۔۔پہلی فرصت میں دہلی جا کر''شمع'' رسالے کے دفتر کو آگ لگاؤں گا۔۔۔ اور۔۔۔دھونی رما کے بیٹھ جاؤں گا۔۔۔''

''قسم خدا کی۔۔۔!''تم نے ہماری محبت دیکھی ہے۔۔۔غصہ نہیں دیکھا۔۔۔دہلوی تو ہم دونسلوں پہلے بنے ہیں۔۔۔وگرنہ مرزا غالب کی طرح ہمیں بھی صحافی سے زیادہ۔۔۔سپاہی ہونے پر فخر کے ساتھ۔۔۔غرور بھی ہے۔۔۔!

سَو پشت سے ہے پیشۂ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے

☆

فلم فیئر ایوارڈ۔۔۔ ہندوستان کا سب سے مشہور۔۔۔اور۔۔۔قابل اعتماد ایوارڈ تصور کیا جاتا ہے۔۔۔ یہ ایوارڈ اُنیس سو پچّن میں ٹائمز گروپ کے رسالے''فلم فیئر'' کے ذریعہ بمبئی کے میٹرو تھیٹر میں پہلی بار پیش کیے گئے۔۔۔ اس سے پہلے یہ ایوارڈ۔۔۔ٹائمز آف انڈیا کے مدیر کلیئر مینڈوکا کے نام پر''کلیئر ایوارڈ'' کے نام سے پیش کی جاتا تھا۔۔۔انیس سو چھپن میں۔۔۔ بھارت سرکار کے پینل کے علاوہ۔۔۔عوامی خدمات کے مخصوص شعبوں کے نمائندہ افراد پر ایک کمیٹی ایوارڈ دینے کا فیصلہ کرنے لگی۔۔۔ پہلے یہ پروگرام ایک ڈاکومنٹری کے ذریعہ سینما گھروں میں فلم کے چلنے سے قبل دکھایا جاتا تھا۔۔۔ فلمساز۔۔۔ ہدایتکار۔۔۔اداکار۔۔۔اور۔۔۔اداکاراؤں کے علاوہ وقت گزرنے کے ساتھ دیگر تکنیکی اور تخلیقی شعبے بھی اس میں شامل ہوتے گئے۔۔۔!

اکیس مارچ انیس سو پچّن میں پہلے فلم فیئر ایوارڈ کا فیصلہ کسی کمیٹی کے بجائے۔۔۔عوام کے نامور فلم بین۔۔۔اور۔۔۔فلم پارکھوں کے ووٹ کے ذریعہ کیا گیا۔۔۔بیس ہزار نامور لوگوں کی اکثریت نے جن پانچ لوگوں کو انعام کا حقدار ٹھہرایا ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔	بہترین فلم	دو بیگھا زمین
۲۔	بہترین ہدایتکار	بمل رائے۔۔۔دو بیگھا زمین
۳۔	بہترین اداکار	دلیپ کمار۔۔۔فلم داغ
۴۔	بہترین اداکارہ	مینا کماری۔۔۔فلم بیجو باورا
۵۔	بہترین موسیقار	نوشاد۔۔۔فلم بیجو باورا

مذکورہ بالا تمام ایوارڈ ہالی وُڈ کے نامور اداکار گریگری پیک کے ہاتھوں جیتنے والوں کی خدمت میں پیش کیے جانے تھے۔۔۔کولمبو میں موسم خراب ہونے کے باعث گریگری پیک۔۔۔ وقت پر بمبئی نہ پہنچ سکے۔۔۔اس ہنگامی صورت حال میں۔۔۔مہمانِ خصوصی۔۔۔ پنڈت جواہر لال نہرو وزیر اعظم ہند سے درخواست کی گئی۔۔۔ پنڈت جی کا فنون لطیفہ سے عشق کام آیا۔۔۔اور۔۔۔ پنڈت جی نے نہ صرف جیتنے والوں میں۔۔۔ایوارڈ تقسیم کیے۔۔۔ بلکہ۔۔۔ تقریب کی ریڈ کارپٹ استقبالی رسم کا اجرا بھی کیا۔۔۔!

ایک روایت کے مطابق۔۔۔پنڈت جی کو پہلی فلم فیئر تقریب میں مدعو کرنے کی غرض سے جب ایک وفد دہلی گیا۔۔۔تو۔۔۔ناسازیٔ طبع کے باعث پنڈت جی نے تقریب میں شرکت سے معذرت کرتے ہوئے۔۔۔ اپنی جگہ۔۔۔مراری جی ڈیسائی کو یہ ذمہ داری نبھانے کی تاکید کی تھی۔۔۔مگر۔۔۔ تقریب کے آغاز سے کچھ دیر قبل۔۔۔ پنڈت جواہر لال نہرو۔۔۔اچانک لاؤ لشکر کے ساتھ تقریب میں نمودار ہوئے۔۔۔تو۔۔۔شرکائے محفل۔۔۔انعام جیتنے والے فنکار۔۔۔اور۔۔۔انتظامیہ کی خوشی دیکھنے کے لائق تھی۔۔۔دلیپ کمار۔۔۔دیو آنند۔۔۔راج کپور۔۔۔پران۔۔۔ پریم ناتھ۔۔۔پرتھوی راج کپور۔۔۔ موتی لال کے علاوہ نرگس۔۔۔ مینا کماری۔۔۔ وجنتی مالا۔۔۔ نوتن۔۔۔مدھو بالا نے آگے بڑھ کر پنڈت جی کا استقبال کرتے ہوئے۔۔۔ اپنی اپنی اُفتادِ طبع کے مطابق کلماتِ حسن کہے۔۔۔مگر۔۔۔اداکارہ نرگس۔۔۔ اور۔۔۔ پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان ہونے والے مکالمہ۔۔۔ بالی وڈ فلم انڈسٹری کے سنہرے مکالموں میں شمار کیا جاتا ہے۔۔۔اداکارہ نرگس نے۔۔۔ بغیر کسی تمہید۔۔۔اور۔۔۔ پروٹوکول کے۔۔۔نہرو جی کے نزدیک جا کر انتہائی بے تکلفی سے کہا:

اطلاع ملی تھی کہ آپ کی طبیعت ناساز ہے۔۔۔آپ تو ماشاء اللہ ہشاش بشاش نظر آرہے ہیں۔۔۔!(پنڈت جی نے اداکارہ نرگس کے سوال پر بے ساختہ شعر پڑھا)

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

ایک لمحے کے لیے۔۔۔اداکارہ نرگس کے چہرے پر حیا کی لالی نمودار ہوئی۔۔۔مگر۔۔۔دوسرے ہی لمحے نرگس نے پنڈت جی کے شعر کا جواب شعر سے دے کر۔۔۔شرکائے تقریب کے ساتھ وزیر اعظم جواہر لال نہرو کو بھی خوشگوار حیرت سے دوچار کر دیا:

زندگی میں دو ہی لمحے مجھ پہ گزرے ہیں کٹھن
اک تیرے آنے سے پہلے اک تیرے جانے کے بعد

قرض

برنارڈ میلامڈ (امریکہ)
۔ ترجمہ ۔
جاوید بسام (کراچی)

برنارڈ میلامڈ (1914-1986)، بیسویں صدی کا ایک اہم امریکی ناول نگار اور افسانہ نگار تھا، نیویارک میں پیدا ہوا، والدین یہودی تارکین وطن تھے۔ جو روس سے آئے تھے۔ اس نے بروکلین اور کولمبیا یونیورسٹی کے ایوننگ اسکول سے گریجویشن کیا۔ اس نے بہت پراثر ناول اور افسانے لکھے۔ کہانیوں کے مجموعے دی مجک بیرل 1958 سے اس کی شہرت کا آغاز ہوا۔ اپنی تحریروں میں میلامڈ نے امریکی کساد بازاری، یہودی تارکین وطن کی مایوسی، مشکلات اور غربت کے باوجود ان کے خوابوں، امیدوں اور جدوجہد کی دیانت دارانہ تصویر کشی کی ہے۔ میلامڈ کے ہیرو عام لوگ ہیں جو دنیا میں خراب قسمت لے کر آتے ہیں اور اپنی زندگیوں کو بہتر بنانے کے لیے جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کے آٹھ ناول اور چار کہانیوں کے مجموعے شائع ہوئے۔ اسے پلٹزر پرائز، دو نیشنل بک ایوارڈ اور امریکن اکیڈمی آف آرٹس اینڈ لیٹرز کا گولڈ میڈل بھی ملا تھا۔

☆

نانبائی لوئب کے تندور میں سفید روٹیاں ابھی بھوری نہیں ہوئی تھیں، مگر خریدار پہلے ہی اس کی اشتہا انگیز خوشبو سے متاثر ہو کر وہاں چلے آئے تھے۔ لوئب کی دوسری بیوی "بیسی" کاؤنٹر کے پیچھے تیاری میں مصروف تھی۔ اس نے لوگوں کے درمیان ایک اجنبی خستہ حال شخص کو دیکھا جو گیند بازوں کی ٹوپی پہنے کھڑا تھا۔ اگرچہ وہ پراعتماد لوگوں کے ہجوم کے درمیان کافی بے ضرر دکھائی دے رہا تھا، لیکن بیسی بے چین ہوگئی اور استفساری نظروں سے اسے دیکھنے لگی، لیکن وہ کچھ نہ بولا فقط اپنا سر جھکایا، جیسے اس سے پریشان نہ ہونے کی التجا کر رہا ہو اور کہہ رہا ہو وہ انتظار کر لے گا۔ اس کا چہرہ کسی اندرونی کرب سے بگڑا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ بدقسمتی اس پر عرصہ دراز سے حاوی ہے۔ جس نے اسے مکمل طور پر تباہ کر دیا ہے۔ بیسی نے اس سے خوف محسوس کیا۔ اس نے جلدی سے گاہکوں کو نمٹایا اور جیسے ہی آخری گاہک اسٹور سے نکلا، اس نے دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔

اجنبی نے اپنی ٹوپی سر سے اٹھائی اور بولا۔ ''معاف کیجیے گا، میں کوبُوسکی ہوں۔ کیا نانبائی لوئب گھر پر ہے؟''

''کون کوبُوسکی؟'' بیسی نے پوچھا۔

''ہم پرانے دوست ہیں۔'' وہ بولا۔ اس جواب نے بیسی کو مزید خوفزدہ کر دیا۔

''تم کہاں سے آئے ہو؟''

''ہم ایک ہی قصبے میں رہتے تھے۔'' اجنبی نے جواب دیا۔

''لوئب سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟'' بیسی نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

سوال ناگوار تھا۔ کوبُوسکی نے خاموش رہنے کا فیصلہ کیا۔

غالباً آوازوں کی بازگشت سن کر نانبائی پچھلے دروازے سے دکان میں داخل ہوا۔ وہ اوپر آدھی آستین کا بنیان پہنے ہوئے تھا اور اس کے پُرگوشت سرخ بازو کہنی تک آٹے میں لتھڑے ہوئے تھے۔ اس نے نان بائیوں کی ٹوپی کے بجائے آٹے سے بھرا کاغذی تھیلا اپنے سر پر الٹا چڑھا رکھا تھا۔ جس سے جھڑ کر آٹا اس کے چہرے اور عینک کے شیشوں پر چلا آیا تھا اور اس کا حیرت زدہ چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ وہ ایک موٹا اور توندل آدمی تھا اور بھوت سے مشابہہ لگ رہا تھا۔ حالانکہ یہ کوبُوسکی تھا جو اچانک کسی بھوت کی طرح ظاہر ہوا تھا۔

نانبائی کچھ لمحے تک اسے تکتا رہا پھر پہچان کر سسکاری بھری اور بولا۔ ''کوبُوسکی!۔۔۔''

آخرکار، پرانے دوست کو وہ گزرے دن یاد آ گئے تھے۔ جب دونوں جوان تھے اور ہمیشہ ساتھ رہتے تھے۔ جذبات کی زیادتی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، لیکن اس نے انہیں ہاتھ سے صاف نہیں کیا۔

کوبُوسکی نے اپنی ٹوپی اتاری اور صاف رومال اپنی سوجی ہوئی پیشانی پر پھیرا۔ جہاں لوئب کے سفید بال تھے۔ وہاں اس کا گنجا سر چمک رہا تھا۔

لوئب نے اسٹول بڑھایا اور بولا۔ ''کوبُوسکی بیٹھ جاؤ۔''

''یہاں نہیں۔'' بیسی بڑبڑائی پھر فوراً وضاحت کی۔ ''یہ رات کے کھانے کا وقت ہے۔ کسی وقت بھی گاہک آ سکتے ہیں۔''

''یقیناً، یہاں بہتر نہیں رہے گا۔'' کوبُوسکی نے سر ہلایا۔

اس نے اس بات پر اطمینان محسوس کیا کہ اب کوئی ان کی باتوں کے درمیان مداخلت نہیں کرے گا۔ دونوں دوست پچھلے کمرے میں چلے گئے، لیکن جب بیسی نے دیکھا کہ کوئی خریدار نہیں ہے تو وہ بھی ان کے پیچھے چلی آئی۔

کوبُوسکی اپنا کالا کوٹ اور ٹوپی اتارے بغیر ایک کونے میں رکھے اونچے اسٹول پر بیٹھ گیا اور سر جھکا کر ابھری ہوئی سرمئی رگوں والے ہاتھ اپنے استخوانی گھٹنوں پر رکھ لیے۔ لوئب آٹے کی بوری پر بیٹھا موٹے شیشوں کے پیچھے سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بیسی نے کان لگا رکھے تھے، لیکن مہمان خاموش تھا۔ لوئب کو خود ہی گفتگو شروع کرنی پڑی۔

وہ بولا۔ ''آہ۔۔۔ وہ پرانا دور کوبُوسکی! پوری دنیا نئی نکور اور نکھری ہوئی تھی اور ہم جوان تھے۔ یاد ہے جب تم جہاز کی گرفت سے باہر نکلے تھے اور تم نے تارکین وطن کے رات کے اسکول سے پہلا معاہدہ کیا تھا؟''

کوبُوسکی نے اقرار میں گردن ہلائی۔ وہ بہت دبلا پتلا تھا۔ بالکل ڈھانچہ لگ رہا تھا۔ اس کے منہ میں بار بار پانی آ رہا تھا۔ بیسی بے صبری سے ایک کپڑے کا چیتھڑا ہاتھ میں لیے خاک صاف کر رہی تھی۔ وہ غالباً وہاں اپنی موجودگی کا جواز فراہم کرنے کے لیے مصروفیت ظاہر کر رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ دکان میں بھی

جھانک لیتی، لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔

لوئب نے اپنے دوست کا حوصلہ بڑھانے کے لیے وہ جملے دہرائے جو وہ بچپن میں بولتا تھا۔ ''کوبوٹسکی! ہوا درختوں کو پکارنے لگی ہے۔ چلو باغ میں کھیلنے چلتے ہیں۔ کیا آپ کو یاد ہے؟''

بیسی نے اچانک زور سے سونگھا اور چلائی۔ ''لوئب! روٹی تیار ہوگئی ہیں!''

نانبائی اچھل کر کھڑا ہوا، چولہے کی طرف بھاگا اور اوپر والا دروازہ کھولا۔ پھر اس نے وہ دو بیکنگ ٹرے نکالیں جن کے سانچوں میں روٹی سرخ ہوگئی تھیں اور غلاف شدہ میز پر رکھ دیں۔

بیسی نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں نے وقت پر بتا دیا ورنہ ابھی ہم ان سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔''

لوئب نے آنکھیں سکیڑ کر اسٹور میں دیکھا۔

''گاہک!'' وہ تیزی سے بولا۔

بیسی خجل ہوکر چلی گئی۔ کوبوٹسکی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ لوئب نے ایک بڑا پیالہ لیا اور آٹا سانچوں میں ڈالنے لگا۔ جلد ہی ٹرے تندور میں رکھ دی گئیں، لیکن بیسی واپس آ گئی تھی۔

گرم روٹیوں کی اشتہا انگیز خوشبو نے کوبوٹسکی میں زندگی کی لہر دوڑا دی تھی۔ اس نے مسرت سے گہری سانس لی، جیسے زندگی میں پہلی بار سونگھ رہا ہو اور اپنی مٹھی سینے پر ماری۔

''خداوند! یہ بہترین چیز ہے۔'' وہ تقریباً روہانسا ہوگیا۔

''آنسو شامل ہیں۔'' لوئب نے نرمی سے پیالے کی طرف انگلی کرتے ہوئے کہا۔

کوبوٹسکی نے سر ہلایا۔

''میں سالوں سے یہ محنت کر رہا ہوں۔ انہیں میرے کیک پسند نہیں ہیں، لیکن وہ روٹی کے لیے ہر طرف سے بھاگے آتے ہیں۔''

کوبوٹسکی نے ناک سکیڑ کر دکان کی طرف دیکھا۔ جہاں تین گاہک موجود تھے۔

''لوئب۔'' اس نے سرگوشی کی۔

نانبائی غیر ارادی طور پر سُن ہوگیا۔

اجنبی نے کاؤنٹر کے پیچھے بیسی کی طرف دیکھا، پھر اپنی بھنویں اٹھائیں اور استفساری نظروں سے لوئب کی طرف دیکھا۔

لوئب نے منہ نہیں کھولا۔

کوبوٹسکی نے اپنا گلا صاف کیا اور بولا۔ ''لوئب مجھے دو سو ڈالر چاہئیں۔'' آخر میں اس کی آواز کٹ گئی تھی۔

لوئب دھیرے سے بوری پر بیٹھ گیا۔ جب سے کوبوٹسکی اس کے پاس آیا تھا۔ وہ اس بات کی توقع کر رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ کوبوٹسکی اس متعلق بات ضرور کرے گا۔

وہ پندرہ سال پہلے دیے ہوئے دو سو ڈالر کو یاد کر رہا تھا۔ لوئب نے قسم کھائی تھی کہ اس نے دے دیے تھے۔ کوبوٹسکی نے انکار کیا تھا۔ ان کی دوستی ٹوٹ گئی تھی اور ناراضگی ختم ہونے میں برسوں لگ گئے تھے۔

کوبوٹسکی نے سر جھکا لیا۔

لوئب نے سوچا۔ وہ کم از کم یہ تو تسلیم کرے کہ میں غلط تھا۔ مگر خاموش رہا۔

کوبوٹسکی اپنی ٹیڑھی انگلیوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ سمور فروش تھا، لیکن جوڑوں کے درد کی وجہ سے اسے کام چھوڑنا پڑا تھا۔

لوئب نے خاموشی سے آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے پیٹ پر ہر ہفتے کے آپریشن کا نشان تھا۔ اب دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آیا تھا۔ اگرچہ ڈاکٹر نے یقین دلایا تھا کہ وہ آپریشن کے بعد دوبارہ اچھی طرح دیکھنے لگے گا، لیکن لوئب کو یقین نہیں تھا۔

اس نے آہ بھری اور سوچنے لگا کیا آپ کو خدا کی ناراضگی کا بھی احساس نہیں ہے؟ آپ ایک دوست کو معاف نہیں کر سکتے؟ یہ افسوس کی بات ہے کہ اسے سب کچھ دھندلا نظر آتا ہے۔

پھر لوئب نے اسٹور کی سمت دیکھ کر سر ہلایا اور ہکلایا۔ ''میں۔۔۔ ہاں۔۔۔ لیکن، سب کچھ دوسری بیوی کے نام پر ہے۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی خالی ہتھیلیاں آگے پھیلا دیں۔

کوبوٹسکی نے آنکھیں بند کر لیں۔

''لیکن میں اس سے ضرور پوچھوں گا۔'' لوئب نے بے یقینی سے کہا۔

''میری بیوی ڈورا کو ضرورت ہے۔'' کوبوٹسکی بولا۔

لوئب نے جھاڑو اٹھائی اور سفید دھول کا بادل اٹھاتے ہوئے کمرے کے اس پار چلا گیا۔

بیسی ہانپتی ہوئی واپس آئی اور انہیں دیکھ کر فوراً اپنے ہونٹوں کو مضبوطی سے دبا کر انتظار کرنے لگی۔

لوئب نے کاسٹ آئرن سنک میں ٹرے کو جلدی سے صاف کیا، میز کے نیچے سانچہ پھینکا، اور ٹرے پر مزیدار خوشبو والی روٹیاں ترتیب دیں۔ پھر اس نے تندور کے سوراخ میں دیکھا: خدا کا شکر ہے کہ روٹیاں ہمیشہ کی طرح پک رہی ہیں۔

جب وہ بیسی کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے خود کو بیمار محسوس کیا اور الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے۔

کوبوٹسکی اسٹول پر بے چین ہوگیا۔

''بیسی، یہ میرا پرانا دوست ہے۔'' نانبائی نے بات شروع کی۔

بیسی نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ کوبوٹسکی نے اپنی ٹوپی اٹھائی۔

''اس کی ماں، خدا اس پر رحمت نازل کرے۔ وہ ہمیشہ مجھے گرم سوپ کا پیالہ دیتی تھی۔ میں نے ان کے دسترخوان پر کئی سال کھانا کھایا ہے۔ اس کی بیوی کا نام ڈورا ہے، جو بہت مہذب خاتون ہے۔ تم جلد ہی اس سے ملو گی۔''

کوبوٹسکی آہستہ سے کراہا۔

''ہم ابھی تک کیوں نہیں ملے؟'' بیسی سے پوچھا۔

''کیونکہ میں خود اِس سے پندرہ سال بعد ملا ہوں۔'' نانبائی نے اعتراف کیا۔

''تم اس سے کیوں نہیں ملتے تھے؟ جب کہ جانتے تھے کہ وہ اسی شہر میں ہے۔'' وہ پیچھے ہٹنے والی نہیں تھی۔

لوئب ایک لمحے کے لیے خاموش ہوگیا۔ پھر بولا۔ ''کچھ غلط فہمی کی بنا پر۔''

کوبوٹسکی نے منہ موڑ لیا۔

''لیکن یہ میری اپنی غلطی ہے۔'' لوئب نے کہا۔

''اس کی وجہ یہ ہے کہ تم کہیں نہیں جاتے۔'' بیسی پھنکاری۔ ''کیوں کہ تم بیکری سے باہر نہیں نکلتے۔ تمھارے لیے کوئی دوست اہمیت نہیں رکھتا۔''

لوئب نے نمایاں طور پر سر ہلایا۔

''وہ اب بیمار ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اسے آپریشن کی ضرورت ہے۔ ڈاکٹر نے دوسو ڈالر مانگے ہیں۔ میں پہلے ہی کوبوٹسکی سے وعدہ کر چکا ہوں کہ۔۔۔''

بیسی زور سے چلائی۔

کوبوٹسکی گھبرا کر ٹوپی ہاتھ میں لیے اسٹول سے اتر گیا۔

بیسی نے اپنے سینے کو پکڑا ہوا تھا، پھر اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھے اور لڑکھڑا گئی۔ لوئب اور کوبوٹسکی اسے پکڑنے کے لیے دوڑے لیکن وہ گری نہیں تھی۔

کوبوٹسکی فوراً اسٹول پر پیچھے ہٹ گیا، لوئب سنک پر چلا گیا تھا۔

بیسی کا چہرہ ٹوٹی ہوئی روٹی جیسا ہوگیا تھا۔

''مجھے آپ کی بیوی کے بارے میں جان کر افسوس ہوا۔'' اس نے نرم لہجے میں مہمان سے کہا، ''لیکن مسٹر کوبوٹسکی! ہمارے پاس مدد کے لیے کچھ نہیں ہے۔ معذرت، ہم غریب ہیں، ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔''

''جھوٹ!'' لوئب غصے سے چلایا۔

بیسی نے شیلف پر چھلانگ لگائی اور بلوں کے ڈبے کو اٹھا کر میز پر اس طرح الٹ دیا کہ وہ ہر طرف اڑنے لگے۔

''یہ ہے ہمارے پاس!'' وہ چلائی۔

کوبوٹسکی کا سر کندھوں میں دھنس گیا۔

''بیسی، بینک میں۔۔۔'' لوئب ممیایا۔

''نہیں!'' وہ پھر چلائی۔

''میں نے پاس بک دیکھی تھی۔'' لوئب بولا۔

''تو کیا ہوا اگر آپ نے چند ڈالر بچائے ہیں؟'' کیا آپ ہمیشہ صحت مند رہیں گے؟ کیا آپ موت کے خلاف بیمہ شدہ ہیں؟''

لوئب نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''بیمہ شدہ؟'' اس نے طنز کیا۔

کسی نے بیرونی دروازہ کھٹکھٹایا۔ پھر مسلسل دستک ہونے لگی۔ دکان پر روٹی لینے کے لیے گاہک آنے لگے تھے۔ بیسی تیز قدموں سے چلتی ہوئی باہر چلی گئی۔

صدمے سے دوچار دوستوں میں اضطراب پھیلا تھا۔ کوبوٹسکی نے اپنے اوورکوٹ کے بٹنوں کو استخوانی انگلیوں سے بند کرنا شروع کیا۔

''کوبوٹسکی بیٹھ جاؤ! مجھے افسوس ہے۔'' نانبائی نے آہ بھر کر اس سے کہا۔

کوبوٹسکی بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ اداسی سے سیاہ پڑ گیا تھا۔

جب بیسی نے گاہکوں کو نمٹا دیا تو لوئب باہر دکان پر چلا گیا۔ وہ رسان سے کچھ بولا، تقریباً سرگوشی میں، پہلے تو اس کی آواز سنائی ہی نہیں دی، لیکن ایک منٹ کے بعد وہ پوری طاقت سے ایک دوسرے کو کوسنے لگے۔

کوبوٹسکی اسٹول سے اتر گیا۔ وہ سنک کے پاس گیا، نل کھول کر رومال آدھا گیلا کیا اور اپنی خشک آنکھوں پر لگایا۔ پھر گیلے رومال کو لپیٹ کر اپنے اوور کوٹ کی جیب میں رکھتے ہوئے اس نے چاقو نکالا اور جلدی سے ناخن صاف کیا۔

جب وہ اسٹور پر باہر آیا تو لوئب، بیسی سے التجا کر رہا تھا، وہ اسے یاد دلا رہا تھا کہ اس نے کتنی محنت کی تھی اور اب اس کے کھاتے میں کچھ رقم ہونے کے باوجود کیا وہ اپنے پیارے دوست کی مدد نہیں کر سکتا؟''

''براہ کرم، ضد نہ کریں۔ میں جا رہا ہوں۔'' کوبوٹسکی نے کہا۔

لوئب نے مایوسی سے اسے دیکھا۔ بیسی نے بھی حرکت نہیں کی۔

''پیسہ۔'' کوبوٹسکی نے آہ بھری۔ ''لوئب تم ڈورا کے بارے میں مکمل نہیں جانتے۔ اب وہ بیمار نہیں ہے۔ وہ مر چکی ہے۔''

''آہ۔۔۔!'' لوئب ہاتھ رگڑتے ہوئے کراہا۔

بیسی نے اپنا زرد چہرہ مہمان کی طرف گھمایا۔

کوبوٹسکی نے آہستہ سے کہا۔ ''پانچ سال ہوگئے ہیں۔''

لوئب پھر کراہا۔

''مجھے قبر پر کتبے کے لیے رقم کی ضرورت ہے۔ ڈورا کی قبر بے نام ہے۔ اگلی اتوار کو اسے مرے ہوئے پانچ سال ہو جائیں گے، میں ہر سال اس سے وعدہ کرتا ہوں۔ ڈورا، اس سال میں کتبہ لگوا دوں گا اور ہر بار نہیں لگا پاتا۔ میرے لیے یہ بڑی شرمندگی کی بات ہے کہ قبر ایسے کھڑی ہے جیسے وہ ننگی ہو۔ میں نے بڑی مشکل سے کتبے کے لیے پچاس ڈالر جمع کر لیے تھے، لیکن باقی رقم جمع نہیں ہوئی۔ ایک کے بعد ایک آزمائش آتی رہی۔ پہلے سال ایک آپریشن، دوسرے سال گٹھیا کی وجہ سے زیادہ کام نہیں کر سکا، تیسرے سال بیوہ بہن نے اپنا اکلوتا بیٹا کھو دیا اور میری ساری کمائی وہاں چلی گئی۔ چوتھے سال میں پھوڑے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا تھا۔ یہ سچ ہے کہ اس سال کام ہے، لیکن گرانی کے باعث کھانے اور رہائش پر پوری رقم خرچ ہو جاتی ہے۔ بس ڈورا بغیر کتبے کے پڑی ہے۔ اگر کوئی قبرستان آئے تو اسے کبھی قبر نہیں ملے گی۔''

بیکر کی آنکھیں آنسوؤں سے تر ہوگئیں۔ اس نے بیسی کی طرف

دیکھا، اس کا سر بالکل جھکا ہوا تھا اور شانے ڈھے گئے تھے۔ آخر وہ پسیج گئی اب وہ منع نہیں کرے گی، پیسے دے دے گی۔ پھر ہم سب مل کر کھانے کے لیے میز پر بیٹھیں گے۔ لوئب نے سوچا۔

لیکن بیسی نے روتے ہوئے نفی میں سر ہلایا اور اپنی آزمائش کی کہانی سنانی شروع کر دی کہ انقلاب کے کتنے دن بعد جب وہ ابھی چھوٹی ہی تھی، اس کے پیار کرنے والے باپ کو میدان میں ننگے پاؤں کیسے گھسیٹا گیا اور گولیاں چلنے کے بعد درختوں سے کوّے کیسے اڑے اور برف خون کے دھبوں سے سرخ ہوگئی۔ کیسے شادی کے ایک سال بعد اس کا شوہر، ایک مہربان، تعلیم یافتہ شریف آدمی، ایک محاسب (اکاؤنٹنٹ)۔ جوان دنوں بہت کم ہوتے تھے، سرخ بخار کے باعث وارسا میں مر گیا۔ وہ اپنے غم میں بالکل اکیلی تھی، آخر ایک بزرگ کے پاس پناہ ملی۔ جرمنی میں ایک بھائی نے اسے امریکہ بھیجنے کے لیے جنگ سے پہلے اپنا سب کچھ عطیہ کر دیا، اس نے خود اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ نازی گیس چیمبر میں اپنے دن پورے کیے۔۔۔ اور وہ کس طرح امریکہ آئی اور ایک غریب نانبائی سے ملی، ایک آوارہ جس کے پاس کھانے کے لیے ایک پیسہ بھی نہیں تھا، جس نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی تھی اور میں نے اس سے شادی کی، خدا جانے کیوں؟ اور دن رات محنت سے کام کرتے ہوئے اپنے ہاتھوں سے ایک چھوٹا سا کاروبار شروع کیا اور اب بارہ سال کے بعد، ہم نے تھوڑا بہت کمانا شروع کیا ہے، لیکن لوئب بیمار ہے، اس کی آنکھوں کی سرجری ہونی ہے اور اگر خدانہ کرے وہ مر جائے تو میں اکیلی کیا کروں گی؟ میں کہاں جاؤں گی، پیسے کے بغیر اپنی ضروریات کیسے پوری کروں گی؟''

کہانی کے اختتام پر، کوبٹسکی نے کانوں کو اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیا تھا۔

بیسی کے گالوں پر آنسو بہہ رہے تھے، لیکن اچانک اس نے سر ہلایا اور مشکوک انداز میں سونگھا۔ پھر ایک کرخت چیخ کے ساتھ وہ پچھلے کمرے میں بھاگی اور تندور کا دروازہ کھولا۔ دھوئیں کے بادل نے اس کے چہرے کو گھیر لیا۔ ٹرے پر کالی روٹیاں جلی ہوئی لاشوں کی طرح پڑی تھیں۔

کوبٹسکی اور نانبائی لڑکپن کے دوست آہ بھرتے ہوئے گلے لگے۔ پھر دونوں اپنے اپنے ہونٹ دبائے ہمیشہ کے لیے جدا ہو گئے۔

بقیہ : دوپٹہ

انور نے سوال کیا۔

''پھر یہ امی کی نشانی آپ مجھے کیوں دے رہی ہیں۔''

ستی نے کہا۔

''پُت پاکستان جاکے رجو دی قبر پراہیہ دوپٹہ بچھا کے کہیں کہ ستی ماسی سخت نراج ہے۔ توں پہلاں کیوں چلی گئی! کیوں ملے بگیر قبر چ جا لگی (بیٹے پاکستان جاکے رجو کی قبر پر یہ دوپٹہ بچھا کر کہنا کہ ستی خالہ سخت ناراض ہے کہ تو پہلے کیوں چلی گئی کیوں ملے بنا قبر میں جا چھپی)۔''

انور نے ہنڈیا کی ساری چیزیں میز پر ڈھیر کر دیں، سب کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ پرانی طرز کے سونے کے بھاری زیور اور چاندی کی موٹی پازیب۔ دیالے نے زیورات دیکھ کر ماں سے پوچھا۔

''بے بے تسی ایس ہانڈی بارے سانوں وی اولا رکھیا۔۔؟!(اماں آپ نے اس ہنڈیا کی بات ہم سے بھی چھپا کر رکھی۔۔؟!)۔''

وہ ٹھہر ٹھہر کر بولی۔

''دیالے پُت ایہہ کسے دی امانت سی کھیانت ہو جاندی میں واہ گرونوں کیہہ جواب دیندی۔ ہاں تیرے دار جی نوں اس ہانڈی بارے پتہ سی (دیالے بیٹے یہ کسی کی امانت تھی۔ خیانت ہو جاتی تو میں واہے گورو کو کیا جواب دیتی، ہاں تیرے دار (پتا) کو اس ہنڈیا کے بارے میں معلوم تھا)۔''

اگلے دن صبح سویرے انور کو الوداع کہنے کے لیے برآمدے میں سب موجود تھے۔ دیالہ گاڑی سٹارٹ کر کے لے آیا اور سامان ڈگی میں لگانے لگا۔ نیلو جسی اور گولڈی انور تایا کو واہگہ چھوڑنے جا رہے تھے۔ انھوں نے واپسی پر دربار صاحب (گولڈن ٹیمپل) بھی جانا تھا۔ ستی کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ انور اُسے تسلیاں دے رہا تھا کہ وہ جلدی بھائی کو ساتھ لے کر ملنے آئے گا۔ بس خالو سپانسر شپ بھیج دیں۔ اب ہم سیدھے گھر پر ہی آئیں گے۔ اور پھر وہ دیالے کی گھر والی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''بھابھی آپ نے بڑے اچھے کھانے کھلائے کبھی پاکستان آئیں۔''

دیالہ ڈرائیور سیٹ پر بیٹھ کر ہارن دینے لگا۔ انور نے گاڑی کا پچھلا دروازہ کھولا سیٹ پر سے ہنڈیا اُٹھائی اور چلتا ہوا گریوال کے قریب پہنچا۔ ہنڈیا اُن کے پیروں میں رکھ کر ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''خالو۔۔۔ ہم دو بھائی ہیں۔ ہماری کوئی بہن نہیں، ہمارے پرکھوں کی یہ کمائی یہ سونا چاندی جسی اور نیلو کی شادیوں میں اُن کے پاکستانی بھائیوں کی طرف سے تحفہ دے دینا۔ ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ (تھوڑا رک کر) ہاں امی کا دوپٹہ اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

"سرما کے موسم میں"

منوّر عمر کے لیے ایک نظم

سرمد صہبائی (یو۔ایس۔اے)

مجھے رشک آتا ہے اس پر
جو سیٹی بجاتا ہے
ہارن بجانا منع ہے
مگر وہ تو سیٹی بجاتا ہے
بُزدل نہیں ہے
مجھے رشک آتا ہے اُس پر
جو مجھ سا نہیں ہے

مرا نام
دفتر کے باہر لٹکتی ہوئی ایک تختی
مَیں دِن رات
'جی ہاں، نہیں جی' کی گردان میں
زندگی ہارتا ہوں
مگر وہ تو سیٹی بجاتا ہے
سرما کے موسم میں
خوابوں کے موزے بناتا ہے
اور دھوپ میں
بہتے پانی کے رنگوں میں چلتا ہے
کہتا ہے
مَیں دُور بارش کے قطرے کے نیچے
ہری گھاس کے ایک گمنام گوشے میں جا کر مروں گا
مگر تیری میّت پہ خوش پوش شہری
ترے واسطے چند فرصت کے لمحے نکالیں گے
شاعر صحافی
نئے قافیے اور نئی سرخیاں ڈھونڈ کر
تیرا ماتم کریں گے
مری موت پر کس کو افسوس ہوگا

بے وفائی

محمود شام
(کراچی)

بے وفائی کے مرتکب ہم سب
بے وفائی بھی کوہ و صحرا سے
بے وفائی حسین ساحل سے
بے وفائی بھی سندھو ندی سے
بے وفائی چناب جہلم سے
بے وفائی خموش جھیلوں سے
کھڑی فصلوں سے پکتے خوشوں سے
پیلوں۔ٹاہلیوں کھجوروں سے
بے وفائی گلی کی ہٹّی سے
نکڑوں سے تھڑوں سے ڈھابوں سے
صوفیوں سے جڑی کتابوں سے
اپنے ہمسائے میں بزرگوں سے
بے وفائی کے مرتکب ہیں مگر
ان سبھوں سے وفا کے خواہاں ہیں

○

جنم دن کا بوجھا

ثروت زہرا

(کینیڈا)

خلاؤں تک پھیلے ہوئے
خواب کا بوجھا ہے
جو عمر کے
کاندھے پر دھرا ہے
مٹی سے قبریں بنائی جائیں
یا تختیاں لیپی جائیں
نام تو تمہارا ہی گودا جائے گا
خالی تکیوں پر پڑی خاموش سلوٹیں
اور وقت کی
جلد پر پڑی خراشیں
میری شناخت دفن کرنے؟ائی ہیں
کمال تو یہ ہے کہ
لوگ خواب دکھاتے ہوئے بھی
خواب رہ جانا چاہتے ہیں۔۔۔
اور میں
کہیں پر بھی رہتے ہوئے
صرف ایک خواب میں
ریشم کے کیڑے کی طرح
خود کو
لپیٹ کر
مارتی جارہی ہوں۔

○

"نظم کا خیال رکھنا"

مدیحہ مغل

(گوجرانوالہ)

نظم کی نیم خوابیدہ راہداریوں میں
تم فطرت کے سنگ
سرخ یاقوتی خواب گاہ میں
لوبان اور کافور سے مشک بو
محبت کی لے پر
ملکے سے رقص میں ہو
نظم کا عنوان
سیندور کی طرح دمکتا
اور نظم کا باطن نور کی
ندی کی طرح رواں ہے
ایسی ندی جس کی روانی ایک گیت
اور اس کے نشیب کا سفر
ایک دھمال ہے
نظم وارفتہ اور
سرگشتہء خمار ہے
اپنے لبوں پر میٹھے بول سجائے
تمہاری بانسری کی منتظر ہے
جس کی نرم اور ملائم سی لے پر
اسے جینے کو جیون بنانا اور بھید پانا ہے
ایسا بھید جسے محبت کی کوکھ میں
پالا اور وفا کی بارشوں میں
پروان چڑھایا گیا ہے
نظم کے احمریں ہونٹ اور
سپنے بنتی آنکھیں
نیم خوابیدہ راہداریوں میں
ہمیشہ تمہاری منتظر رہتی ہیں

○

ابد کے خلا میں

رفیق سندیلوی (اسلام آباد)

تیرے سینے میں آباد تھی
اِک الگ طرز کی کائنات
اور پاؤں تلے ایک جنت تھی
بالکل انوکھی
جسے مَیں نے تیرے دُوپٹے کی خُوشبو میں
شیرِ رضاعت میں
آغوش کے گرم فرغل میں
پاپوش کے سُرخ پھولوں میں دیکھا تھا
اب کتنا ویران تھا تیرا سینہ
جو سکڑا ہُوا تھا
ترے نرم پاؤں جو بے جان تھے
کتنے سوجے ہُوئے تھے
مشینوں کو کیا علم تھا
تیرا کیا مرتبہ ہے
مشینیں تو مجبور تھیں
تیرے گُردوں کو
اپنے اُصولوں پہ دھوتی تھیں
اور صاف کرتی تھیں آلائشیں
تیرے باطن کا جن سے علاقہ نہ تھا
تیرے پاؤں کی سوجن میں
کوئی تو اَسرار تھا
جو مجھے پائنتی کی طرف کھینچ لاتا
خموشی سے مَیں رات بھر
تیرے پاؤں دَباتا
تو لگتا کہ اِس مخملیں جلد کے نیچے
جیسے پہاڑوں سے رستہ بناتی ہُوئی
آبشاروں سے آتی ہُوئی
گُنگناتی ہُوئی
کوئی ندّی ہے
جس میں چمکتا ہُوا
تیری یادوں کا شفّاف پانی رواں ہے
محبت کی اِک داستاں ہے
جسے سُن رہا ہُوں
سکوتِ مسلسل میں
سایوں کے جنگل میں
لیکن کسی دوسرے شخص تک
اِس کی آواز جاتی نہیں!
بسترِ مرگ پر
تیری ہچکی کی آواز
لہروں سے پیوست تھی اِس طرح
جس طرح قلب تک
ایک کف دار نلکی
جو گردن میں چیرا لگا کے
کسی رگ میں ڈالی گئی تھی
ترے کان کی لَو کو چُھوتی تھی
یُوں جیسے نلکی نہ ہو
کوئی جھمکی ہو
جس کو کسی اور ہی
سانچ لازمانی میں رکھ کر بنایا گیا ہو
یہ سب جانتے تھے
کہ تُو ایک زرگر کی بیوی تھی
گیروگی بالیاں، موتیوں سے سجی مُرکیاں
پائلیں، چوڑیاں اور کنگن
سبھی کچھ تری دسترس میں تھا
لیکن خدا کی قسم
تیرا زیور تو کیا تیرے زیور کا کوئی ہیولا تلک بھی
مرے حافظے میں نہیں ہے
نمیدہ نگاہوں کے آگے
فقط اِک اُلوہی، لہو رنگ جھمکی
ابد کے خلا میں
کہیں جُھولتی ہے!

احتجاجی مٹھی میں بند نظم

ثاقب ندیم
(برمنگھم)

کبھی کبھی نظم خاموش ہو جاتی ہے
وہ بولنا نہیں چاہتی
اور آگ لگا دینا چاہتی ہے
پسِ احساس پنپتے
بے حسی کے خَس کو
وہ گالی دینا چاہتی ہے
محاذِ جنگ سے منکر سپاہی کو
مگر وہ خاموش ہے
نظم چیخ بننا چاہتی ہے
منحنی سروں پہ لٹکتے کانوں میں۔
نعرہ آدھے سر میں گونجتا ہے
میگرین بن کر
اور نظم بقیہ آدھے سر میں
چیخ بن کر
اخبار بے خبر ہے
احتجاج کا سوم رس پیے ہوئے چوہے نے
اغوا کر لیا ہے
بندوق بردار مور کو
نعرہ ہنستا ہے اور داد بن جاتا ہے
تاریخ کا بے کفن جسد
جنازگاہ کی تلاش میں ہے
نظم شدتِ غم سے
احتجاجاً خاموش ہے

اپنی سالگرہ پر کہی گئی نظم

تبسم ملیح آبادی
(اسلام آباد)

کتنے تلخ اور کتنے میٹھے میں نے سال بتائے ہیں
کتنے ارمانوں کے ہر اک پل میں دیپ بُجھائے ہیں

عمر کے کتنے سال حسیں تھے کتنے سال بھیانک تھے
اب کیا پوچھ رہے ہو ہم سے یادوں کے بس سائے ہیں

مانتے ہیں کہ دور جوانی کا انمول زمانہ ہے
لیکن اس تک آنے میں بچپن کے گیت گنوائے ہیں

دل رکھ لو یا توڑو پھوڑو یہ اب تم پر چھوڑا ہے
ہم تو تمہارے بَن بیٹھے ہیں دنیا کو چھوڑ آئے ہیں

○

لولاک

(نعت کے دانشورانہ ڈائمنشنز اور عصری مطابقت)

انتخاب حمید
(اورنگ آباد)

جنگل رنگوں اور نسلوں کا ،جنگل طبقوں اور فرقوں کا
سب کے اپنے اپنے مذہب،مذہب کی سیاست چاروں طرف

طاقت کے نشہ میں چور سبھی ،مذہب کے دلالوں کی دنیا
غربت کے چٹانوں کے نیچے حق چاہنے والوں کی دنیا

منتظر تھا شہر مکہ اک مفکر کے لئے

آسماں کی وسعتوں کو ذہن انساں کا سلام
فکر کی پرواز کو جن سے ملی عمر دوام
تیز تیز اٹھنے لگے آگے تجسس کے قدم
طائر تحقیق کی امت بڑی ہونے لگی

سرمگیں آنکھوں میں مستقبل کی روشن جھلکیاں
کالی پلکوں پر تھرکتا اک تمدن شاندار
(لولاک۔چندر بھان خیال)

نعت ایک ایسی صنف سخن ہے جو زبان و بیان اور ہیئت و جمالیات کی سطح پر دیگر شعری اصناف سے صریحاً مماثلت تو رکھتی ہے لیکن اپنی تخصیص اور اپنا اختلاف بھی واضح رکھتی ہے۔ادراک و اظہار میں تقدس اور لفظیات میں عقیدت مندانہ و عاشقانہ شکوہ اس صنف کا تعریفی وصف ہے۔یہ صنف سخن ان معدودے چند شعری اصناف (بشمول عربی و فارسی) میں شامل ہے جو اپنی رد تشکیل ہی نہیں ،اپنی تشکیل وتعمیر میں بھی تشکیک وتردد سے بالاتر ہے۔اس صنف کی بیانیہ منطق ہی نہیں اس صنف کا وجود فی نفسہ ایقان واستناد پر انحصار کرتا ہے اور جس کا لفظ لفظ بے پناہ عقیدت ،خودسپردگی ،اور ازخود رفتگی سے معنون ہے۔کیونکہ اس کا واضح و واحد مقصد، بلاشرکت غیرے،سرور کائنات حضرت محمدؐ کی ذات بابرکات واعلی صفات ہے عقیدت رسولؐ ہی اس کا محرک بھی ہے اور جواز بھی۔

لولاک کا تاسیسی عنصر بھی خالص عقیدت رسولؐ ہی ہے مگر اس نعت کے کچھ ایسے فکری وفنی ڈائمینشز ہیں جن کی بنیاد پر اسے نعت کی دنیا میں اپنی مثال آپ قرار دیا جا سکتا ہے۔یہ وہ ڈائمنشنز ہیں جو اس نعت کے تلازمات کو ازلی حقیقتوں کی مانند آفاقیت سے ہمکنار رکھتے ہیں۔سرور عالمؐ کی ذات پاک کے اتنے رخ، اتنے ابعاد ہیں اور اس قدر تہہ دار وطرح دار ہیں کہ ہر دور میں ان کی معنوی مطابقت کی پرتیں کھلتی رہیں گی۔خواہ وہ حیات وموت اور کائنات کے سربستہ رازوں سے متعلق ہوں یا انسانی معاشرتی نظام کی تنسیخ ہو یا تعمیر نو یا پھر تغیر پذیر عصری متعلقات ہوں۔عصر جو ازل سے موجود ہے اور جو ابد تک قائم رہے گا۔فکر نبوی سے مستفید ومنور ہوتا رہے گا۔

لولاک کا ہیئتی ،نظریاتی اور لسانی اسٹرکچر اور اس کے متوازی، یا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اسی میں ضم و مدغم محسوساتی اسٹرکچر خاصہ Complex ہے۔چھ ابواب میں منقسم یہ طویل نظم خیر البشرؐ کے نظریہ حیات کی ابتدا و منتہا پر محیط ہے جس کا ہر باب (اپنی موضوعاتی تخصیص کے باوجود) اپنے پیش وپس روابواب سے بتدریج فکر رسولؐ اور بیانیاتی جمالیات سے مربوط ومنضبط ہے۔مخصوص تاریخی سیاق کے باوصف اپنے تلازماتی تناظر میں لولاک عہد رواں اور اس کی معاشرت ،معیشت، سیاست وثقافت ہی نہیں اس ثقافت کے پروردہ انسان کی روش اور اس کے نفسیاتی اسٹرکچر کو بھی سوال زد کرتی ہے۔

عصر حاضر اور اس کے تراشیدہ انسان کا ظاہر و باطن حرص وطمع ،خود غرضی ،انا پسندی ،غصب واستبداد اور لذت کوشی جیسی لعنتوں سے مسلسل آلودہ تر ہو تا جا رہا ہے عصر رواں کے اسی متشدد منظر نامے کے سیاق میں عالمی سطح پر بے شمار سیاسی اور ثقافتی ڈسکورسیز انسانی تحقیر وتذلیل اور استحصال واستبداد کی تصدیق فراہم کرتے ہیں۔لولاک کا بیانیاتی اسٹرکچر اپنے مدحی کردار کے باوصف ،ان مخاطبات سے قابل توجہ مطابقت رکھتا ہے۔لولاک کا یہ ایک اہم ترین کنٹریبوشن ہے۔دانشورانہ تلازمات اس متن میں ذہانت اور مشاقی سے انگیز کئے گئے ہیں اور اس کمال فن سے کیے گئے ہیں کہ نعت کا صنفی و جمالیاتی حسن قطعی متاثر نہیں ہوتا۔

صنف نعت یا نعتیہ شاعری کا یہ ایک مفقود ڈائمنشن ہے کہ وہ اپنے عصر رواں میں ان بیشتر پہلوؤں کو مخاطب نہیں کرتی جو ایک منطقی اور دانشورانہ تجزیاتی و تدارکی مخاطبت کے متقاضی ہیں۔نعتیہ شعری بیان میں، اپنے صنفی تقدیس کے زیر اثر، اس نوع کے بیانات غیر مشروع قرار پاتے ہیں۔لولاک کا دانش معکوس زاویۂ نگاہ اپنا مستند جواز فراہم کرتا ہے کہ ایسی ابتر صورتحال میں فکر نبویؐ انسانی ترفع ،انسانی فلاح و بہبود اور انسانی نجات کی راہیں منور کرتی ہے۔اس ضمن میں یہ خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ لولاک موضوعاتی وسعتوں کے امکانات ہی نہیں اس صنف کے انتقادی لوازمات کے تقاضوں کی جانب بھی اشارے فراہم کرتی ہے۔آج کے سیاق میں ہمارے نعت گو شعرا اور نعتیہ نقاد دونوں ہی کو اپنے آفاق وسیع کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

لولاک کا باب اول حضورؐ کی نظریاتی بیخ و بنیاد کی جس شعری طرز بیانیہ میں پیش سایہ افگنی کرتا ہے ،قابل ستائش ہے۔بہتیری نعتوں میں حالات

حاضرہ کی چیرہ دستی، اخلاقی تنزل کے اشارے اور متاثر کن شعری بیانات نظر تو آتے ہیں اور فکر و دانش کے تلازمے بھی، تاہم ان سے حضور اکرمؐ کے فکری نظامِ عصر کے ڈائمنشنز رقم نہیں ہوتے اور نہ ہی ان نعتوں میں فکری ساخت کی دلالت کے بیانیاتی عناصر واضح نظر آتے ہیں۔عصر معکوس مسائل خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، گرچہ نعت میں جگہ پاتے بھی ہیں تو التجائیہ، استعانہ یا استغاثہ کی صورت نظر آتے ہیں۔مثلاً حالی کا لہجہ ملاحظہ فرمایئے گا:

اے خاصہ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے

یا پھر نعت کے دوسرے دو غالب روایتی ابعاد نظر آتے ہیں۔ایک سیرت پاکؐ و شمائل نبوی اور دوسرا نورانی و ماورائی ڈائمنشن، حسن عسکری کا انتہائی عالمانہ مضمون ''محسن کاکوروی'' انہیں دو خصوصیات کی بنیاد پر حالی اور محسن کاکوروی کے نعتیہ کلام کا حیرت زا موازناتی تجزیہ کرتا ہے، حالی کو بشری یا انسانی اور محسن کاکوروی کو نوری جہات سے منسوب قرار دیا گیا ہے۔

کئی ایسی نعتوں کی مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں جن میں دور جاہلیہ کا شعری بیانیہ موجود ہے۔لولاک کا ابتدائیہ کا اندازِ بیان اور لسانی در و بست اس کے عصری مطابقت کے معنی خیز نظریاتی (Ideological) اسٹرکچر پر دال ہے۔دور جاہلیہ کی جو صورت گری لولاک میں کی گئی ہے وہ کسی صورت بھی عصری صورت سے مختلف نہیں ہے، بجز اس کے کہ عصر رواں کی شیطانی قوتیں زیادہ Sophisticated اور سائنس و ٹکنالوجی سے لیس ہو کر زیادہ فتنہ انگیز ہو گئی ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ سے قبل یا پھر ان کے بعد یا حضور اکرمؐ کی ولادت باسعادت سے قبل عصری روش کا بیانیہ تلازماتی معنی خیزیوں سے معمور ہے۔نعت کی بیانیاتی strategies پر غور فرمایئے گا۔بیانیہ حکمت عملی کے تحت تصور و تلفیظ کا شعری تصرف اس کمال فن سے کیا گیا ہے کہ عصری فسطائیت، جبر و جہالت، جنسی قہر اور صنف بہتر کی مظلومیت ذہن کے اسکرین پر تانڈو کرنے لگیں گی جس بیانیہ کی صداقتوں کی تصدیق کسی روزنامے Newspaper یا انٹرنیٹ سے ہو جائے گی۔یہ محض دور جاہلیہ ہی کا بیانیہ نہیں ہے۔بلکہ یہ ہمارے وقت کی ایسی خوفناک حقیقتیں ہیں جو معمولات کی شکل اختیار کرتی چلی جارہی ہیں۔

سفلہ پروری، ذلالتوں اور کثافتوں کے کیچڑ میں غلطاں اس مبتذل معاشرہ کی عکاسی مبتذلہ تلفیظ ہی میں اپنا تاثر قائم کرسکتی ہے۔اس لیے عصری معمولات کو جس معمولاتی زبان میں یہاں شعر کیا گیا ہے، لولاک ہی کا حصہ ہے۔یہاں قابل توجہ بیانیہ اسٹرکچر کا یہ پہلو ہے کہ دور جاہلیہ کا بیان حضور اکرمؐ کی فکر کے تعمیر نو کی ناگزیریت کے لیے منصوبہ بند پس منظر فراہم کرتا ہے:

عصر وحشی ہو کے پاگل، اونٹنی پر تھا سوار
بستیوں میں بے خطر پھنکارتی نیزوں کی دھار
مفلس و مجبور ماؤں کی کمر کو توڑتا
لڑکیوں کے جانگھ سے لپٹا زناکاروں کا خوف
تمبوؤں میں جاگتا ہر رات خونخواروں کا خوف
اور دن میں سر پہ منڈلاتا سیہ کاروں کا خوف
بھیڑیوں کی بھیڑ سا نوعمر فصلیں روندتا
جانور کی عقل والے حکمراں طبقے کا خوف

مندرجہ بالا اشعار کے عصری سیاق ہی میں اس مضمون کے صفحہ نمبر ایک پر بطور تمہیدی حوالہ جات پیش کیے گئے اشعار نمبر ایک اور دو کو ملاحظہ کیجیے گا۔لولاک کی شعریات کا انوکھا پن واضح ہونے لگے گا۔معمولاتی زبان کے شعری تصرف کی یہ مثال اردو نعتیہ شاعری میں بمشکل ہی نظر آئے گی۔ہندی الفاظ گرچہ انیسویں صدی سے ہی نعتیہ شاعری میں استعمال ہو رہے ہیں، محسن کاکوروی کے یہاں بھی ہندی الفاظ اپنے تہذیبی اور جمالیاتی تلازمات کے ساتھ مستعمل ہیں لیکن لولاک میں ہندی الفاظ جس طرح فطری انداز میں اپنے اشارات کے ساتھ بیانیہ میں ضم ہوتے چلتے ہیں اس کی مثالیں کم ملتی ہیں۔یہ الفاظ نظم کے ڈکشن کی روانی کو مترنم کرتے ہیں۔(بے سفر دشاؤں کا رازداں سفر میں ہے☆آسماں کے نیچے آسماں سفر میں ہے) اور دوسری طرف کہیں کہیں لفظیات کی عمومیت اور کرختگی ثقافتی تنزل اور انسانی تذلیل کے اشارے بھی فراہم کرتی ہیں۔انسانی عظمتوں کی پائمالی کا یہی سیاق نبی کریمؐ کی دانشورانہ فکر و نظر کی روشنی میں انسانی سماج کی تشکیل نو کے جواز بھی فراہم کرتی ہے۔''داروکا گلاس'' نظم کے سیاقی عصر کو ہی نہیں، عصر حاضر کو بھی آئینہ کرتا ہے۔باب اول ''حضورؐ کی پیدائش سے قبل'' کی لفظیات کے انتخاب و اہتمام پر غور فرمائیں۔لذتیں، بھوک، نشہ، جانگھ، زنا، تمبوؤں، جبر، جبڑے، یا باب دوم ''ولادت'' کے درج ذیل بند یا اس سے قبل ہی کے بند پر نظر فرمائیں:

نو بہ نو طریقوں سے اہتمام دلگیری
دل فریب ساعت کو چاٹ چاٹ کر چومے
جوش عیش کوشی میں ہر نفس جنوں زادی
برق بن کے ناچ اٹھی بے لگام آزادی
سانپ جیسی ہستی میں پھن اٹھا کے لہرائے
مے پرست ہونٹوں کی اس قدر بلانوشی
آدمی کے ہاتھوں سے آدمی کی بربادی
برق بن کے ناچ اٹھی بے لگام آزادی

یہ وہ نامشروع لفظیات و اظہارات ہیں جن کی نعت جیسی صنف میں سرمو بھی گنجائش نہیں کیونکہ ''شوکت لفظی'' اور اظہاری تقدس نعت کی شرائط تمہیدی ہیں اور جن کی طرف سے ذرا سی بھی لاپرواہی نعت کے نورانی اور ماورائی محاسن کو متاثر ہی نہیں کرتی بلکہ نعت گو کو معتوب و ملعون قرار دیے جانے کا باعث بھی ہوسکتی ہے۔

ابواب نمبر دو، تین اور چار گرچہ بتدریج ولادت باسعادت، نبوت اور ہجرت کا شعری بیان ہیں تاہم متن کی بغور قرأت یہ منکشف کرتی ہے کہ ان ابواب کے ترنم خیز شعری بیانیہ کے بین السطور میں ان لفظیات کے توسط سے فکر نبوی کے دانشورانہ نظریاتی سروکار کو جس حسن کمال سے منضبط کیا گیا ہے لائق تحسین ہے۔مثلاً ولادت باسعادت کے نورانی لمحات کے باوصف نظم کے رواں دواں مصرعوں میں پیوست آئیڈیالوجیکل اشارات پر توقف فرمایئے گا۔جدید اور مابعد جدید طرز ہائے فکر سے فکر نبویؐ کے انسلاکات واضح ہونے لگیں گے۔''بے لگام آزادی'' کی تکرار پر غور فرمایئے گا۔آزادی کی گستہ عنانی کو منتج تخریب کاریوں پر نظر کیجیے گا freedom of Burden freedom, of Fear آزادی کی فراوانی، آزادی پر قدغن یا احساس ذمہ داری سے مبرا تصور آزادی اور اس آزادی کے تحت آدمی کے ہاتھوں، آدمی کی بربادی، جیسے جدید دور کے دانشورانہ مخاطبات ذہن میں تازہ ہونے لگیں گے۔

تنفر، تفریق، تعصب شر، شر کے پجاری، سانپ، پھن، وہم، دھواں، عداوت، یا پھر انہی بیانات میں مفلسی، وزخم خوردہ سانسوں، اندھیرے، یاس کے اندھیرے، جیسی لفظیات اور عہد رواں کے تصورات کو فن کارانہ مہارت سے مدحت رسولؐ میں انگیز کیا گیا ہے جو راست یا ناراست فکر نبویؐ کے مختلف ابعاد کی اہمیت و افادیت کو مثبت کرتے ہیں۔درج ذیل اشعار پر توجہ فرمایئے گا وقت اور تاریخ کے فاصلے سمٹ آئیں گے۔اس عصر سے اِس عصر تک تلازمات اور مطابقت کی طویل زنجیر کی کڑیاں روشن ہوتی چلی جائیں گی:

جنگل رنگوں اور نسلوں کا، جنگل طبقوں اور فرقوں کا
سب کے اپنے اپنے مذہب، مذہب کی سیاست چاروں طرف
موقعوں کی پرستش میں ڈوبے ذہنوں کی غلاظت چاروں طرف
بے نور خداؤں کی خاطر لوگوں کی عداوت چاروں طرف

اخلاق وخلوص اور مہر ووفا سب غار میں دبکے دبکے سے
افراد کی دہشت گردی کا منھ توڑنے والا کوئی نہیں
قانون نہیں، انصاف نہیں، دل جوڑنے والا کوئی نہیں
بڑھتے ہوئے ظلم کے دھارے کا رخ موڑنے والا کوئی نہیں

لفظ اور علامت سے جنت، جھوٹ اور خوشامد سے آمد
طاقت کے نشہ میں چور سبھی، مذہب کے دلالوں کی دنیا

''باب جہاد'' میں محسن انسانیت نبی کریمؐ کی فکر کے ''فکر جہاں'' کے ڈائمنشنز دیدنی ہیں۔یہاں کی جہاد کی شعری تعریف انسانی فلاح سے معنون عالمی دانشوروں کے نظریات سے مطابقت ہی نہیں رکھتی اور جہاد کے باب میں غلط فہمیوں پر مبنی یا منفی تعبیر اور تشہیر و توجیہات کے طریقۂ کار کا ازالہ ہی نہیں بلکہ جہاد کی صحیح تفہیم اور غلط بیانات کے تدارک کی سمت ایک عملی اقدام کی صورت بھی دیکھی جاسکتی ہے۔جہاد معرکہ خیر وشر ہے، حق، انصاف، مساوات، آشتی اور امن وامان کے قیام واستحکام کی ایک پرخلوص کاوش ہے کیونکہ تصور جہاد میں حرص ولالچ اور غصب وغلبہ جیسے انسانی اعمال وتصورات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔جہاد سے متعلق چندر بھان خیال کے Perceptions اور اسلامی نقطہ نظر پر ان کی نظر خاص توجہ اور تحسین کی متقاضی ہے۔غزوات کے پیش وپس منظر سے ان کی کماحقہ واقفیت، تاریخ جغرافیہ و ثقافتی جزئیات کا ہنر مندانہ برتاؤ، جہاد کے معاشی، معاشرتی اور اخلاقی و ماورائی ڈائمنشن پر ان کی گہری نظر جہاد کے بیان کو ایک مثبت اور تعمیر نو سے منسوب ایک مستند شعری ڈسکورس کی شکل عطا کرتے ہیں۔ مستشرقین اور عالمی سطح پر مروج منفی رویہ کے پیش نظر یہ ڈسکورس ایک خاص اہمیت رکھتا ہے:

اس جنگ و جہاد کا مقصد ہے انصاف کے گیسو لہرائیں
ہر فرد کی سانسوں کو رب کے پیغام خوشی سے مہکائیں
تفریق و تنفر کی لعنت اور بار مظالم دنیا کو
اب اور نہ بانٹ کے رکھ پائے سوداور زیاں کے خانوں میں

مذکورہ ڈائمنشن کے علاوہ جہاد کے درج ذیل پہلو کا محاسبہ بھی اہم ہے کیوں کہ یہ اقتباسات فکر نبویؐ کے بازتعمیری نظریے میں انسانی اندرون اور ماورائیت کی اہمیت بھی واضح کرتے ہیں جن پر گفتگو آگے کی گئی ہے:

تنظیم و تعاون کا جذبہ بیدار ہو سب انسانوں میں
اخلاق ووفا برکات رضا سب چھوٹے بڑے کاشانوں میں
اس قدر اٹھے ہر سینے میں ایثار و شہادت کا طوفاں
اوراق زمیں سے مٹ جائے تخریب صفت بدعنوانی
اس جنگ و جہاد کا مقصد ہے کردار عمل کی تابانی
حکمت کی حقیقت کی شہرت تخلیق جہان سبحانی
محتاج کو راحت کا ساماں، پسماندہ گروہوں کو وقعت
طاقت کے نشے میں ڈوبے سبھی سلطانوں کو عبرت حاصل ہو

اس ضمن میں کچھ اقتباسات ملاحظہ فرمائیں جن میں مسجد نبوی کا تربیتی اور تعمیری کردار اپنے باطن سے واقفیت اور خودنگری پر مباحث قائم کرتا ہے جسے ماہرین نفسیات باطن میں مخفی قوتوں کا مخزن قرار دیتے ہیں:

یہ طاقت جس نے وسعت دی تفکر کی تمازت کو
بشر کی باطنی آنچ اور روحانی حرارت کو
مسجد نبوی کا مطلب ایک ایسی درسگاہ
بخش دے جو علم کی دولت سبھی کو بے پناہ
صرف راحت ہی نہیں، اک راستہ بھی مل سکے
مسئلوں کی بھیڑ میں گھبرائے ہر اک فرد کو

لوگ سمجھیں اور سمجھائیں بشر کے درد کو
جھاڑ دیں روح و بدن سے واہموں کی گرد کو
شرک اور انکار کے نرغے میں سمٹا آدمی
اپنے باطن میں چھپے حق کی حقیقت جان لے

مذکورہ بالا اقتباسات کے علاوہ لولاک میں آئیڈیالوجکل نوعیت کے کئی شعری مندرجات ہیں جو نعتیہ بیانیہ کے موضوعاتی اور نظریاتی وسعتوں کے باب روشن کرتے ہیں جن سے ہماری معاصر اردو نعوت کا دامن ہنوز خالی ہے۔سرورِ کونینؐ کی ذات پاک کے نظریاتی (Idealogical) ابعاد کو وقت اور سرحدوں کی حد بندیوں سے پرے اور آفاقیت سے ہمکنار رکھنا اس نعت کا ایک قابل ذکر کنٹری بیوشن ہے۔فکر نبویؐ دورِ حاضر کے عالمی نظریاتی عالمی کونٹیکسٹ میں سرچشمہ نور و ہدایت کا حکم رکھتی ہے۔عہدِ رواں کے بیشتر مکاتب فکر اپنے عصر کے خدوخال اور اس کی کثیر الجہات شناخت پر ڈسکورسیز قائم کرتے ہیں۔اپنے حتمی معنی میں ان ڈسکورسیز کا نصب العین انسانی فلاح و بہبود، SocietySane یا صحت مند معاشرے کی تشخیص و تشکیل ہے ان ڈسکورسیز میں فکر نبویؐ کی بازگشت واضح طور پر محسوس کی جاسکتی ہے جس کی داغ بیل تقریباً ڈیڑھ ہزار سال پہلے ڈالی گئی تھی۔

موجودہ دور کی تمام غالب تھیئریز (نظریات) خواہ نو مارکسیت ہو، پس نو آبادیاتی نظریات ہوں colonization یا استعماریت اور استحصال مرکوز ڈسکورسیز ہوں، فسطائیت آمیز رویے ہوں، نسلی اور جنسی تفریقات ہوں، فوکو کے پاور ڈسکورسیز ہوں، سارتر کے فلسفہ وجودیت میں آزادی و ذمہ داری کے تصورات ہوں، کرکیگارڈین اندرونی تضادات ہوں کہ اس کا a as Faith despair of out leap ہو، انسانی رشتوں کے ابتذال پر نظریات ہوں، نزاعی یا پھر مدافعتی نظریات ہوں، فکر نبویؐ کے صرف یک سطری صدائے احتجاج پر نظر کیجیے گا لولاک کے ممدوح کی فکر تمام افکار کے آفاق و افلاک پر چھائی ہوئی نظر آئے گی:

سبھی محکوم و بے آواز حلقوں کو زباں دے کر

موجودہ دور کے ایک غالب نظریہ پر غور فرمائیے کا جسے مغربی دنیا میں Subaltern theory کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے یا عالمی ادب میں اقلیتی ادب/ حاشیہ رسید ادب کے تصورات پر نظر ڈالیے گا اور نظم کے اظہارات ملاحظہ فرمائیے گا۔''فاتح و مفتوح کی فطرت''۔۔۔''بدل دینا''،''آزاد کرنا''، ''حق و انصاف'' اور ''مکمل انقلاب زندگی'' اور ''آزادی دانش'' کی نظم بندی اور ''ایک اجلے تمدن کی بشارت'' پر توجہ کیجیے گا۔نظریاتی انسلاکات کا ایک لامتناہی سلسلہ ذہن کے پردۂ سیمیں پر چلتا رہے گا۔فکر نبویؐ کا تاثر تیز تر ہوتا رہے گا۔درج ذیل شعر ملاحظہ فرمائیے گا اور صرف ایک لفظ ''جاتیوں'' پر غور کیجیے گا، بھارت یا برصغیر میں ہی نہیں بلکہ ساؤتھ افریقہ، یوروپ، امریکہ اور نہ جانے کون کون سے ملکوں کے استحصالی، سازشی اور جبر و تشدد کے سیاق واضح ہوتے چلے جائیں گے:

آدمی تو آدمی سے دور ہو سکتا نہیں
جاتیوں کے نام پر محصور ہو سکتا نہیں

فکر نبویؐ پندرہ سو سال پہلے اس تفریقی اور استحصالی سوچ کے دانشورانہ تدارک کے سمت اپنی کاوش درج کروا چکی تھی۔

لولاک کا ایک قابل ذکر وصف یہ بھی ہے کہ اس مدحت رسولؐ میں بظاہر banal اور پیش پا افتادہ لفظیات کے توسط سے انسانی عفریتیت اور المناک تاریکیوں کے بالمقابل رسول کریمؐ کی نہ صرف فکر بلکہ فکر کے حسن و جمال کا ایک آفاقی تناظر خلق کیا گیا ہے۔بہ الفاظ دیگر یہ لفظیات آئیڈیالوجی مرکوز ہیں جنہیں نعتیہ/ بیانیہ کے اسٹرکچر میں تخلیقی منصوبہ بندی کے تحت رچا گیا ہے۔ان لفظیات یا زبان کی کارفرمائی فن اور تفکر ہر دو سطحوں پر دیکھی اور محسوس کی جاسکتی ہے۔فنی سطح پر یہ بیانیہ کی سلاست، موسیقی آمیز روانی اور جمالیاتی و معنوی تاثر خیزی میں کلیدی کردار ادا کرتی ہے۔دوسری طرف ذات پاکؐ کے آئیڈیالوجکل/نظریاتی /فکری ڈائمینشن اور اس ڈائمنشن کے اعتبار و استناد کے جواز بھی فراہم کرتی ہے۔

انسانی عظمتوں کی (دنیاوی و اخروی) بحالی اور فرد و معاشرہ کی تطہیر و تقدیس فکر نبوی اور اس نعت کے تاسیسی عناصر ہیں۔فکر/نظریۂ رحمۃ للعالمین کا جوہر انسان کے مکمل تحول، مجموعی تبدیلی یا TransformationTotal کے تصور میں پیوست ہے۔فرد جو اکائی بھی ہے اور معاشرتی اجتماعیت کی علامت بھی۔فرد اور معاشرہ ایک دوسرے کی تشکیل و تعمیر ہی نہیں ایک دوسرے کی تخریب میں بھی فیصلہ کن کردار کرتے ہیں۔پاک وصاف اور صحت مند معاشرے کی تعمیر اس وقت تک ممکن نہیں جب تک افراد کی تطہیر نہ ہو۔فرد کے اندرون میں خود ارتکازی، مادہ پرستی، یا لذت کوشی کے جرثومے کی ہلکی سی موجودگی بھی اس کے اپنے اور اپنے معاشرے کے تئیں اس کی دیانت داری کو کالعدم قرار دے سکتی ہے۔سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''مادہ پرستانہ فلسفہ کے ساتھ آدمی کے اندر دیانت داری کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' (دروس قرآن، ص:۱۱۶۔۲۶)

اسی لیے فکر نبوی میں فرد اور معاشرے کی مابعد الطبیعات کو اہم ترین مقام حاصل ہے۔فکر نبویؐ انسان کے اندرون سے مکالمہ قائم کرتی ہے۔اس بیان کے مختصر تصدیقی اشارے و اشعار گذشتہ صفحات میں پیش کیے جاچکے ہیں۔فکر و فلسفہ کی یہی وہ نہج ہے جہاں دنیا بھر کے دانشوروں اور مکاتب فکر و فلسفہ سے فکر نبویؐ اپنا افتراق یا اختلاف اور امتیاز قائم کرتی ہے۔انسانی نجات (دنیاوی و اخروی) کی تمام راہیں انسانی اندرون ہی سے ہویدا ہوتی ہیں۔

یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری محسوس ہوتا ہے کہ فلسفیوں، مفکروں اور نظریہ سازوں کی ہفت اقلیم میں شاید ہی کوئی ایسی مثال ہو جہاں فکر اور مفکر کے درون و بیرون اور روزمرہ میں سرمو بھی فرق نہ ہو۔نبی کریمؐ اس امتزاج اور اس فکر

وعمل کی ہم آہنگی کی لاثانی مثال ہیں۔نبوی فلسفۂ حیات رابطہ کاری daily transaction human اور روزمرہ کی تقدیس اور اکرام واحترام پر یقین رکھتا ہے اور صرف اپنا معاشرہ ہی نہیں ہر اس فرد ومعاشرہ کے خیر کل کو اولین فریضہ سمجھتا ہے جو اس کے رابطہ میں ہو۔اس لیے جہاں تہاں اخلاقیات اور قدغن کو بھی ناگزیر قرار دیتا ہے کیونکہ انسان کے اندرون کا تعلق راست بیرون سے ہوتا ہے۔ اس لیے یہ فلسفہ اندرونی وبیرونی اڑان پر کنٹرول بھی روا رکھتا ہے۔یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ بے جا اندرونی اڑان بیرونی کہرام اور اخلاقی انہدام کا باعث ہوسکتی ہے تاہم بے جا آزادی کے استحقاق کے زعم میں اس نظم وضبط کو غیر ضروری Regimentation سے تعبیر کیا جاتا ہے۔فکر وعمل کی یہی نہج ہے جہاں آزادی کے متوالے، بالخصوص مغرب، اسلامی طریقہ حیات سے نالاں بلکہ خوفزدہ نظر آتے ہیں۔انسانی نفسیات کی خودروی اور پیچیدہ سری ،اس کی vulnerability اور fallibility کے امکانات سے کماحقہ واقفیت اور شدید ترین احساس ذمہ داری کی بنیادی ضرورت پر اصرار، فکر نبویؐ میں روزمرہ کو ماورائیت سے ہمکنار کرتا ہے۔روزمرہ کے اس نبوی تصور کو چندر بھان خیال نے جس خوبصورتی سے نظم کیا ہے لائق تحسین ہے۔مذکورہ بالا اشعار تو دیکھ چکے ہیں دو ایک مثالیں اور ملاحظہ فرمایئے گا:

آپسی امداد پر اصرار کرنا چاہیے
سچ کا سب کے سامنے اظہار کرنا چاہیے
ہاں !مساوات ومحبت کے بنا یہ آدمی
رب کے فیض اصل سے محروم ہے سنسار
آدمی قابض ہو سارے علم اور ادراک پر

روزمرہ زندگی پر بھی رکھی جائے نگاہ

مسجد نبوی کا مطلب ایک ایسی درس گاہ

زندگی پرہیز اور صبر و ادب کا نام ہے
آدمی انسان بن جائے یہی اسلام ہے

سیرت پاکؐ اور فکر نبویؐ کا سرچشمہ قرآن مجید ہے۔قرآن مجید جو کتاب ہدایت وحکمت بھی ہے اور کتاب قانون بھی۔حضور اکرمؐ کے تصورات اور روزمرہ اسی منزّل کتاب کی تفسیر ہے۔ایسی تفسیر جسے ایسے علوم وضوابط کا انسائیکلو پیڈیا یا Compendium قرار دیا جاسکتا ہے جو آفاقی سچائیوں کی طرح ہر دور سے مطابقت رکھتے ہیں۔

فکر نبوی کا Culmination، منتہا، خطبہ حجۃ الوداع میں نظر آتا ہے۔اس خطبہ کو ایک لاثانی قانونی دستاویز اور انسانی حقوق اور حقوق اللہ کا چارٹر قرار دیا جاسکتا ہے اور ان تمام چارٹرس کا پیش رو بھی قرار دیا جاسکتا ہے جو حقوق انسانی کے علمبردار کہلاتے ہیں بلکہ فکر نبوی میں تو ایسے معمولات ومعاملات اور اصول وضوابط بھی شامل تھے جو آپؐ کے اپنے عہد اور اس عہد کے پیش رو مفکرین کے تصورات سے بعید تر تھے۔اور دوسری طرف جدید ترین نظریات سے صریحاً مطابقت رکھتے ہیں۔نبی کریمؐ کے جنسی (Gender) ونسلی (Racial) تصورات، افتراق ،استحصال اور امتیازات پر آپؐ کی تاکید وتنبیہ اور آپؐ کی معاشرتی ومعاشی تعبیرات وتعزیرات جدید تحاریک ونظریات سے مطابقت کی واضح ومستند توجیہات ہیں۔ حجۃ الوداع کے مخاطبہ کی کڑیاں آئین مدینہ (مدینہ چارٹر) سے جڑی ہوئی ہیں۔آئین مدینہ کی سیاسی اور طرزِ انتظامیہ کی اہمیت و افادیت کا اعتراف مغربی محققین اور دانشور بھی کر چکے ہیں۔پرامن بقائے باہمی ،بین المذاہب رواداری، اخوت وآشتی، شخصی وقار وآزادی، شہر وشہریت، جان و مال اور آبرو کا تحفظ 622-624 میں تشکیل کردہ ایسے اصول وضوابط ہیں جو ہر دور میں Governance Good کے رہنما اصول رہیں گے تاوقتیکہ ڈیموکریسی کا تصور ہی ختم ہو جائے اور آمریت ،تاناشاہی یا فسطائیت کی حکمرانی ہو۔نبی کریمؐ کی آئیڈیالوجی اور مساوات کا تصور اس عہد کی رومن اور یونانی ڈیمو کرسی کے تصورات سے بدرجہا بہتر ہے گرچہ تہذیبی ارتقا، طرز حکومت وانتظامیہ کے ڈسکورسیز میں یونان اور روم کو بڑی اہمیت حاصل ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ ایتھینس اور روم میں elite یا ممتاز طبقہ کو فوقیت حاصل تھی اور یہ بھی امر واقعی ہے کہ غلاموں، عورتوں اور غریبوں کے لیے کوئی مقام ومرتبہ، کوئی رعایت حاصل نہیں تھی۔فکر نبویؐ نے فوقیت وبرتری، رنگ ونسل کے امتیاز ہی کی نفی کردی۔خیر البشرؐ کا Vision Futuristic حیران کن ہے۔اس وژن اور لائحہ عمل کی عالم انسانیت کو آج بھی شدید ترین ضرورت ہے اور مستقبل قریب وبعید میں بھی اس کی نفی کا کوئی امکان نہیں۔آپؐ تمام قبیلوں کو ایک Community ایک جماعت کی حیثیت سے مخاطب فرماتے ہیں۔چندر بھان خیال نے فکر نبویؐ کے اس تصور کو شعری جمالیات کے ساتھ قافیہ بند کیا ہے۔

توفیق نعت توفیق الٰہیہ ہی سے منسوب ہے۔چندر بھان خیال کو اس ضمن میں بلند کوشش مقدر عطا کیا گیا ہے۔عہد طفولیت ہی میں چندر بھان خیال کو سیرت پاکؐ کے جن پہلوؤں نے بے حد متاثر کیا ان میں نبی کریمؐ کے فکری پہلو کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے۔اپنے انٹرویو میں چندر بھان خیال کہتے ہیں:

''میں نے بچپن ہی میں ایک چھوٹا سا مضمون پڑھا تھا کہ عرب کی سرزمین پر ایک شخص ایسا پیدا ہوا جس نے پورے معاشرے کو بدل کر رکھ دیا۔ غریب امیر کا امتیاز ختم کر دیا اور ظالم کو سبق بھی سکھایا اور ظلم کا خاتمہ بھی کیا اور ایسے معاشرے کی تشکیل دی جس میں سب لوگ امن کے ساتھ زندگی گزاریں۔''

اسی بیان کا متوازی اور موازناتی حصہ دیکھئے گا جس میں چندر بھان خیال کا اپنے فکری موقف کی جانب اشارہ بھی ہے:

''میں جس علاقہ سے وابستہ ہوں آپ جانتے ہیں وہاں پر زمین دارانہ نظام اور سرمایہ دارانہ نظام ،منوادی نظام حاوی تھا۔کمزور طبقہ کیسے زندگی بسر کرتا تھا اس کا اندازہ آج سے پچاس سال پہلے کے حالات کا اندازہ آپ آسانی سے نہیں کر سکتے ہیں۔میں نے دیکھا کہ چودہ سو سال پہلے ہی یہ سب کچھ ہو گیا ہے۔محمد عربی ؐ نے ایک صف میں سب کو کھڑا کر دیا،ایسی شخصیت بھی پیدا ہو گئی اور ہم آج بھی اسی نرک میں جی رہے ہیں۔تو یہیں سے مجھے عقیدت پیدا ہوئی۔نبی کریم ؐ کے بارے میں جاننے کی ایک خواہش پیدا ہوئی ایک اشتیاق پیدا ہوا اور جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی میں آپ کے بارے میں پڑھتا رہا اور پھر یہ دن آیا کہ انھیں کا ہو کر رہ گیا۔''

خطبہء حجۃ الوداع سے متعلق بھی چندر بھان کا خیال کا بیان یہاں قابل ذکر ہے جو صد فی صد سچ ہے۔خیال کہتے ہیں:

آج تک دنیا کی کسی انسانی حقوق کی تنظیم نے اس کے آگے کچھ نہیں کیا۔وہ انسانی حقوق کا ایسا چارٹر ہے کہ اس کے آگے انسان آج تک کچھ نہیں سوچ پایا۔'' Modern Univarsal Declaration of the Human Rights دیکھیں یا The International Convenant of Civial Rights یا اس سے پہلے CartaMegna دیکھیں ،فکر نبوی کا رجحان غالب نظر آئے گا۔فکر نبوی ؐ نے تمام تفریقات و ترجیحات کے تصور کو یکسر رد کر دیا تھا۔نسلی امتیازات (Racism) اور طبقاتی تفریق کی نفی پر اتنا طاقتور بیان 632 میں کہیں اور نظر نہیں آتا۔دنیا کے ترقی یافتہ ممالک آج بھی نسلی تنازعات سے جوجھ رہے ہیں۔خود ہمارا معاشرہ ''جاتی واد'' کاسٹ سسٹم کے بحران سے دوچار ہے۔تصور نبوی کا شعری بیان ملاحظہ فرمائیں۔

غلاموں یعنی اپنے خادموں سے پیار کرنا تم
ہمیشہ بھائی جیسے انس کا اظہار کرنا تم
کبھی احساس ان کو کمتری کا ہونے مت دینا
سلوک سخت سے اپنے نہ ان کو خوار کرنا تم

محبت کے شجر کا نیک سایہ سر بہ سر رکھنا
مری ہر بات کو تم لوگ دل سے باندھ کر رکھنا
سبھی اولاد آدم ہیں سبھی کا حق بھی یکساں ہے
کسی بھائی سے اس کا مال جبراً چھین مت لینا
کشادہ دامن دل ،صاف اور ستھری نظر رکھنا
مری ہر بات کو تم لوگ دل سے باندھ کر رکھنا
نہ گمراہی کی زد میں آ کے حق سے دور ہو جانا
نہ باہم قتل و خوں کی وارداتوں میں الجھنا تم
صداقت کا اجالا ساتھ اپنے عمر بھر رکھنا
مری ہر بات کو تم لوگ دل سے باندھ کر رکھنا

اس فکری بیانیہ کی قرآت کئی بار تشنگی کے احساس سے دوچار ہوتی ہے۔یہ احساس یہاں بھی کہیں کہیں در آتا ہے نبی کریم ؐ کے کئی نکات فکر تک رسائی نہیں ہو پائی ہے،لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے ذات پاک ؐ نبوی اور فکر نبوی ؐ ایک بحر ذخار ہے،اور اس بحر ذخار سے قلم کی نوک پر جو کچھ بھی میسر آ جائے توفیق سعادت ہے۔چندر بھان خیال کے نوک قلم کو جو میسر آیا لاجواب ہے۔نعتیہ تخلیق کے طریقہ کار میں ''لولاک'' ایک نیا باب ہے۔ہر بند کا آخری مصرعہ ایک ٹپ کے مصرعہ یا Refrain کی طرح بیانیہ کی صداقت اور نصیحت کو دلوں پر ثبت کرتا ہے۔''مری ہر بات کو تم لوگ دل سے باندھ کر رکھنا'' میں لہجہ کی ملاحت اور اظہار کا خلوص واضطراب دیکھئے،''تم لوگ'' میں تخاطب کی راستی ہی نہیں،راست پن بھی ملاحظہ فرمائیے،انس و اپنائیت مسخر و مسحور کر دیتی ہے۔اور باندھنے کا تصرف ،سبحان اللہ!دل و دماغ کی یکجائی کا اعلیٰ ترین اظہار ہے کہ عقل جو دماغ سے معنون ہے،دانش و خرد اور قوت مدرکہ سے منسوب ہے اس کے ایک معنی باندھنے یا اونٹ کے پاؤں میں رسی باندھنے کے بھی ہوتے ہیں۔اور تصوف میں یہ لفظ عالم تمیز سے متصف ہے۔''دل سے باندھ لینے'' میں جہاں شدت احساس کو دخل ہے وہیں عقل و خرد اور تمیز و تکریم بھی اہم ہے۔یہ مصرعہ انسلاکات اور معنوی امکانات کے کئی باب روشن کرتا ہے۔

عورتوں کے حقوق اور مقام و مرتبہ کے اعتبار سے خطبہ حجۃ الوداع نہایت تفکر آمیز ڈسکورس ہے۔فیمینزم اپنے تیسرے بلکہ چوتھے ارتقائی مرحلہ کے باوجود بلکہ عالمی سطح پر اپنی معراج کے باوجود،نسوانی وجود کی ان نزاکتوں تک نہیں پہنچ سکا ہے۔جو اس خطبہ میں مذکور و مخفی ہیں۔

فیضان مصطفیٰ جو مذہب اور قانون کے معروف و معتبر ماہر ہیں اپنی Series web Awareness Legal میں خطبہ حجۃ الوداع میں خواتین کے حقوق اور Ownership absolute to Right کے تعلق سے جن نکات کی وضاحتیں کی ہیں،بڑی توجہ طلب ہیں۔آئین ہند کے آرٹیکل ۱۴،آرٹیکل ۵۱،آرٹیکل ۱۲ کے قانونیات اور بنیادی اصولوں کے تحت شہری کو جو حقوق و آزادی حاصل ہے وہ نبی کریم ؐ کے اس خطبے کے اہم مشمولات ہیں لیکن تمام دانشورانہ اور تحقیقی نگارشات کے حوالہ جاتی نظام اعتراف و ذکر نبوی ؐ سے خالی ہیں۔

لولاک میں عورتوں سے متعلق جو بیانات ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔عورت کو خدا اور آدمی کی سوچ کے مابین قرار دینے اور عورت کو امانت کا نصب العین قرار دینے میں حسن و عشق کی لن ترانیاں بھی ہیں،اس کی محبوبیت پر بھی اصرار ہے اور امانت دار کا امانت کے تئیں شدید احساس ذمہ داری بھی ہے۔لفظیات ملاحظہ فرمائیں کتنی سادہ اور سلیس ہیں اور انداز بیان کس قدر دلکش، کس قدر معنی خیز مگر شیریں تنبیہی نطق بیان ہے:

امانت میں تمہاری ایک نصب العین ہے عورت
خدا اور آدمی کی سوچ کے مابین ہے عورت

اسے مجبور مت کرنا ،اسے محبوب رکھنا تم
تمہاری خواب گاہوں اور گھر کا چین ہے عورت
ہمیشہ پیش آنا خوش دلی اور خوش کلامی سے
حقوق اللہ نے اس کے بھی تم پر کر دیئے واجب
تم اس کی غیر پرواہی پہ سختی سے نظر رکھنا
مری ہر بات کو تم لوگ دل سے باندھ کر رکھنا

اپنے تمام تر دانشورانہ سروکار، فکری تصورات اور عصری مطابقت کے باوصف اس نعت کا اہم ترین کارنامہ اس کا فنی وصف ہے۔ کچھ فنی اوصاف کا ذکر تو ہو ہی چکا ہے، کچھ اور محاسن پر نظر ڈالتے ہیں۔ بیانیہ کے مختلف ابواب کا ہیئتی وعروضی اور صوتی اسٹرکچر سادہ ترین مگر پرکار ہے۔ لفظوں کا انتخاب و برملا استعمال، مصرعوں کی مترنم روانی اور زود اثری، تاریخ، ثقافت، معیشت و معاشرت کے معرکہ خیز لفظی و بدیعاتی تلازمات، شعر کی زیریں اور ظاہری سطح کو مرتعش رکھتے ہیں۔ بیانیہ کی قرآت کے کسی نہج پر قاری لحہ بھر کے لیے بھی اس احساس سے دوچار نہیں ہوتا کہ شعریت کی تہہ داری و تازگی کمھلا رہی ہے۔

لولاک میں صنف نعت کے بنیادی تقاضوں اور جمالیاتی محاسن کا ازحد خیال رکھا گیا ہے۔ اس شعری بیانیہ کا اسلوب چندر بھان خیال کی فن کارانہ دسترس کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ ان کے طرز تلفیظ و تجسیم میں تاریخ، جغرافیہ، قرآنی اشارے اور ثقافت کے تلازمات اس مشاقی سے نعتیہ متن میں انگیز کیے گئے ہیں کہ وہ موضوع کے عین مطابق معنوی امکانات قائم کرتے چلتے ہیں۔ مثلاً مغموم ساعت، پربتوں کے دوش پر بیٹھا سکون، مضمحل لذتوں کا بھوت، چیختے فاصلے، سکوت نے، پہاڑی کا دامن اور فرشتے کی پرسکون پیشانی، نغمہ خواں درخت، پتھر، پتیاں، بکریوں کی افسانہ خوانی وغیرہ طرز تجسیم کی ندرت کی کچھ مثالیں ہیں۔

لولاک کے فنی اوصاف کی قدرشناسی کے لیے ایک مخصوص و مفصل مقالہ درکار ہے۔ نظم کی ہیئت بندوں کی ساخت، مصرعوں کی تعداد، قافیہ بندی، بٹ کے مصرعوں کا صوتی، سیاقی اور جمالیاتی کردار، مصاریع کے ارتباط کی غیر روایتی ترتیب، بیانیہ کا ایجاز و اختصار اور بیانیہ کے تقاضوں کے تحت ابواب میں مختلف بحور کا تصرف چندر بھان خیال کی تخلیقی قوتوں کا کارنامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ مصرعوں کی تعداد کہیں تین، چار کہیں پانچ یا چھ بھی ہیں تاہم شعری تصنیف میں کہیں کوئی تصنع نظر نہیں آتا۔ اس نظم میں بحور کا استعمال بھی دیدنی ہے۔ کہیں بحر رمل سالم محذوف، تو کہیں بحر ہزج اشتر سالم، کہیں متدارک تو کہیں بحر ہزج مثمن سالم، شارق عدیل اور خلیل احمد مشیر صدیقی نے اس پہلو کو مخاطب کیا ہے۔ دوسرے مطالعات میں بھی کہیں کہیں اس پہلو کے حوالہ جات ملتے ہیں۔ تاہم چندر بھان خیال کی فنی دسترس کا یہ پہلو ہنوز تحقیقی ارتکاز اور خرد بیں مطالعہ کا متقاضی ہے۔ ہر باب میں بحر کا انتخاب متن کے سیاقی ضرورت کے عین مطابق اپنا جمالیاتی تاثر قائم کرتا ہے۔ ہر بحر کا اپنا ایک مخصوص مزاج، مختلف انداز ترنم اور طرز تفاعل ہوتا ہے جو شعری تکلم کی جمالیاتی منطق قائم کرتا ہے۔ لہجہ اور آہنگ کے توسط سے معنوی وجمالیاتی نیرنگیاں خلق کرتا ہے۔

اس نظم میں حمد کا incorporation چندر بھان خیال کے کمال فن کا لائق ستائش پہلو ہے جس میں حمد و نعت کی صنفی و بیانیاتی تحدید اور تحلیل توجہ طلب ہے۔ باب ''ولادت'' میں حمدیہ طرز اظہار و اسلوب کے توسط سے موجودات کے سریت آمیز اور فلسفیانہ خیالات و سوالات کو فکر نبویؐ سے مربوط کیا گیا ہے معاصر نعت میں یہ لولاک ہی کی کرشمہ سازی ہے۔ تحیر ربوبیت کے انکشاف اور ربوبیت و عبدیت کے درمیان غیر واضح تقرب کا ایک وسیلہ ہے۔ اقبال کے یہاں ہاں ''نگاہ ناز'' ایک حتمی استعاراتی اظہار ہے اور جوش کے یہاں مظاہر کائنات یہ فریضہ انجام دیتے ہیں۔

ایک طرف رب العالمین ہے تو دوسری طرف رحمت اللعالمینؐ، تحدید اس قدر سخت ہے کہ سرمو بھی تجاوز کی گنجائش نہیں۔ اسی لیے نعت گوئی پل صراط سے گزرنے کے مترادف تصور کی جاتی ہے۔ درمیان میں شمہ برابر بھی فروگذاشت قیامت خیز ثابت ہو سکتی ہے۔

اسی طرح سے ایک اور نقطہ ہے جس کے بیان پر مجھے سخت عار اس لیے ہے کہ وہ اس نظم کے بیان کنندہ کے عقیدہ و مذہب سے متعلق ہے لیکن ''محمدؐ پر کسی کی اجارہ داری نہیں'' وہ تو خیر البشرؐ ہیں۔ عرض یہاں یہ مقصود ہے کہ چندر بھان خیال کے عقیدے میں ایشور کی تجسیم بعید از امکان نہیں بلکہ وہ اوتار یا انسانی شکل میں بھی اس دھرتی پر جلوہ افروز ہوتا ہے لیکن ''ہوش و دیوانگی'' اور خالق و مخلوق /محبوب کے نازک ترین مرحلہ سے چندر بھان خیال جس حسن و خوبی اور جس معروضیت سے گزرے ہیں لائق تحسین ہے۔ معروضیت کے باوصف احساس کی شدتیں اور جذبہ کی صداقتیں شد و مد کے ساتھ موجود ہیں یہ چندر بھان خیال کے نقطہ نظر کا اختصاص اور ان کے اکتساب و عقیدت کا فیض ہے۔

عناصر و مظاہر فطرت کو جس حسن و خوبی سے لولاک میں برتا گیا ہے توجہ طلب ہے۔ لولاک کو یہ تخصیص حاصل ہے کہ فطرت کے توسط سے موجودات کے اسرار، علم و عقیدہ، اور ایمان و ایقان، جیسے مسائل بھی کہیں تحیر، کہیں استفسار اور کہیں راست بیان کی شکل میں بیانیہ کو Philosophise کرتے ہیں:

رہ رہے ہیں سب جس میں وہ مکان کس کا ہے
اور لامکانی پر سائبان کس کا ہے
کس کے حکم سے ندیاں بہہ رہی ہیں دھرتی پر
کس نے بخش دی اونچے پرتوں کو اونچائی
کس نے دی سمندر کو بے پناہ گہرائی
کس کے حکم سے موسم لے رہے ہیں انگڑائی

اپنے کثیر الجہت معنی میں مظاہر فطرت بلکہ مظاہر کائنات، عالم انسانیت اور خالق کائنات کے درمیان ایک ازلی ربط کے علائم و استعارہ کا فریضہ بھی انجام دیتے ہیں۔ جوش اسی ربط کا اظہار اس طرح کر رہے ہیں:

ہم ایسے اہل نظر کو ثبوت حق کے لیے
رسول بھیجے نہ جاتے تو صبح کافی تھی

چندر بھان خیال دور جاہلیہ اور خدا ناشناسی کا استعاراتی ذکر بھی فطرت ہی کے توسط سے کرتے ہیں:

تتلیوں کے پر چمکتے تھے،گلوں پر رنگ بھی
دیکھنے والے مگر بینائی سے محروم تھے
صبح صادق کے اجالوں کے معانی کچھ نہ تھے
کوئی بھی واقف نہیں تھا شام کی تحریر سے

وہ کون سے ایسے الفاظ ہیں ،وہ کون سا ایسا مکمل و معجزاتی طریقۂ اظہار ہوسکتا ہے جو سورج کی تمازت، چاند کی برودت، حسن فطرت کی ملاحت، ہواؤں کے وجد، پھولوں کی مہک، شبنم کی خنک، بادِنسیم کا سرور، رتتلیوں کے رنگ ،جھرنوں کے ترنگ ،شفق کی لالی ،نیلگوں آفاق وافلاک کی لامحدودیت ،لہجہ کی موسیقیت اور ناقابل بیان تقدس کو اپنے حیطۂ اظہار میں بیک وقت سمو سکے۔

چندر بھان خیال بخوبی واقف ہیں کہ تخیل کی بانہیں آکاش کو سمو نہیں سکتیں۔اور زبان وقلم کی بساط ہی کیا! مدحت رسولؐ کے لئے انہوں نے کچھ مختلف طرز ہائے اظہار تراشنے کی کوشش کی ہے۔ایک مشاق فکشن نگار کی طرح چندر بھان خیال نے viewofpointreflective کا شعری طریقہ اختیار کیا۔کہیں وہ حق شعار بوڑھے راہب ''بحیرہ'' کے نقطۂ نظر سے اور 'مظاہرِ فطرت' کے وسیلے سے ذات والاصفات کا بیان کرتے ہیں تو کہیں ''شوہر حلیمہ'' سعدیہ کے نقطۂ نظر سے، تو کہیں ''ام معبد'' کے توسط سے۔لیکن جب وہ اپنے نقطۂ نظر سے ذکر نبیؐ کرتے ہیں تو عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ان کے عقیدت وعشق رسولؐ میں بے ساختگی اور والہانہ پن ہے۔اختصار کے پیش نظر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ یہ نظم عقیدت کے ٹرانس trance میں تخلیق کی گئی ہے۔ایک وجدان سا تھا جو چندر بھان خیال پر طاری تھا۔بس ہو کہ آفس، گھر ہو کہ روزمرہ، بس نبیؐ ہی نبیؐ۔ جہاں وہ مدح نبی کریمؐ کرتے ہیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ''سر بازاری رقصم'' کی کیفیت طاری ہے۔اور قاری بھی اسی کیفیت میں لاشعوری طور پر شریک ہوتا چلا جاتا ہے۔بیانیہ کی سحر انگیزی ملاحظہ فرمائیں:

سمت سمت نورانی۔۔۔
جس طرف نظر جائے روشنی کی طغیانی
دشت میں، کہستاں میں، شہر میں، بیابان میں
پرسکون سی ہلچل عالمین امکاں میں
۔۔۔اور زمین کے اوپر
آسمان کے نیچے اک شبیہ لاثانی
جس طرف نظر جائے روشنی کی طغیانی
صاحب کتاب آیا، لے کے پھر شہاب آیا
آ گیا یقین سب کو اہل انقلاب آیا
۔۔۔اور سکوت نے گایا
نور کی ولادت کا گیت ایک لافانی
جس طرف نظر جائے روشنی کی طغیانی
شش جہات نے چوما، کائنات نے چوما
چاند جیسے چہرے کو سب صفات نے چوما
۔۔۔اور حرا کی آنکھوں نے
آمنہ کے آنچل میں دیکھا عکس ربانی
جس طرف نظر جائے روشنی کی طغیانی

'سمت سمت نورانی'، 'اک شبیہ لاثانی'، 'عکس ربانی' اور 'روشنی کی طغیانی' کی موسیقی آمیز تکرار سماع کی سی کیفیت خلق کرتی ہے۔'چاند جیسے چہرے کو سب صفات نے چوما' نہایت سحر انگیز شعری اظہار ہے۔جو ''آں چہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری'' کے لامتناہی سلسلہ کا مخفف ہے۔'ہل چل' اور 'ہل چل' کا 'پرسکون ہونا' ایک انوکھی نوعیت کا تفکراتی پیکر ہے جو فکرِ نو کی پذیرائی اور تعمیر نو کے اشارے فراہم کرتا ہے۔'عالمین امکاں' سے بے ساختہ غالب کے 'دشت امکاں' کی امیج اور شعری تخیل کی اڑان ذہن میں ایک تمثال وتجسیم کی صورت ہویدا ہونے لگتی ہے جس میں امکانات کے کئی جہان آباد ہیں جو فکر نبویؐ سے منسوب ہیں۔ذات اعلیٰ صفات کے دانشورانہ ابعاد کے توسط آپؐ سے عقیدت از خود رفتگی وسرشاری کے مراحل طے کرنے لگتی ہے۔مدحت رسولؐ کی یہ طرزِ نو صنف نعت میں ایک نئے امکان کی نقیب ہے۔نقیب خصوصاً ان معنی میں کہ نعت ہنوز اپنے Define اور Redefine کیے جانے اور اپنے موضوعاتی تنوع اور اسلوبیاتی سروکار کے تخلیقی وانتقادی مراحل سے جوجھ رہی ہے ،اپنے صنفی و بیانیاتی استحکام کے لیے ہنوز کوشاں ہے۔اکادمی سیاست کا اپنا ایک منفی کردار ہے۔لولاک اسی نقطہ نظر سے ایک جستِ نو کا تصور بھی ہے۔یہ مدح رسولؐ کی فکری وفنی ہر دو اعتبار سے نعت کے Missing Dimension کو سنجیدگی سے مخاطب کرتی ہے۔تخلیقی اور لسانی سطح پر وسعتوں کے باب روشن کرتی ہے اور عصر مرکوز عقیدت مندانہ ڈسکورس بھی قائم کرتی ہے۔نیز، اپنے نقاد کی تربیت وتہذیب، اس کے مطالعہ کی وسعت اور عصری علوم و آگاہیوں کے انطباق کی طرف بھی توجہ مبذول کرتی ہے۔موجودہ دور میں یہ طرزِ فکر وتخلیق اس لیے بھی ضروری ہے کہ مغربی مستشرقین اور مخالفین کے منفی ومخاصمانہ تناظر میں حضور اکرمؐ کے صرف نورانی وماورائی ہی نہیں بلکہ دانشورانہ نظام فکر اور لائحہ عمل کی ترسیل بھی کی جاسکے اور کچھ غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کیا جاسکے، خصوصاً اس استناد کے ساتھ کہ محمدؐ کے ڈیڑھ ہزار سالہ نظریات کی گونج جدید ترین نظریات میں واضح طور پر موجود ہے۔نثری نگارشات میں یہ کاوش کبھی کبھار نظر آجاتی ہے تاہم شعری وتخلیقی سطح پر منظم مساعی آج بھی درکار ہے۔''لولاک'' اس سمت ایک توجہ طلب پیش رفت بھی ہے اور نعت نگاروں اور نعتیہ نقادوں کے لیے رہنما ستارہ بھی۔

''آخری سلیوٹ''

ڈاکٹر رئیس افضل
(ہالینڈ)

جب ہندوستان کے آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر کو میکنن میکنزی بحری جہاز میں بٹھا دیا گیا' جہاز 17 اکتوبر 1858ء کو رنگون پہنچ گیا' شاہی خاندان کے 35 مرد وخواتین بھی تاجدار ہند کے ساتھ تھے۔کیپٹن نیلسن ڈیوس رنگون کا انچارج تھا' وہ بندرگاہ پہنچا' اس نے بادشاہ اور اس کے حواریوں کو وصول کیا رسید لکھ کر دی. دنیا کی تیسری بڑی سلطنت کے آخری فرمانروا کو ساتھ لیکر اپنی رہائش گاہ پر گیا' نیلسن پریشان تھا۔بہادر شاہ ظفر قیدی ہونے کے باوجود بادشاہ تھا اور نیلسن کا ضمیر گوارہ نہیں کر رہا تھا کہ وہ بیمار اور بوڑھے بادشاہ کو جیل میں پھینک دے۔مگر رنگون میں کوئی ایسا مقام نہیں تھا جہاں بادشاہ کو رکھا جاسکتا' وہ رنگون میں پہلا جلا وطن بادشاہ تھا۔نیلسن ڈیوس نے چند لمحے سوچا اور مسئلے کا دلچسپ حل نکال لیا' نیلسن نے اپنے گھر کا گیراج خالی کرایا اور ظلِ سُبحانی کو اپنے گیراج میں قید کر دیا۔

بہادر شاہ ظفر 17 اکتوبر 1858 کو اس گیراج میں پہنچا، 7 نومبر 1862 تک چار سال وہاں رہا، بادشاہ نے اپنی مشہور زمانہ غزل:

لگتا نہیں ہے دل میرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالمِ ناپائیدار میں

اور

کتنا ہے بدنصیب ظفر دفن کے لیے
دو گز زمیں بھی نہ ملی کوئے یار میں

اسی گیراج میں لکھی تھی۔

7 نومبر 1862 کا خنک دن تھا، بادشاہ کی خادمہ نے شدید پریشانی میں کیپٹن نیلسن ڈیوس کے دروازے پر دستک دی، اندر سے اردلی نے بدتمیزی کی وجہ پوچھی، خادمہ نے ٹوٹی پھوٹی بَرمی میں جواب دیا:

ظِلِ سُبحانی کا سانس اُکھڑ رہا ہے۔

اردلی نے جواب دیا:

صاحب کتے کو کنگھی کر رہے ہیں، میں انھیں ڈسٹرب نہیں کر سکتا۔

خادمہ نے اونچی آواز میں رونا شروع کر دیا۔

آواز نیلسن تک پہنچ گئی' وہ غصے میں باہر نکلا' خادمہ پاؤں میں گر گئی' وہ مرتے ہوئے بادشاہ کے لیے گیراج کی کھڑکی کھلوانا چاہتی تھی' بادشاہ موت سے پہلے آزاد اور کھلی ہوا کا ایک گھونٹ بھرنا چاہتا تھا' نیلسن نے اپنا پسٹل اٹھایا' گارڈز کو ساتھ لیا' گیراج میں داخل ہوا۔

بادشاہ کی آخری آرام گاہ کے اندر موت کا سکوت تھا' نیلسن آگے بڑھا' بادشاہ کا کمبل آدھا بستر پر تھا اور آدھا فرش پر' اُسکا ننگا سر تکیے پر تھا لیکن گردن ڈھلکی ہوئی تھی' گردن کی رگیں پھولی ہوئی تھیں، ہونٹ خشک اور زرد تھے' نیلسن نے زندگی میں ہزاروں چہرے دیکھے تھے لیکن کسی چہرے پر اتنی بے چارگی اتنی غریب الوطنی نہیں دیکھی تھی' وہ کسی بادشاہ کا چہرہ نہیں لگ رہا تھا، اس چہرے پر ایک آزاد سانس جی ہاں۔۔۔صرف ایک آزاد سانس کی اپیل تحریر تھی اور یہ اپیل پرانے کنوئیں کی دیوار سے لپٹی کائی کی طرح ہر دیکھنے والی آنکھ کو اپنی گرفت میں لے سکتی تھی۔

کیپٹن نیلسن نے بادشاہ کی گردن پر ہاتھ رکھا' زندگی کے قافلے کو رگوں کے جنگل سے گزرے مدت ہو چکی تھی' ہندوستان کا آخری بادشاہ زندگی کی حد عبور کر چکا تھا' نیلسن نے لواحقین کو بلانے کا حکم دیا۔

لواحقین تھے ہی کتنے ایک شہزادہ جواں بخت اور دوسرا اس کا استاد حافظ محمد ابراہیم دہلوی' دونوں آئے۔انھوں نے بادشاہ کو غسل دیا' کفن پہنایا، جیسے تیسے بادشاہ کی نمازِ جنازہ پڑھی' قبر کا مرحلہ آیا تو پورے رنگون شہر میں آخری تاجدار ہند کے لیے دو گز زمین دستیاب نہیں تھی' نیلسن نے سرکاری رہائش گاہ کے احاطے میں قبر کھدوائی، بادشاہ کو دفن کر دیا گیا۔قبر پر پانی کا چھڑکاؤ ہو رہا تھا' گلاب کی پتیاں بکھیری جا رہی تھیں تو استاد حافظ ابراہیم دہلوی کے خزاں رسیدہ ذہن میں 30 ستمبر 1837ء کے مناظر دوڑنے بھاگنے لگے۔جب دہلی کے لال قلعے میں 62 برس کے بہادر شاہ ظفر کو تاج پہنایا گیا تھا۔

ہندوستان کے نئے بادشاہ کو سلامی دینے کے لیے پورے ملک سے لاکھ لوگ دلی آئے اور بادشاہ جب لباس فاخرہ پہن کر' تاج شاہی سَر پر سَجا کر اور نادر شاہی اور جہانگیری تلواریں لٹکا کر دربار عام میں آیا تو پورا دلی تحسین تحسین کے نعروں سے گونج اٹھا۔

نقارچی نقارے بجانے لگے' گویے ہواؤں میں تانیں اڑانے لگے' فوجی سالار تلواریں بجانے لگے اور رقاصائیں رقص کرنے لگیں' بہادر شاہ ظفر کی تاج پوشی کا جشن سات دن جاری رہا، ان سات دنوں میں دِلّی کے لوگوں کو شاہی محل سے کھانا کھلایا گیا، مگر 7 نومبر 1862ء کی اس ٹھنڈی اور بے مہر صبح بادشاہ کی قبر کو ایک خوش الحان قاری تک نصیب نہیں تھا۔استاد حافظ محمد ابراہیم دہلوی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔اس نے جوتے اتارے' بادشاہ کی قبر کے پائینتی کھڑا ہوا اور سورۃ توبہ کی تلاوت شروع کر دی۔حافظ ابراہیم دہلوی کے گلے سے سوز کے دریا بہنے لگے۔یہ قرآن مجید کی تلاوت کا اعجاز تھا یا پھر استاد ابراہیم دہلوی کے گلے کا سوز کیپٹن نیلسن ڈیوس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے' اس نے ہاتھ اٹھایا اور غریب الوطن بادشاہ کی قبر کو سیلوٹ پیش کر دیا۔اس آخری سیلوٹ کے ساتھ ہی مغل سلطنت کا سورج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔

آپ اگر کبھی رنگون جائیں تو آپ کو ڈیگن ٹاؤن شِپ کی کچّی گلیوں

میں آج بھی بہادر شاہ ظفر کی نسل کے خاندان مل جائیں گے' یہ آخری مُغل بادشاہ کی اصل اولاد ہیں، مگر یہ اولاد آج سرکار کے وظیفے پر ہے۔ مگر یہ لوگ اس کسمپرسی کے باوجود خود کو شہزادے، شہزادیاں کہلاتے ہیں' لوگوں کو عہدِ رفتہ کی داستانیں سناتے ہیں اور لوگ قہقہے لگا کر رنگون کی گلیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔

یہ شہزادے اور شہزادیاں کون ہیں؟

یہ ہندوستان کے آخری بادشاہ کی سیاسی غلطیاں ہیں' بادشاہ نے اپنے گرد نااہل' خوشامدی کرپٹ لوگوں کا لشکر جمع کر لیا تھا' یہ لوگ بادشاہ کی آنکھیں اور کان بھی تھے اور اسکا ضمیر بھی' بادشاہ کے دو بیٹوں نے سلطنت آپس میں تقسیم کر لی تھی' ایک شہزادہ داخلی امور کا مالک تھا اور دوسرا خارجی امور کا مختار' دونوں کے درمیان لڑائی بھی چلتی رہتی تھی اور بادشاہ ان دونوں کی ہر غلطی معاف کر دیتا تھا' عوام کی حالت انتہائی ناگفتہ بہ تھی' خوراک منڈیوں سے کٹائی کے موسموں میں غائب ہو جاتی تھی' سوداگر منہ مانگی قیمت پر لوگوں کو گندم' گڑ' ترکاری بیچتے تھے' ٹیکسوں میں روز بہ روز اضافہ ہوتا تھا' شہزادوں نے شہر میں کبوتروں کے دانے تک پر ٹیکس لگا دیا تھا' شاہی خاندان کے لوگ قتل بھی کر دیتے تھے تو کوئی ان سے پوچھ نہیں سکتا تھا' ریاست شاہی دربار کے ہاتھ سے نکل چکی تھی۔ نواب ''صوبیدار'' امیر سلطان آزاد ہو چکے تھے اور مغل سلطنت کو ماننے سے انکاری تھے' فوج تلوار کی نوک پر بادشاہ سے جو چاہتی منوا لیتی تھی۔

عوام بادشاہ اور اسکے خاندان سے بیزار ہو چکے تھے' یہ گلیوں بازاروں میں بادشاہ کو برا کہتے اور کوتوال چپ چاپ انکے قریب سے گزر جاتے تھے۔ جبکہ انگریز مضبوط ہوتے جا رہے تھے' یہ روز معاہدہ توڑتے تھے اور شاہی خاندان وسیع تر قومی مفاد میں انگریزوں کے ساتھ نیا معاہدہ کر لیتا تھا۔

انگریز بادشاہ کے وفاداروں کو قتل کر دیتے تھے اور شاہی خاندان احتجاج کرتا تو انگریز بادشاہ کو یہ بتاتا کہ ''ظل الٰہی وہ شخص آپ کا وفادار نہیں تھا' وہ ننگ انسانیت آپکے خلاف سازش کر رہا تھا'' اور بادشاہ اس پر یقین کر لیتا تھا' بادشاہ نے طویل عرصے تک اپنی فوج بھی ٹیسٹ نہیں کی تھی چنانچہ جب لڑنے کا وقت آیا تو فوجیوں سے تلواریں تک نہ اٹھائی گئیں' ان حالات میں جب آزادی کی جنگ شروع ہوئی اور بادشاہ گرتا پڑتا شاہی ہاتھی پر چڑھا تو عوام نے لاتعلق رہنے کا اعلان کر دیا' لوگ کہتے ہمارے لیے بہادر شاہ ظفر یا الیگزینڈر اوکٹوریا دونوں برابر ہیں' لیکن مجاہدین جذبے سے لبریز تھے۔

بادشاہ ڈبل مائینڈڈ تھا' یہ انگریز سے لڑنا بھی چاہتا تھا اور اپنی مدت شاہی بھی پوری کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس جنگ کا وہی نتیجہ نکلا جو ڈبل مائینڈ ہو کر لڑی جانے والی جنگوں کا نکلتا ہے' شاہی خاندان کو دلی میں ذبح کر دیا گیا۔ جبکہ بادشاہ جلاوطن ہو گیا' بادشاہ کیپٹن نیلسن ڈیوس کے گیراج میں قید رہا' گھر کے احاطہ میں دفن ہوا اور اس کی اولاد آج تک اپنی عظمت رفتہ کا ٹوکرا سر پر اٹھائے رنگون کی گلیوں میں پھر رہی ہے' انکے چہروں پر صاف لکھا ہوتا ہے' جو بادشاہ اپنی سلطنت' اپنے مینڈیٹ کی حفاظت نہیں کرتے' جو عوام کا اعتماد کھو بیٹھتے ہیں' انکی اولادیں اسی طرح گلیوں میں خوار ہوتی ہیں' یہ عبرت کا کشکول بن کر اسی طرح تاریخ کے چوک میں بھیک مانگتی ہیں!!!

''وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا''

- بقیہ -

بغاوت سے پچھتاوے تک

عاشر کے دل کو پہلی بار تینوں کے مرنے کا خیال اچھا لگا اور اس کا ایک آنسو رخسار سے ڈھلک کر بیڈ شیٹ میں جذب ہو کر رہ گیا۔

عاشر کو اس دن کے بعد گھر سے نفرت ہو گئی وہ زیادہ سے زیادہ دیر تک دفتر بیٹھا رہتا وہاں سے اٹھتا تو آوارگی کرتا اور رات گئے جب گھر آتا تو اس کے قدم ڈگمگا رہے ہوتے۔ کنول کی والدہ دونوں کی اس حالت پر شدید پریشان تھیں مگر لاعلمی صرف ان کا تجسس ہی بڑھاتی اور وہ دونوں خاموش اس تجسس کا مداوا نہ کرتے۔ کچھ دن بعد دفتر میں بیٹھے ہوئے عاشر کو اس ہسپتال سے فون آیا جہاں کنول کو داخل کیا گیا تھا۔ وہ ایسی کراہت اور بیزاری سے ہسپتال آیا کہ اس کے قدم بہت تیز تھے شائد کنول کی محبت نے آخری انگڑائی اس کے دل میں لی ہو۔ جب وہ وارڈ میں داخل ہوا تو کنول کی والدہ ایک جھولے کے سامنے بیٹھی ہوئی دیوانہ وار رو رہی تھیں۔ ان کے آنسو قطار کی صورت ان گنت تعداد میں گرتے چلے جا رہے تھے۔ نرس نے عاشر کو بتایا کہ ''سر! وی آر سوری! آپ کی مسز ڈیلیوری کے دوران فوت ہو گئیں'' اور بچے کی طرف اشارہ تھا۔ وہ لڑکا تھا جس کی آنکھیں ابھی کھلنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

عاشر نے بڑھ کر بچے کو اٹھا لیا۔ اس کے آنسو بہنے لگے اور سینہ گھٹ گیا۔ ان گنت امکانات، گناہ کا احساس اور خوف اس کے ذہن میں بھر گئے وہ کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہ تھا۔ وہ کنول کا قاتل تھا۔

ایک صدی کا قصّہ

بابوراؤ پینٹر

دیپک کنول (ممبئی)

بابوراؤ پینٹر؟ یہ نام آپ کو ان سنا اور انجان سا لگے گا۔ کچھ لوگ تو یہ سمجھ لیں گے کہ میں فلمی ہستیوں کو چھوڑ کے اب کسی رنگ ساز یا کسی مصور کی کہانی لے کر آیا ہوں۔ سچ بات یہ ہے کہ میں اپنے موضوع سے ہٹا نہیں ہوں بلکہ اسی موضوع پر قائم ہوں۔ میری یہ کوشش ہے کہ اُن گم نام ہستیوں کو منظر عام پر لاؤں جنہوں نے اس انڈسٹری کو بہت کچھ دیا۔ بابوراؤ پینٹر بھی ایک عظیم فلمی ہستی ہے پر وقت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ آج اس انسان کو کوئی نہیں جانتا جو اس چکا چوند فلمی دنیا کا بانی رہا ہے۔ بابوراؤ کا پورا نام بابوراؤ کرشن راو مستری تھا۔ اُن کا جنم کولہا پور مہاراشٹر میں 3 جون 1890 کو ایک غریب گھرانے میں ہوا تھا۔ اُن کا باپ کرشن راؤ مستری پیشے سے لوہار تھا پر وہ ہر فن مولا تھا۔ وہ سندان پر لوہا پیٹنے کے ساتھ ساتھ بڑھئی کا کام بھی کرتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ مورتیاں بنانے میں بھی مہارت رکھتا تھا۔ وہ پتھر اور سنگ مرمر سے مجسمے بنا کر اُن پر رنگ چڑھانے کا ہنر بھی جانتا تھا۔ ہاتھی دانت کی تراشی میں اُسکا کوئی ثانی نہ تھا۔ وہ ان ہڈیوں سے نایاب چیزیں بنایا کرتا تھا۔ بابوراؤ نے ایک مراٹھی میڈیم اسکول میں چار جماعتیں ہی پڑھیں۔ گھر کے مالی حالت ایسی تھی کہ وہ اپنی پڑھائی جاری نہیں رکھ سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے باپ کے کام میں ہاتھ بٹانے لگا۔ اُسکا چچیرا بھائی آنندراؤ مستری آئل پینٹنگ میں ماہر تھا۔ آنندراؤ کی پینٹنگس دیکھ کر وہ بھی اپنے چچیرے بھائی آنند کے ساتھ آئل پینٹنگ میں ہاتھ آزمانے لگا۔ یہیں سے اُس کی دلچسپی مصوری کی طرف بڑھنے لگی۔

للت کلا درش ناٹک منڈلی کا مالک کیشو راؤ بھوسلے جو کہ کولہا پور سے ہی تعلق رکھتا تھا، ناٹک کی دنیا میں ایک جانا مانا نام تھا۔ ان دونوں بھائیوں کے چرچے ہونے لگے تھے اس لئے کیشو رراے بھوسلے نے 1909 میں ان دونوں بھائیوں کو بمبئی بلایا۔ وہ اپنے اسٹیج کے پس منظر کو ناٹک کے موضوع کے حساب سے پینٹ کروانا چاہتا تھا۔ اُنہوں نے جس طرح اسٹیج کو اپنے برش اور رنگ سے سجایا اُسے دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ اُنہوں نے دھیرے دھیرے سیٹ ڈیزائننگ کا تصور ہی بدل دیا۔ 1910 سے لے کے 1916 تک کئی سارے ناٹکوں کے اسٹیج اُنہوں نے اپنی کلا سے سجائے۔ ان میں کلوسکر ناٹک منڈلی، بال گندھروا کے ناٹک اور کئی پارسی ڈرامے تھے جن کے لئے ان دو بھائیوں نے اسٹیج کے پس منظر کو اپنے برش سے رونق بخشی۔ ناٹکوں سے زیادہ اُن کے سیٹوں کی چرچا ہونے لگی۔ لوگ ناٹک سے کہیں زیادہ اُن کے سیٹ دیکھنے کے لئے آیا کرتے تھے۔ یہ اُن کی ہی کلاکاری تھی کہ اُنہوں نے اسٹیج کے پردوں کو اتنی خوبصورتی کے ساتھ تیار کیا کہ ہر طرف اُن کے ڈنکے بجنے لگے۔ اُن کے بے مثال کام کی وجہ سے اُن کا نام مونیکر پینٹر پڑھ گیا جو بعد میں بابوراؤ پینٹر اور آنندراؤ پینٹر میں تبدیل ہوگئے۔

بمبئی میں قیام کے دوران اُنہوں نے 1913 کی فلم ''راجہ ہریش چندر'' دیکھی جسے دادا ساحب پھالکے نے بنایا تھا۔ جب اُنہوں نے یہ فلم دیکھی تو اُنہیں فلم تو بے حد پسند آئی پر اس بات سے اُنہیں مایوسی ضرور ہوئی کہ فلم میں کوئی بھی زنانہ اداکارہ نہیں تھی بلکہ جتنے بھی زنانہ کردار تھے وہ بھی مردوں نے ہی عورت بن کر ادا کئے تھے۔ اصل میں اُس زمانے میں عورتوں کے لئے ناٹکوں میں کام کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس فلم کے بعد اُنہیں فلمیں دیکھنے کا ایسا چسکا لگا کہ جو بھی فلم ریلیز ہوتی وہ اُسے دیکھنے ضرور جاتے تھے۔ ان فلموں نے اُن کے دل و دماغ پر ایسا اثر ڈالا کہ جب وہ واپس کولہا پور لوٹ گئے تو دونوں بھائیوں نے فیصلہ کیا کہ وہ بھی ایک خاموش فلم بنائیں گے۔ وہ فلم سازی کی تیکنک کے بارے میں بالکل انجان تھے۔ اُنہیں یہ بھی پتا نہیں تھا کہ ایک فٹ فلم میں کتنے فریم ہوتے ہیں۔ لیکن فلم سازی کا جنون اُن پر اس قدر حاوی ہو چکا تھا کہ وہ کسی بھی قیمت پر فلم بنانا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے ایک پروجیکٹر خریدنے کا فیصلہ کیا۔ بابوراؤ اور آنندراؤ نے بمبئی کے چور بازار سے ایک پروجیکٹر خرید لیا تھا۔ کولہا پور پہنچ کر اُنہوں نے ایک مراٹھی تھیٹر کھڑا کیا۔ یہ سوچ کر کہ اگر اُن کا یہ تھیٹر چل گیا تو وہ اس سے کمائے پیسے سے فلم بنالیں گے۔ وہ فلمیں خریدتے تھے اور اُنہیں اس تھیٹر میں چلاتے تھے۔ یہ فلمیں چلاتے چلاتے اُنہیں فلم سازی کے بارے میں بہت ساری چیزوں کا ادراک ہونے لگا۔ اُن دنوں فلم سازی میں کام آنے والی ہر شے باہر سے منگائی جاتی تھی۔ فلم سازی کے لئے سب سے اہم اور پہلی چیز کیمرہ تھا جو بہت مہنگا تھا جسے خریدنا اُن کی بساط سے باہر تھا۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ خود کیمرہ بنالیں گے۔ آنندراؤ نے کیمرہ تیار کرنے کا ذمہ لیا۔ وہ تن من سے فلمی کیمرہ کی تیاری میں جٹ گیا۔ آنندراؤ نے کباڑ میں سے پرزے ڈھونڈ ڈھونڈ کر کیمرہ بنانے کی سعی کی ۔شومئی قسمت کہ اُن کا یہ سپنا اُدھورا رہ گیا۔ آنندراؤ کی 1916 کے آخر میں اچانک اور بے وقت موت ہوگئی۔

بابوراؤ کے لئے یہ بہت بڑا دھچکا تھا۔ آنندراؤ اُس کا بھائی ہی نہیں اُس کا رفیق کار اور اُس کا رہبر بھی تھا۔ اُس نے ہمت نہیں ہاری۔ اُس نے یہ عہد کیا کہ چاہے کچھ بھی ہوجائے وہ اپنے بھائی آنندراؤ کے خواب کو پایہ تکمیل تک پہنچائے گا۔ وہ سب کام چھوڑ کے ادھورے کیمرے کو مکمل کرنے میں جٹ گیا۔ کیمرے کو بنانا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ یہ اُس کی لگن اور جنون تھا کہ اُس نے یہ کام پورا کیا۔ اس کام کو پورا کرنے میں اُسے دو سال لگے۔ اُس نے بائیس سال کی عمر سے اپنی داڑھی بڑھائی تھی، کام میں اسقدر مصروف ہونے کے باعث داڑھی بڑھتی چلی گئی اور پھر اُس نے اس بڑھتی ہوئی داڑھی کو اپنی پہچان بنا لیا۔ جیسے ہی

کیمرہ تیار ہوا اُس نے اس کیمرے سے کئی طرح کے منظر فلم بند کئے۔ جیسے بچوں کے رنکلا جھیل میں تیرنے اور گھاٹ پر عورتوں کے کپڑے دھونے کے کئی مناظر اُس نے اپنے اس تخلیق کردہ کیمرے سے فلم بند کئے۔ چونکہ کولہا پور میں فلم کو دھونے کے لئے کوئی لیبارٹی نہیں تھی اس لئے اُس نے نہ صرف فلم دھونے کے لئے کیمسٹری کی مدد سے ایک چھوٹی موٹی لیبارٹی تیار کی بلکہ فلم کو پرنٹ کرنے کی مشین بھی بنا ڈالی۔ اس کاوش میں وہ کس حد تک کامیاب ہو چکا ہے یہ جاننے کے لئے وہ بہت بے تاب تھا۔ جب وہ شاٹ لے کے ایک تھیٹر میں گیا اور جیسے ہی اُس نے یہ منظر پردے پر دیکھے تو وہ بلیوں اُچھل پڑا۔ اُس کی سالوں کی محنت رنگ لائی تھی۔ جس کام کے لئے اُسے ہزاروں روپے خرچ کرنے پڑتے وہ ساری چیزیں اُس نے چند پیسوں میں گھر بیٹھ کے تیار کی تھیں۔ اُس نے اپنے بھائی آنندراؤ کے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا تھا۔ یہ پہلا سودیشی کیمرہ تھا۔

1918 میں اُس نے اپنی فلم کمپنی ''مہاراشٹر فلم کمپنی'' کی نیو ڈال دی۔ اس کمپنی کے ساتھ وی جی ڈاملے، ایس فتح لال اور رائٹر نانا صاحب سر پوتدار اور بابوراؤ پنڈیکر جڑ گئے۔ بعد میں وی شانتا رام بھی بطور ایک مددگار کے اس ٹیم کے ساتھ شامل ہوا۔ بابوراؤ کے پاس فلم بنانے کے لئے سرمایے کی کمی تھی۔ کولہا پور کے ساہوکار نے اُس کی کافی مدد کی تھی۔ اسٹوڈیو بنانے کے لئے اُسے زمین ہی نہیں بلکہ جنریٹر خریدنے کے لئے پیسے بھی دئے تھے۔ ساتھ ہی کچھ اور چیزیں بھی اُسے مہیا کی تھیں۔ یہ اسٹوڈیو وہاں پر بنایا گیا جہاں پر آج کیشو بھائی ناتیہ گرہ ہے۔ مراٹھی کی ایک مشہور گلوکارہ تانا بائی گالکر نے اُس کی ہزار روپے دیکر مالی مدد کی۔ کہانی کی تلاش شروع ہوگئی۔ اُس نے ''سیتا سوئمبر'' نام کی ایک کہانی تیار کروا لی۔ یہ کہانی سیتا کے بیاہ پر مبنی تھی۔ اس میں مرکزی کردار سیتا کا تھا۔ اُن دنوں دھارمک فلموں کا چلن تھا اور انہیں کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ سب کچھ تیار تھا۔ مسئلہ یہ کھڑا ہو گیا تھا کہ سیتا کا کردار کون ادا کرے گا کیونکہ کوئی بھی لڑکی فلم میں کام کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ وہ بھی کولہا پور کے قدامت پسند سماج میں جہاں مردوں کا دبدبہ تھا۔ اُنہوں نے بہت کھوج کی پر اُنہیں کامیابی نہ ملی۔ مایوس ہو کر اُنہیں یہ پروجیکٹ ترک کرنا پڑا۔

دوسری کہانی پر کام ہونے لگا۔ فلم کا نام ''سارن دھری'' رکھا گیا۔ اب کے بار اُس نے قسم کھائی تھی کہ وہ کسی نہ کسی لڑکی کو فلم میں کام کرنے کے لئے آمادہ کرلے گا۔ اُس کی ملاقات ایک عورت سے ہوئی جس کا نام گلاب بائی عرف کملا دیوی تھا۔ وہ اُسے قائل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اُس کے کچھ دن بعد اُس نے ایک اور عورت انوسویا بائی عرف سوشیلا دیوی کو بھی فلم میں کام کرنے کے لئے راضی کرلیا۔ یہ ہندوستان کی پہلی فلم تھی جس میں پہلی بار عورتیں کام کرنے کے لئے تیار ہوئی تھیں۔ فلم کی شوٹنگ بڑے شد و مد سے ہوئی۔ لوگ بڑی بے صبری سے اس فلم کا انتظار کرنے لگے۔ یہ فلم 7 فروری 1920 کو پونے کے آرین تھیٹر میں ریلیز ہوئی۔ جب ہندوستان کے ایک ممتاز لیڈر بال گنگا دھر تلک نے یہ فلم دیکھی تو وہ بابوراؤ کے کام سے اس قدر متاثر ہوا کہ اُسنے بابوراؤ کو نہ صرف گولڈ میڈل سے نوازا بلکہ اُسے سینما کیسری کے خطاب سے سرفراز کیا۔ مہا بھارت کے پس منظر میں بنی اس فلم کی فلمی نقادوں نے جس طرح پزیرائی کی اور مثبت لیکھ لکھے اُس سے بابوراؤ کو کافی فائدہ ہوا اور فلم نے باکس آفس پر دھوم مچا دی۔ اس فلم کے ایک سین کو جسے گرافک عکاسی سے تیار کیا گیا تھا دیکھ کر تھیٹر میں بیٹھی ایک لڑکی کھڑی ہو کر ڈر کے مارے چلانے لگی۔ یہ وہ منظر تھا جہاں بھیما فلم کے ولین کیچک کو قتل کر دیتا ہے۔ سین اتنی عمدگی سے فلمایا گیا تھا کہ لڑکی کو لگا کہ سچ مچ کیچک کا قتل ہو رہا ہے۔ اس ایک منظر کی وجہ سے برٹش سرکار کے کان کھڑے ہو گئے۔ اُنہوں نے بابوراؤ سے کہا کہ وہ اس سین کو سنسر کرائے۔ یہاں سے سنسر کے چلن کا آغاز ہو گیا۔

فلم کی کامیابی سے خوش ہو کر بابوراؤ کو اور فلمیں بنانے کی تحریک مل گئی۔ بابوراؤ کی دوسری فلم ''سریکھا ہرن'' بھی بے حد کامیاب رہی۔ اس فلم کی کامیابی سے اُس کی مالی حالت اس حد تک اُستوار ہو گئی کہ اُس نے اُس وقت کا سب سے بہترین اور قیمتی کیمرہ خریدنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے بیل اینڈ ہول کا تیار کردہ کیمرہ خریدا۔ جب اُس نے اس کیمرہ سے اپنی تیسری خاموش فلم ''مار کنڈیا'' کی فلم بندی شروع کی، اُنکے گودام میں اچانک آگ لگ گئی جہاں فلموں کے نیگیٹیو اور کمپنی کا سٹاک پڑا تھا۔ چونکہ فلمیں پلاسٹک سے بنتی ہیں اسلئے آگ تیزی سے پھیل گئی۔ اس آگ میں سب کچھ جل گیا۔ فلموں کے سٹاک کے ساتھ ساتھ وہ سودیشی کیمرہ بھی جل کر راکھ ہو گیا جسے اُس نے کڑی محنت سے بنایا تھا۔ شکر ہے کہ نیا کیمرہ اس آگ میں محفوظ رہا۔ سردار نسار یکر نے کمپنی کو اس بحران سے باہر نکالا۔ اُس نے بارہ ہزار کا سرمایہ بابوراؤ کو فراہم کیا۔ بارہ ہزار اُس وقت کے حساب سے بہت بڑی رقم تھی۔ بدلے میں اُس نے کمپنی میں حصہ داری مانگی۔ اس طرح وہ کمپنی میں حصہ دار بن گیا۔

یہ وہ دور تھا جب فلم سازی مشکل کام تھا۔ نہ کوئی انٹرنیٹ تھا، نہ کوئی فلم انسٹیٹیوٹ اور نہ ہی کوئی سکھانے والا تھا۔ فلم کی شوٹنگ قدرتی روشنی میں کی جاتی تھی۔ سورج دیوتا اگر مہربان ہوتا تو شوٹنگ ہوتی تھی۔ اگر بادل چھا جائیں تو شوٹنگ ہو نہیں سکتی تھی۔ رات میں تو شوٹنگ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بابوراؤ نے کئی بار سوچا کہ رات کو کیوں شوٹنگ نہیں ہو سکتی؟ وہ کوئی ایسی سبیل نکالنے میں جی جان سے لگا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ وہ کوئی نہ کوئی ایسی ترکیب نکالیں گے جس سے جب انسان چاہے شوٹنگ کرلے۔ اُس کے دوستوں نے اُسے سمجھایا کہ وہ سورج کا بدل ڈھونڈنے میں وقت ضائع نہ کرے کیونکہ اس طرح کی کوشش کرنا عبث ہے۔ سورج کی روشنی کے بنا شوٹنگ ہونا ممکن نہیں ہے اسلئے وہ کوئی ایسا تجربہ نہ کرے جو کمپنی کے لئے نقصان دہ ثابت ہو۔ بابوراؤ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اُس نے زندگی میں ہار ماننا نہیں سیکھا تھا۔ اُس نے ناممکن کو ممکن بنا دیا تھا۔ دوستوں کے سمجھانے کے باوجود وہ اپنے کام میں لگا رہا۔ ایک دن رات کے

وقت وہ جیب میں بارود کا پوڈر لے کر آ گیا اور شوٹنگ سے پہلے اسے جلایا۔ بارود کے جلتے ہی پورا سیٹ روشنی سے جگمگا اُٹھا۔ یہ ایک معجزہ تھا جو اُس نے کر کے دکھایا تھا۔ اُس نے ایک دن فیصلہ کیا کہ وہ رات کے وقت اپنے اس فارمولے کو شوٹنگ کر کے آزمائے گا۔ اُن دنوں وہ اپنی مراٹھی فلم ''سنہا گڑھ'' کی شوٹنگ میں مصروف تھا۔ ایک دن اُس نے تمام کلاکاروں اور ٹیکنیشنز کو رات کو سیٹ پر موجود رہنے کا حکم جاری کیا۔ رات کو جب سب لوگ سیٹ پر موجود تھے تو اُس نے کیمرہ مین سے کہا کہ وہ کیمرہ تیار رکھے۔ اداکاروں کو شاٹ کے لئے کیمرہ کے سامنے کھڑا کیا گیا۔ جیسے ہی اُس نے کیمرہ اسٹارٹ کرنے کو کہا تبھی اُس نے جیب سے گن پاوڈر نکال کر اُسے آگ دکھائی۔ بس پھر کیا تھا، سیٹ جگمگا اُٹھا اور شاٹ مکمل ہوا۔ یہ ہندوستان کی فلمی تاریخ میں پہلا موقع تھا جب کسی فلم ساز نے بناوٹی روشنی سے شوٹنگ کی تھی۔ یہاں سے لائٹنگ اور ریفلیکٹر کی ابتدا ہوئی جو آج تک قائم و دائم ہے۔

اساطیری کہانیوں پر فلمیں بنانے کے ساتھ بابوراؤ نے تواریخی پس منظر پر مبنی کچھ فلمیں بنائیں جن کے نام اس طرح ہیں۔ ''سنہا گڑھ'' 1923 یہ فلم اس قدر کامیاب رہی کہ مہاراشٹر سرکار کے خزانہ محکمے نے 1923 میں تفریحی ٹیکس کا بل پاس کیا اور اس طرح تفریح ٹیکس ایک قانون کی شکل اختیار کر گیا۔ ایک صدی گزر گئی۔ انگریز ہندوستان چھوڑ کے چلے گئے مگر تفریحی ٹیکس کا قانون نہیں بدلا۔ بابوراؤ ہمہ جہت فن کار تھا۔ وہ پینٹر تھا، مصور تھا، لیکھک تھا، ہدایت کار تھا، سیٹ ڈئزائنر تھا اور ساتھ ہی اداکار بھی تھا۔ اُس نے یہ سارے رول بخوبی ادا کئے۔ ''سنہا گڑھ'' فلم کی شوٹنگ کے دوران بابوراؤ جو کہ اس میں اداکاری بھی کر رہا تھا گھوڑے سے گرا جس سے اُس کے سر میں چوٹ لگی۔ اس چوٹ کی وجہ سے اُس نے اپنی آواز کھودی اور وہ زندگی بھر کے لئے گونگا ہو گیا۔

بابوراؤ نے اپنے کام سے کبھی سمجھوتہ نہیں کیا۔ اُس کی کمپنی سے بہت سارے لوگ جڑے ہوئے تھے جن کی روزی روٹی فلموں سے ہی چلتی تھی۔ اپنی صحت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُس نے فلمیں بنانے سے ناغہ نہ کیا۔ 1924 میں اُس نے ''کلیان کھجینا'' بنائی اور اگلے سال اُس کی فلم ''ستی پدمنی''۔ 1925 ریلیز ہوئی۔ دونوں فلمیں پبلک کی پسند کی تھیں اور دونوں فلموں نے اچھا بزنس کیا۔

دادا صاحب پھالکے دھارمک اور تاریخی کہانیوں سے باہر نہیں آ رہے تھے۔ دوسرے فلمساز اساطیری کہانیوں میں اُلجھے ہوئے تھے جب کہ سماجی موضوع پر فلمیں بنانے کی جسارت کوئی نہیں کر رہا تھا۔ بابوراؤ پہلا فلمساز تھا جس نے اس ضمن میں پہل کی۔ سماج میں ہو رہی ناانصافی کے خلاف وہ آواز اُٹھانا چاہتے تھے۔ وہ اپنی فلموں کے وسیلے سے سماج میں بیداری لانا چاہتے تھے۔ بابوراؤ نے ایک ایسا موضوع چنا جو سیدھے طور پر غریب اور نادار کسانوں سے جڑا ہوا تھا کہ کس طرح بڑے بڑے جاگیردار غریب کسانوں کا استحصال کرتے ہیں۔ اُس نے ایک کہانی تیار کی جس کا نام ''ساوکاری پاش'' رکھا گیا۔ یہ کہانی مشہور مراٹھی رائٹر نارائن ہری آپٹے کے ایک افسانے پر مبنی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب بابوراؤ اپنی روش سے ہٹ کر فلم بنانے جا رہا تھا۔ یہ ایک سلگتا ہوا موضوع تھا کہ کس طرح سود خور بنئے اور جاگیردار غریب کسانوں کو قرض کے جال میں پھانستے ہیں اور پھر ساری زندگی اُن کا خون چوستے ہیں۔ یہ پہلی فلم تھی جو روایت شکن ثابت ہونے والی تھی۔ بابوراؤ کو پوری اُمید تھی کہ یہ فلم باکس آفس پر تہلکہ مچادے گی مگر ہوا اس کے اُلٹ۔ فلم جب ریلیز ہوئی تو باکس آفس پر ناکام ثابت ہوئی۔ فلم سازوں نے فلم بینوں کو دھارمک اور لوک کتھاوں پر مبنی فلموں کا ایسا عادی بنا دیا تھا کہ وہ اس طلسم سے باہر آنا نہیں چاہتے تھے۔ پبلک کو یہ حقیقت پسند فلم نہیں بھائی البتہ فلمی نقادوں نے فلم کی دل کھول کر تعریف کی۔ کاروباری لحاظ سے یہ فلم ناکام ثابت ہوئی۔ بابوراؤ کا اس فلم کے نہ چلنے سے بہت نقصان ہوا۔ بعد میں اسی موضوع پر بمل رائے نے ''دو بیگھہ زمین'' جیسی فلم بنائی جس نے کامیابی کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ ''ساوکاری پاش'' کی ناکامی سے دل برداشتہ ہو کر وہ پھر سے اپنے پرانے دھڑے پر لوٹ گیا اور پھر سے وہی دھارمک اور تواریخی فلمیں بنانے لگا۔

بابوراؤ فلم سازی کا سرخیل تھا۔ اُس نے پانچ سو کے قریب ٹیکنیشنز تیار کئے جن میں کہانی کار، منظر نگار گیت کار، ہدایت کار، آرٹ ڈائرکٹرس اور اداکار تھے۔ وہ کردار کے حساب سے اداکار چنتا تھا۔ کبھی کبھار سیٹ پر کام کرنے والے ترکھان یا ٹیکنیشن کی قسمت بھی جاگ جاتی تھی اور وہ بھی اداکار بن جاتا تھا۔ وی شانتارام جو کہ اسٹوڈیو میں چھوٹے موٹے کام کرتا تھا وہ بھی اداکار بن گیا۔ 1932 کی فلم ''سریکھا ہرن'' کے ایک اہم کردار میں جلوہ افروز ہو گیا۔ بعد میں وی شانتارام نے جس طرح نام کمایا یہ سب بابوراؤ کی دین تھی۔

بابوراؤ نے کئی خاموش فلمیں بنائیں اور اُس کے بعد ''مہاراشٹر فلم کمپنی'' کو اُس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بند کیا۔ اُس کے معاون وی شانتارام، وی جی ڈاملے اور ایس فتح لال جو اُس کی چھتر چھایا میں پلے بڑھے تھے وہ ''پربھات فلم کمپنی'' میں چلے گئے جس نے کئی مشہور اور کامیاب مراٹھی فلمیں بنائیں۔ ''مہاراشٹر فلم کمپنی کے بند ہونے کے بعد اُس نے کئی فلموں کی ہدایت کاری کی جن کے نام تھے ''اوشا'' 1935 ''ساوکاری پاش'' 1936 ''پرتیبھا'' 1937 اور ''رکمنی سوئمبر'' 1946 قابل ذکر ہیں۔ بدقسمتی سے یہ فلمیں کامیاب نہ رہیں۔ وی شانتارام نے بابوراؤ سے فلم ''لوک شاعر رام جوشی'' کو ڈائرکٹ کرنے کی گزارش کی جو شانتارام کے بینر ''راج کمل کلامندر'' کے لئے بنائی جا رہی تھی۔ فلم کی شوٹنگ کے دوران شانتارام اور بابوراؤ میں اختلافات پیدا ہو گئے اور بابوراؤ کو فلم سے الگ ہونا پڑا۔ بعد میں شانتارام نے باقی کی شوٹنگ خود پوری کی۔ 1952 کی فلم ''وشوا مترا'' اُس کی آخری فلم تھی جو بمبئی میں بنی تھی۔ یہ فلم بھی نہیں چلی۔ اس فلم کی ناکامی کے بعد بابوراؤ نے فلموں سے سنیاس لینے کا اعلان کر دیا۔

بابوراؤ نے خاندانی پیشے کو دوبارہ اپنا لیا اور وہ پھر سے پینٹنگ اور مجسمہ تراشی کی طرف مائل ہو گیا۔ اُس کے مجسموں میں مہاتما گاندھی اور شیواجی مہاراج اور جیتو راج پھولے کے مجسمے آج بھی قابل ذکر ہیں۔ بابوراؤ اپنے مجسموں میں کانسے اور مٹی کا استعمال کیا کرتا تھا۔ وہ بڑی آسانی سے آٹھ سے دس فٹ تک کے مجسمے بنایا کرتا تھا۔ مشہور مجسمہ ساز آر کے پھڑکے نے بارہا اُس سے مدد لی۔ کئی بار اُس نے عدیم الفرصت ہونے پر بابوراؤ سے کئی مجسمے بنوائے۔

بابوراؤ کی از دواجی زندگی بڑی سپاٹ تھی۔ اُس میں کوئی اُتار چڑھاؤ نہیں تھا۔ اُس کی شادی 1927 میں ایک مراٹھی لڑکی لکشمی بائی سے ہوئی تھی جس سے اُس کے آٹھ بچے ہوئے۔ چھ لڑکیاں اور دو لڑکے۔ وہ اس چکا چوند کی دنیا سے ہمیشہ دور رہی۔ وہ ایک عام ہندوستانی عورت کی طرح گھر گرہستی کو سنبھالنے میں لگی رہی۔ بابوراؤ 1954 میں حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے اس جہاں فانی سے کوچ کر گیا۔ اُن کی موت کے بعد ''انجلی'' میگزین کے ایڈیٹر این سی پھڑکے نے پورا شمارہ بابوراؤ کے نام منسوب کر دیا جس میں بابوراؤ کی آرٹ اور فلم انڈسٹری کی کامیابیوں کو اُجاگر کیا گیا۔ این سی پھڑکے نے اُس کے کام کی سراہنا کرتے ہوئے اُسے کلا مہارشی کے لقب سے نوازا۔

بابوراؤ فلمی تاریخ میں اپنی نشانیوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اُس نے پہلا سودیشی کیمرہ بنایا۔ اُس نے پہلی بار عورت کو اپنی فلم میں پیش کیا۔ یہ بابوراؤ ہی تھا جس نے کاسٹیوم کے اسکیچ بنا کر کاسٹیوم ڈیزائن کیے۔ بابوراؤ پہلا ایسا ڈائرکٹر تھا جس نے مصنوعی روشنی کو متعارف کیا۔ بابوراؤ پہلا شخص تھا جس نے فلم کی پبلسٹی کی اہمیت کو سمجھا اور اُسی نے فلمی پوسٹر کی شروعات کی۔ اُس نے فلم ''سارن دھری'' کے لئے کپڑے پر ایک پوسٹر بنایا جسے پونے کے آرین تھیٹر کے باہر لگایا گیا۔ فلم ''سنہا گڑھ'' کے لئے پہلی بار اُس نے بیس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا پوسٹر بنایا جسے دیکھنے کے لئے لوگ جوق در جوق آتے تھے۔ اپنی فلم ''مایا مزار'' کا اُس نے ایسا دیو قامت پوسٹر بنایا جس کی اونچائی پچاس فٹ تھی۔ اس پر گٹوٹ کچھا کی تصویر بنی تھی۔ لوگ اس طرح کے بینر پوسٹر دیکھ کر دانتوں تلے اُنگلی داب کے رہ جاتے تھے۔ بابوراؤ سچے معنوں میں فلموں کا بابا آدم تھا جس نے فلم سازی کو نئی سمت اور جہت عطا کی۔ وہ فلم سازی کا وہ سرخیل تھا جس نے نام و نمود کی پرواہ نہ کرتے ہوئے کئی ساری چیزوں کا اختراع کیا۔ فلمی بک لٹ، فلم پبلسٹی اُسی کی دین ہے۔ فلم سازی کی ارتقا میں اُس کا بہت بڑا رول رہا ہے۔ آج فلم انڈسٹری جس مقام پر کھڑی ہے اُس کی تعمیر سازی میں بابوراؤ کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ افسوس کہ ایسا جان نثار سپاہی ایک گم نام شخص بن کر رہ گیا۔ آج لوگ دادا صاحب پھالکے کو فلموں کا بابا آدم سمجھتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ بابا آدم دادا صاحب پھالکے نہیں بلکہ بابوراؤ پینٹر ہے۔ اُس نے بے شک اتنی زیادہ فلمیں نہیں بنائیں، پر جو کچھ اُس نے فلمی دنیا کو دیا وہ فلموں کی تعداد سے کہیں زیادہ اور بے مثال ہے۔

''شاخِ نازک''

جاپان میں معاشرتی علوم ''پڑھائی'' نہیں جاتی ہے کیونکہ یہ سکھانے کی چیز ہے پڑھانے کی نہیں اور وہ اپنی نسلوں کو بہت خوبی کے ساتھ معاشرت سکھا رہے ہیں۔ جاپان کے اسکولوں میں صفائی ستھرائی کے لیے بچے اور اساتذہ خود ہی اہتمام کرتے ہیں، صبح آٹھ بجے اسکول آنے کے بعد سے دس بجے تک پورا اسکول بچوں اور اساتذہ سمیت صفائی میں مشغول رہتا ہے۔

دوسری طرف آپ ہمارا تعلیمی نظام ملاحظہ کریں جو صرف نقل اور چھپائی پر مشتمل ہے، ہمارے بچے ''پبلشرز'' بن چکے ہیں۔ آپ تماشہ دیکھیں جو کتاب میں لکھا ہوتا ہے اساتذہ اسی کو بورڈ پر نقل کرتے ہیں، بچے دوبارہ اسی کو کاپی پر چھاپ دیتے ہیں، اساتذہ اسی نقل شدہ اور چھپے ہوئے مواد کو امتحان میں دیتے ہیں، خود ہی اہم سوالوں پر نشانات لگواتے ہیں اور خود ہی پیپر بناتے ہیں اور خود ہی اس کو چیک کر کے خود نمبر بھی دے دیتے ہیں،

بچے کے پاس یا فیل ہونے کا فیصلہ بھی خود ہی صادر کر دیتے ہیں اور ماں باپ اس نتیجے پر تالیاں بجا بجا کر بچوں کے ذہین اور قابل ہونے کے گن گاتے رہتے ہیں، جن کے بچے فیل ہو جاتے ہیں وہ اس نتیجے پر افسوس کرتے رہتے ہیں اور اپنے بچے کو ''کوڑھ مغز'' اور ''کند ذہن'' کا طعنہ دیتے رہتے ہیں۔ ہم تیرہ چودہ سال تک بچوں کو قطار میں کھڑا کر کر کے اسمبلی کرواتے ہیں اور وہ اسکول سے فارغ ہوتے ہی قطار کو توڑ کر اپنا کام کرواتے ہیں، جو جتنے بڑے اسکول سے پڑھا ہوتا ہے قطار کو روندتے ہوئے سب سے پہلے اپنا کام کروانے کا ہنر جانتا ہے۔ طالبعلموں کا اسکول میں سارا وقت سائنس ''رٹتے'' گزرتا ہے اور آپ کو پورے ملک میں کوئی ''سائنس دان'' نامی چیز نظر نہیں آئے گی کیونکہ بدقسمتی سے سائنس ''سیکھنے'' کی اور خود تجربہ کرنے کی چیز ہے اور ہم اسے بھی ''رٹا'' لگواتے ہیں۔ آپ حیران ہوں گے میٹرک کلاس کا پہلا امتحان ۱۸۵۸ء میں ہوا اور برطانوی حکومت نے یہ طے کیا کہ برصغیر کے لوگ ہماری عقل سے آدھے ہوتے ہیں اس لیے ہمارے پاس ''پاسنگ مارکس'' ۶۵ ہیں تو برصغیر والوں کے لیے ۳۲ عشاریہ ۵ ہونے چاہئیں۔

دو سال بعد ۱۸۶۰ء میں اساتذہ کی آسانی کے لیے پاسنگ مارکس تینتیس کر دیے گئے اور ہم میں بھی ان ہی تینتیس نمبروں سے اپنے بچوں کی ذہانت کو تلاش کرنے میں مصروف ہیں۔ علامہ اقبالؒ کے شعر کا یہ مصرعہ اس تمام صورتحال کی صحیح طریقے سے ترجمانی کرتا نظر آتا ہے کہ

شاخِ نازک پر بنے گا جو آشیانہ، ناپائیدار ہوگا۔

رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

وجیہہ الوقار

(راولپنڈی)

مدیرِ چہارسواور قارئین چہارسوکی خدمت میں سلام پیش ہے۔

اس خط کے لکھنے کی کوئی خاص وجہ نہیں سوائے اس کے کہ یہ ایک تہذیبی شکریہ نامہ ہے اور اپنی شرمندگی مٹانے کا ایک واحد ذریعہ۔ دس بارہ برس پہلے چہارسو کے اکادکا شمارے جوگندر پال صاحب نے عنایت کئے تھے یہ ان کی عادت تھی کوئی بھی ملنے آتا کوئی رسالہ یا کتاب تحفتاً پیش کر دیتے میرا شوق چونکہ افسانہ ہے افسانے پڑھے صفحات الٹے پلٹے کچھ شاعری پر نظر ڈالی اور رسالہ رکھ دیا چہارسو تب سے ہی ذہن میں محفوظ تھا اور بس۔۔۔کچھ برسوں سے کچھ گروپوں میں چہارسو کا پی ڈی ایف نظر سے گزرنے لگا تو شناسائی تازہ اور گہری ہو گئی۔ معلوم تھا کہ چہارسو اپنے چہرے کے لیے خاصہ معروف ہے لیکن کبھی نگار عظیم اس کا چہرہ بنے گی سوچا نہیں تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے رسائل کے گوشے میں رتی بھر دلچسپی نہیں یہ تشہیر بڑی غیر ضروری سی لگتی ہے۔ میں ''شاعر'' میں گوشے کے لیے بارہا کہنے کے بعد بھی تیار نہیں ہوئی تھی۔ گلزار جاوید صاحب کو بھی میں نے ٹال دیا تھا اس سلسلے میں گلزار جاوید صاحب، رینو بہل صاحبہ نے مجھے کچھ مخصوص شمارے بھیجے۔۔۔ایک دن اس شمارے کی تفصیلات جاننے کے لیے جب صفحات کھولے تو مجلس مشاورت اور زر رسالانہ دیکھ کر مجھ پر شرم سے گھڑوں پانی پڑ گیا اور اردو کی خدمت کا صحیح مطلب مجھے چہارسو کے اس صفحہ نے سمجھا دیا اور پھر میں نے گلزار جاوید صاحب کی کرم فرمائی پر لبیک کہہ دیا۔

جاوید صاحب کوئی معمولی انسان نہیں بہت نرم دل مثبت سوچ والے ملنسار اور محنتی انسان ہیں کام لینا جانتے ہیں بلکہ کام کے دوران وہ مقابل کو ہپناٹائز کر لیتے ہیں مجھے تو ایسا ہی محسوس ہوا ورنہ چالیس سوالات کے جوابات دینا اس نگار عظیم کے لیے جو سال دو سال میں ایک افسانہ قلم بند کرتی ہو بڑا مشکل بلکہ ناممکن کام ہے۔ اس گوشے کی تیاری کے دوران مجھے خود احتسابی کا موقع بھی میسر آیا کہ پچاس سالہ ادبی زندگی کا اس قدر مختصر اثاثہ اور خود کے ساتھ اسقدر ناروا غیر ذمہ دارانہ سلوک؟ بہت چیزیں تلاش پر بھی نہیں ملیں بہر حال خدا خدا کر کے کام مکمل ہوا تو اندازہ ہوا ابھی بھی اردو ادب کے شائقین اس رسالے کا انتظار کرتے ہیں فون اور میسیجز سے مبارکباد دیتے ہیں فرینڈ رکویسٹ بھیجتے ہیں اور رابطے میں رہنا چاہتے ہیں تو شکریہ گلزار جاوید صاحب آپکی محبت محنت خلوص اور قارئین چہار سو سب کچھ بے مثال ہیں۔

اب کچھ شمارے کے بارے میں اسلم ملک صاحب کا ''نئے نقاد کے نام خطوط'' اچھا لگا بہت مناسب تحریر ہے۔ افسانوی حصہ بہت متاثر کن ہے سبھی افسانے اچھے ہیں خاص طور پر آغا گل کا غم گسار اور مشتاق احمد مشتاق کا مٹی کی دیوار بہت اچھے لگے۔ جمال مدینہ کے علاوہ شعری انتخاب بھی لاجواب ہے۔ ولی عالم شاہین، نسیم سحر، ناصرہ زبیری کے علاوہ بھی بہتر کلام پڑھنے کو ملا۔

خاک شفا بھی خوب ہے کسی ناول کی قسط پڑھ کر اگلی قسط کا انتظار ہونے لگے تو یہ ناول کی بڑی کامیابی ہے اس کی اہم خوبی زمان و مکان کے علاوہ بہترین زبان بھی ہے۔ رینو بہل، صادقہ نواب سحر اور اختر آزاد بھی پسند آئے اس مختصر خط میں تفصیل کی گنجائش نہیں پورا شمارہ آپ کی مدیرانہ صلاحیتوں کا مظہر ہے اس کا اعتراف انتہائی ضروری ہے۔ اب ایک اہم بات سوال نمبر ۱۶ بہت اہم سوال رہا لیکن اس کا جواب ادھورا شایع ہوا ہے گزارش ہے سوال اور جواب دوبارہ شائع ہو تو بہتر ہے۔

نگار عظیم (دہلی)

برادرِ عزیز گلزار جاوید صاحب، سلام ورحمت۔

بھائی کیا کہنے بہت خوب۔۔۔نگار عظیم نمبر دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو گئی۔ چہارسو کی تاریخ کے ہر پنے، ہم سے یہی کہتے ہیں کہ گلزار جاوید صاحب، بغیر کسی ڈھول باجے کے اہم کام کر جاتے ہیں۔ آپ کا جنوں ہمیشہ جوان رہے اور آپ چہارسو کے ذریعے ادب کی بے لوث خدمت انجام دیتے رہیں۔

خورشید حیات (نوئیڈا)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

محترمہ نگار عظیم اردو ادب کے حوالہ سے ایک حساس اور بے باک افسانہ نگار کے طور پر پاک و ہند میں ایک قدآور شخصیت ہیں۔ ''براہِ راست'' میں دلچسپ اور معلوماتی سوال وجواب کے ذریعہ ان کی خدمات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ نیا شمارہ ان کے نام منسوب کرنے پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ نئے شمارے میں دلچسپ افسانے، مضامین اور شاعری شامل کی گئی ہے۔

آغا گل صاحب نے ''غم گسار'' کے عنوان سے اپنے افسانہ میں طنز و مزاح اور تقسیم ہند سے پہلے اور فوری بعد کے واقعات پر دلچسپ تحریر رقم کی ہے۔ اس کے علاوہ افسر شاہی کے مزاج اور ریٹائرمنٹ کے بعد کی صورت حال پر خوب تبصرہ کیا ہے۔ دوران ملازمت اگر خلوص نیت سے معاملات نمٹائے جائیں اور باہمی تعلقات کو اہمیت اور فروغ دیا جائے تو ریٹائرمنٹ کے بعد بھی دوستوں کی تعداد کم نہیں ہوتی اور پر خلوص باہمی تعلقات قائم رہتے ہیں۔ کہانی کے آخری حصہ میں جو صورت حال بیان کی گئی اسے پڑھ کر دل اداس ہو جاتا ہے گو کہ زندگی کی حسیت یہی ہے۔

''خاکِ شفا'' پیرزادہ آل انوار کی نئی قسط بے حد دلچسپ، متفرق معلومات اور ان کی حیران کن جزوی تفصیلات پر مشتمل ہے جو مصنف کی گہری تحقیق اور محنت کے باعث ممکن ہوا جس کے لیے وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اسی

اندازِ تحریر کے باعث قارئین چہارسو اگلی قسط کے منتظر رہتے ہیں۔

''بچے ہمارے عہد کے'' ڈاکٹر رینو بہل کا افسانہ دلچسپ اور سبق آموز ہے۔ بچوں کی کردار سازی میں والدین کی غفلت عموماً تباہ کن ہوتی ہے جس کا بعد میں تدارک ناممکن ہوتا ہے۔ آج کے دور میں رہی سہی کسر میڈیا نے پوری کر دی ہے۔ کہانی کا یہ نکتہ بھی قابل ذکر ہے کہ والدین کو اپنے ازدواجی تعلقات کے حوالہ سے احتیاط کرنی چاہیے کہ ان کے بچے کہیں انہیں چھپ کر دیکھ تو نہیں رہے ہیں۔

''بے گھری'' میں اسرار گاندھی نے ایسی افسوسناک صورتِ حال کا قصہ بیان کیا ہے جب موہن نے اپنی شادی کے کچھ عرصہ بعد اس گھر میں رہتے ہوئے گھر کے مالک باپ سے انتہائی ڈھٹائی اور خود غرضی کے ساتھ یہ مطالبہ کر دیا کہ وہ دونوں اپنے موجودہ مکان کو چھوڑ کر دوسری جگہ ایک کرائے کے مکان میں منتقل ہو جائیں کیونکہ وہ اب بوڑھے ہو چکے ہیں اور انہیں اتنے بڑے مکان کی ضرورت نہیں جبکہ وہ اپنے دوستوں وغیرہ کی دعوتیں کرتا رہتا ہے اور جگہ کم پڑ جاتی ہے۔ باپ کے انکار پر بے حس اور بے شرم بیٹے موہن نے اسے جان سے مارنے کی دھمکی دی اور بیوی کے ساتھ ساؤتھ انڈیا کی سیر پر جاتے ہوئے باپ سے مطالبہ کیا کہ اس ایک ماہ کے عرصہ میں اس کے واپس آنے سے پہلے وہ گھر خالی کر کے دوسرے کرایہ کے چھوٹے مکان میں منتقل ہو جائے۔ باپ کی نظروں میں گر جانے کے بعد بات کا ردِ عمل فطری تھا جبکہ موہن کی کیفیت اس شعر کے مصداق تھی:

نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم
نہ ادھر کے رہے نہ اُدھر کے رہے

''کالی آندھی'' مصنف اور نجومی ڈاکٹر اختر آزاد کا افسانہ پراسرار واقعات، مستقل بینی اور علم نجوم سے متعلق گفتگو پر مشتمل ہے جو انوکھی اور دلچسپ ہے۔ ''بندگلی کا مسافر'' آصف عمران نے عمدہ اور دلچسپ کہانی تحریر کی ہے۔ الفاظ کا چناؤ، منظر کشی اور زندگی میں ازدواجی تعلقات اور معاملات کے ساتھ ساتھ تنہائی کے تکلیف دہ لمحات کے تذکرہ پر مشتمل کہانی ہے۔ بیگم کی وفات کے بعد تنہائی کا کرب بچوں کی موجودگی اور ان کے پاس امریکہ جا کر رہنے سے بھی دور نہ ہو سکا۔

''بندے'' تابش خانزادہ صاحب نے مختصر مگر دلچسپ پیرایہ میں سبق آموز افسانہ تحریر کیا ہے جس میں اس امر کو نمایاں کیا گیا ہے کہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اس سے بھی غلطیاں سرزد ہو سکتی ہیں جن کے لیے وہ پشیمان اور معافی کا طلبگار رہتا ہے۔ چنانچہ اگر اس کے سامنے بھی کسی دوسرے کی غلطی کا معاملہ پیش ہو تو اسے بھی فراخ دلی کے ساتھ اسے نظر انداز کرنے کا رویہ اپنانا چاہیے۔ ''مٹی کی دیوار'' مشتاق احمد کا افسانہ تقسیم ہند اور اس کے بعد کے واقعات، فسادات اور ناحق قتل و غارت سے بے گناہ مسلمانوں کا خون بہانے اور لوٹ مار کرنے کے المناک واقعات میں سے صرف ایک خدان کے لٹنے اور تباہی کی داستان ہے جو بڑے موثر انداز میں تحریر کی گئی ہے اور جسے قاری پڑھ کر دیر تک اداس رہتا ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔

''منزل حیات'' معین الدین عثمانی کی کہانی ایک ایسی عورت کی داستان ہے جو شروع میں تو بڑے چاہ کے ساتھ بیاہ کر گھر لائی جاتی ہے مگر وقت گزرنے کے ساتھ گھر کا ماحول بدل جاتا ہے اور حسنِ سلوک سرد مہری اور پھر بدسلوکی میں تبدیلی ہو جاتا ہے اور لڑکی جو اپنے خیالوں میں پیار و محبت کے بڑے محل تعمیر کیے ہوئے گھر میں داخل ہوتی ہے وہ رفتہ رفتہ زمین بوس ہوتے جاتے ہیں۔ اگر دو سال تک بچہ پیدا نہ ہو تو اس کا قصوروار بھی مرد کے بجائے عورت کو ٹھہرایا جاتا ہے حالانکہ بعض مرتبہ مرد کے ٹیسٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں وہ مادہ نہیں ہے جو حمل ٹھہرنے کا باعث ہوتا ہے۔ حساس دل اور خوف خدا رکھنے والوں کو چاہیے کہ وہ ان امور پر غور کریں اور اپنے ہاں یا اردگرد کے جاننے والوں میں ایسی بے جا ظلم و زیادتی کا تدارک کرنے کی کوشش کریں تاکہ دکھی دلوں کی خوشی بحال ہو سکے۔ رضیہ اسماعیل صاحبہ نے گرینڈ مدر کے عنوان سے بہت عمدہ اور دلچسپ خاکہ تحریر کیا ہے جو قابل تعریف ہے۔

شاعری میں شاہد انوار، ناصرہ زبیری، ولی عالم شاہین، شورش کاشمیری مرحوم، شاہد رضوان اور فریدی صدیقی مصباحی کا کلام متاثر کن ہے۔ اس تمام عمدہ مواد کو یکجا کر کے ''چہارسو'' کی صورت میں پیش کرنے پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

ڈاکٹر ریاض احمد (پشاور)

پیارے گل و گلزار جاوید، سلامِ محبت۔

''چہارسُو'' عید سے دو روز قبل مل گیا تھا اور میں نے اس کی رسید یوں دی تھی کہ واہ جناب، عید کے دنوں میں اس کا مطالعہ کرنے کی فرصت اور مسرّت حاصل ہو گی۔ اور یہی ہوا۔ خیال تھا عید کے تیسرے دن اپنا تبصراتی خط بھی لکھ دوں گا مگر کچھ مُوڈ ہی نہیں بنا اگرچہ انہی دنوں مطالعے کے تو گویا ریکارڈ ہی توڑ دیئے۔ پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی، بلکہ یوں کہیے کہ اتنی بڑھ گئی کہ چھوٹے بیٹے کی شادی کی تیاریوں میں بری طرح مصروف ہو گیا۔ پانچ مئی کو بارات، سات مئی کو ولیمہ ہوا (جس میں آپ کی کمی بڑی محسوس ہوئی کہ پنڈی اسلام آباد کے کوئی یک صد کے قریب شعراء و ادباء جمع تھے)۔ شادی تو بیٹے کی ہوئی مگر شادی سے پہلے اور بعد میں باپ کا جو حال ہوتا ہے وہ آپ سمجھ سکتے ہیں، بہرحال اب کچھ فرصت کے دن ڈھونڈ لیے ہیں اور تصورِ جاناں کی بجائے چہارسُو کے مطالعے کے ''آفٹر شاکس'' آپ تک پہنچا رہا ہوں۔

سب سے اہم اور حیران کُن تو ''خاکِ شفا'' ناول کی تازہ قسط ہے جو بظاہر میامی میں مقیم پیرزادہ آلِ انور کی تحریر کردہ ہے مگر اس کی تازہ قسط کے علاوہ گذشتہ قسطوں کے انداز بھی بتا رہے ہیں کہ منصور کے پردے میں خدا بولے نہ بولے، پیرزادہ کے پردے میں یارِ عزیز رہا ہے۔ ابھی اس کی چند قسطیں باقی ہیں اس لیے اس پر ایک مضمون اس وقت لکھوں گا جب یہ سارا جامِ کیف جرعہ جرعہ پی چکوں گا۔

اس مرتبہ قرطاسِ اعزاز ہندوستان کی معروف فلمکار نگار عظیم سے

منسوب ہے اور پرچے میں ان کے بارے میں اپنے کچھ الفاظ پر مشتمل مضمون سے گویا اس قرطاس کا جزوی حصے دار مَیں بھی بن گیا۔ اگرچہ اب جب ان کے مجموعی کام کا اندازہ ہؤا اور نگار عظیم صاحبہ سے آپ کا براہ راست مکالمہ یا مکاشفہ پڑھا تو ان کے فن کی مزید کئی جہات مجھ پر کھلی ہیں چنانچہ کچھ عجب نہیں کہ اُن پر ایک اور مضمون لکھنا پڑے۔ یہاں آپ کی ایک مدیرانہ یا ''پروف خوانانہ'' لغزشِ مستانہ کا ذکر کرتا چلوں کہ چہارسُو کے صفحہ ۲۰ کے پہلے کالم میں تقریباً چودہ پندرہ سطریں دو مرتبہ شائع ہوگئی ہیں۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہؤا کہ اس میں آپ کے اٹھائے ہوئے ''صنعتِ تکرار'' والے سوال کا نگار عظیم صاحبہ نے جو فکر انگیز جواب دیا ہے وہ بھی صنعتِ تکرار کے زمرے میں آ گیا اور قارئین کو ''قندِ مکرّر'' کا لطف بھی آ گیا۔

برادرِ عزیز ناصر علی سیّد عرصے بعد ایک خوبصورت اور خیال انگیز افسانے ''تھکن کا سفر'' لے کر آئے ہیں اور افسانے کے کردار پاگل کے روپ میں بہت سے ان ہوشمند انسانوں کا ذکر کر گئے جو پاگل پن میں اس پاگل سے کسی طور کم نہیں ہیں۔ ہر بار ایک ''مختصر افسانہ'' لانے والے جناب تابش خانزادہ نے اس بار بھی اختصار یہ بلاغت سے کام لیا اور افسانے میں اپنے وطن کے حوالے سے بہت کچھ کہہ دیا، خاص طور پر اس افسانے میں ''شریفوں'' کا لفظ کچھ سیاسی کرداروں پر خوب منطبق ہوتا ہے۔

''اردو ادب کا ماحولیاتی تناظر'' کے عنوان سے جمیل احمد عدیل نے ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کی ترجمہ شدہ کتاب ''ماحولیاتی تنقید'' کا ناقدانہ اور تفکرانہ احاطہ کیا ہے۔ اور قاری کے لیے اس کتاب کی خواندگی میں سہولت پیدا کی ہے۔ (''سہولت کاری'' کا لفظ لکھنے کی جرأت نہیں ہو رہی!) اُن کا تکمیلی جملہ ہمارے نصابی ماحول پر ایک گہرے اور سچے طنز کی حیثیت رکھتا ہے: ''آرزو ہے کہ ڈاکٹر نیازی کی یہ نگارش کبھی نصاب کا حصہ نہ بنے کہ مکتب ایسا مقام ہے جہاں کتاب کو پڑھ اور پڑھا کر 'ختم' کر دیا جاتا ہے جبکہ اِس دستاویز کا متن طویل مدّتی ساتھ کا مطالبہ کرتا ہے۔''

یہاں تک لکھنے کے بعد یکا یک بجلی چلی گئی کہ اس مقبول جمہوری حکومت کے گذشتہ ادوار کی طرح اس دور میں بھی لوڈ شیڈنگ ایک معمول بن چکا ہے، اور چونکہ میں یہ سطریں حسبِ عادت ''لیپ ٹاپ'' پر لکھ رہا ہوں اس لیے اس کی بیٹری کے جواب دینے سے قبل میں اجازت چاہتا ہوں حالانکہ اس شمارے میں شامل کچھ اشعار کی پسندیدگی کا اظہار کرنا چاہتا تھا، مگر ایسا اگلے شمارے میں سہی۔ فی امان اللہ۔

نسیمِ سحر (راولپنڈی)

محترم المقام بھائی جان، السلام علیکم۔

چہارسو کا شمارہ جولائی اگست ۲۰۲۳ء ہمدست ہوا۔ صمیم قلب سے شکر گزار ہوں۔ سرورق پر نظر پڑی تو دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ نگار عظیم میری بہت عزیز دوست ہیں۔ بہت معتبر ادیبہ اور بہترین افسانہ نگار ہیں۔ آپ نے اس شمارے کے لیے نگار عظیم کو منتخب کیا۔ واقعی وہ اس کی حقدار تھیں۔ حق بہ حقدار رسید۔

ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ میں نگار عظیم کو ایک ہی نشست میں پڑھ لیتی مگر ادھر کچھ دنوں سے میری صحت کچھ زیادہ ٹھیک نہیں ہے۔ کچھ بلڈ پریشر کی زیادتی کا معاملہ تو تھا ہی درمیان میں Cirvical Spondylosis کی تکلیف شدید ہوگئی۔ تقریباً دو مہینے سے لکھنا پڑھنا تقریباً بند ہی رہا۔ اب کچھ کچھ پڑھ لکھ رہی ہوں۔ شکر الحمدللہ۔

حسبِ عادت میں نے سب سے پہلے ''براہِ راست'' پڑھا۔ آپ کے نہایت ہی صحافیانہ سوالات کا جواب دینا بڑا مشکل مرحلہ ہے۔ مگر نگار نے نہایت مدبرانہ انداز میں آپ کے سوالوں کا جواب دیا۔ بالخصوص ''ترقی پسندی'' کے تعلق سے ان کا موقف مجھے بالکل کھرا اور سیدھا لگا کہ ''ترقی پسندی کڑوی حقیقتوں سے روبرو ہونا اور ان کا سامنا کرنا ہے'' سچ تو یہی ہے کہ صرف مارکسی نظریات کی فیشن بطور پیروی کرنا نہیں ہے۔ میں تو آج جو ادب تخلیق ہو رہا ہے اسے ترقی پسندی کی دین ہی مانتی ہوں۔ دیکھیے یہ ترقی پسند تحریک ہی کی دین ہے کہ کل تک جو ادب صرف ایوانوں کی زینت بنا رہا جہاں سماج کا عام فرد جھانکنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا، آج وہی عام فرد، مزدور اور کچلا ہوا، پروٹا گونسٹ (Prota gonist) بن گیا ہے۔ ہمارے ادب کا بیشتر حصہ یہی فرد ہے۔

دوسری اہم بات اپنے افسانوں ''عکس'' اور ''گہن'' کے بارے میں نگار کا موقف بالکل درست ہے۔ ضروری نہیں کہ ادیب جو تخلیق کرتا ہے، ماحصل قاری اسے اسی نظریے کے تحت قبول کر لے۔ فرد اپنی آراء میں آزاد ہے۔ اپنی منفرد رائے رکھتا ہے۔ شاید اسی لیے سعدی نے کہا تھا۔

مطلبِ سعدی دیگر است

چونکہ میں خود بھی تخلیق کار ہوں، اس لیے تخلیق کے تعلق سے نگار کے موقف کی تائید کرتی ہوں۔ اپنی اس خود اعتمادی ہی کی وجہ سے وہ آپ کے تلوار سی کاٹ رکھنے والے سوالات سے عہدہ برآ ہو سکیں۔

باقی تخلیقی ادب نثر کے شعبے میں تمام افسانے بہت پسند آئے۔ ''خاکِ شفا'' اچھا چل رہا ہے۔ ناصر علی سید کی کہانی ''تھکن کا سفر'' ایک عجیب سی تھکن کا احساس دلا گئی۔

قمر جمالی (حیدرآباد، دکن)

عزیزِ مکرم گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہارسو ہر بار آنے پر دل کو جو خوشی اور تازگی میسر ہوتی تھی اُس کا اعتراف خواہش کے باوجود نہ کر سکا۔ کوتاہی اس قدر بڑی ہے کہ لفظ معافی سے اُس کی تلافی ممکن نہیں۔

تازہ چہارسو دیکھ کر ہر بار کی طرح دل کو خوشی کے بجائے ایک طرح کے سوگ بلکہ ضعف سے دوچار ہونا پڑا۔ ہائے ہائے کیا انسان تھے بھائی جان۔

ہزاروں نہیں لاکھوں بلکہ وہ تو اپنی طرز کے ایک ہی تھے۔

بھائی جان کے ساتھ آپ کا محبت واحترام کا جو گہرا رشتہ تھا وہ آپ نے خراجِ عقیدت میں استعمال کردہ الفاظ و تراکیب سے خوب خوب مترشح کیا ہے۔ زبان و بیان پر جو دسترس بھائی صاحب کو حاصل تھی، وہ صرف ان جیسے کہنہ مشق اور صاحب طرز ادیب کا ہی حصہ ہو سکتی ہے۔ ہم تو جواباً خراج تحسین پیش کرتے ہوئے آپ کی خدمت میں یہی عرض کر سکتے ہیں:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

محمود احمد (بریگیڈیئر، ریٹائر، برادرِ خورد حافظ محمد احمد صاحب مرحوم)

گلزار جاوید بھائی، السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ (جولائی اگست ۲۰۲۳ء) اپنی اعلیٰ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے موصول ہوا۔ محترمہ نگار عظیم کے نام قرطاسِ اعزاز ہے۔ ''براہِ راست'' میں سوال جواب کا سلسلہ انتہائی مفید اور دلچسپ رہا۔ پیڑوں والا گھر، دار الفکر باورچی خانہ، شوہر کا جملہ اور محترمہ کا مقطع:

میرے نگار خانے سے پھوٹی ہے جو شفق
یہ تو کسی کے حسنِ نظر کا کمال ہے

فوٹو گرافی کا شوق، راجا اسٹوڈیو، مصوری سے دلچسپی، عروضی تعلیم، افسانے اور کہانی سے ملاقات، اُن کا اپنے افسانوں کے بارے میں یہ خیال ہے۔

''میرے افسانوں کی عورت زندگی سے عبادت ہے'' (ص ۱۵)

ثروت حسین ثروت، عنوان چشتی، علامہ سحر عشق آبادی کی علم عروض پر بحث، محترمہ نے مختلف نقادان ادب کے اعتراضات اور تعریفات کو کھلے دل و دماغ سے قبول کیا اور تفصیلی جوابات دیے جو اچھے لگے۔ اردو زبان کے حوالے سے انہیں یقین ہے کہ:

''اردو رسم الخط اور زبانِ اردو کو کوئی خطرہ نہیں'' مگر وہ پاکستان کی نوجوان نسل پر موبائل پر رومن لکھنے پر خوش نہیں۔ سعادت حسن منٹو پر پی ایچ ڈی اور شاعری کے متعلق سوالات پسند آئے۔ سفرنامے ''از بکستان اور تاشقند'' بنات بین الاقوامی نسائی تنظیم کے لیے کام، پریم چند کی تحسین:

''پریم چند افسانے کی زمین ہیں جیسے کسی عمارت کی زمین یعنی بنیاد ہوتی ہے'' (ص۔ ۱۷)

گلزار جاوید بھائی ایک اور بھرپور گوشے پر مبارک باد۔ تحسین محترمہ عطیہ سکندر علی نے ''بیان اپنا'' اہم خطوط کے اہم اقتباسات شامل کیے جس سے اُن کے فکر و فن تفہیم ہوتے ہے مثلاً پیغام آفاقی لکھتے ہیں:

''جنسی موضوعات پر لکھتے وقت آپ نے اس جرأت سے کام لیا ہے جو ہر سچی بصیرت کا حصہ ہوتا ہے اور انسان کو اس مقام پر پہنچا دیتا ہے جہاں سے خود اخلاق، قدر اور شعور کے چشمے جاری ہوتے ہیں'' (ص۔ ۸)

فاری شانے غزلیہ شاعری کا انتخاب خوب کیا ہے

جنونِ دل کا ابھی ترجمان باقی ہے
لبوں پر مہر لگی ہے زبان باقی ہے
دل تو کیا جبر ہے پتھر بھی پگھل جائے مگر
جذبۂ عشق میں تیرے وہ حرارت ہو نہیں

پروفیسر علی احمد فاطمی، نور الحسنین اور نسیم سحر کے مضامین انتہائی اہم ہیں ان اصحاب نے بڑی محنت اور گیرائی اور گہرائی محترمہ کے فکر و فن کا تجزیہ کیا ہے ڈاکٹر شمع افروز زیدی نے خاکہ بھی خوب تحریر کیا ہے۔ نگارِ عظیم کے افسانے ''عکس'' اور ''حادثے یونہی نہیں ہوتے'' کمال ہیں فنی پختگی، موضوع پر گرفت اور چست۔ بہت خوب۔

خاکِ شفا کی موجودہ قسط میں زبان اور لہجے کے کرداروں کے لحاظ سے مختلف لاجواب انداز ہیں مصنف کا گہرا مشاہدہ اور فنی مہارت لائق تحسین ہے۔ اس قسط کی ابتدا غیاث، عمران اور وجے کے بے تکلفانہ مکالمے، جس میں محاورہ، طنز و مزاح کمال ہے۔

''لے بے لے۔۔۔ بڑا مروڑ اُٹھ رہا ہے تیرے پیٹ میں۔۔۔ ہفتوں اور مہینوں۔۔۔ آ گیا تیرا باپ۔۔۔ میرا مطلب ہے بمبئی۔۔۔''

میر تقی میر، آرزو لکھنوی، وحشت کلکتوی، فراق گورکھ پوری کے بر محل اشعار، پشتو زبان و ادب، رحمان بابا اور خوشحال خان خٹک، ناگپور کا تعارف، مراٹھی زبان کا محل وقوع، ابراہیم لنکن، شیکسپیئر، فرائڈ کے حوالے، ساحر لدھیانوی کے اشعار کیتو بالی رام کا ذکر۔ ۱۹۳۰ء گاندھی کی برطانوی قوانین کے خلاف کال۔۔۔ ایس ایس آر کا کردار اور ڈاکٹر ہیڈ گیوا کے آخری الفاظ:

''میں جاگتی آنکھوں سے۔۔۔ ایک چھوٹا سا ہندو راشٹر بنتا دیکھ رہا ہوں'' (ص۔ ۱۰۴)

ناول کی قسط میں ایک جہان آباد، تاریخ، تہذیب، مذہبی عصبیت، مذہبی ہم آہنگی، رویے، ادب و شعر، لطف آ گیا یہ ایک بڑے ناول بننے کی طرف گامزن ہے۔

جمیل احمد عدیل نے ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی کی ترجمہ کردہ کتاب ''ماحولیاتی تنقید'' کا تجزیہ بغور پڑھا اور اس فکر کو سمجھنے کی کوشش کی کہ اس زاویے سے ادب کو پرکھا جا سکتا ہے۔ جمیل احمد عدیل صاحب کا چہارسو میں گوشے کے بعد ان کی کتابوں کی تلاش میں ہوں۔ ایک صدی کا قصہ میں دیپک کنول نے اس بار نسیم بانو کی داستان حیات و عشق بیاں کی ہے۔ رضیہ اسماعیل صاحب نے گرینڈ مدر (نانی اماں) کا خاکہ ہلکے پھلکے انداز میں لکھا ہے دلچسپ ہے۔ جملے فقرے پُر لطف ہیں مثلاً ''نانی کے اس سکندرانہ سلوک کی وجہ سے صرف مریل قسم کے فقیر ہی ہمارے محلے میں قدم رکھتے'' (ص۔ ۱۱۳) آخر میں راز کھلا کہ نانی نہیں پر نانی تھیں۔ بہت خوب۔

افسانوں میں صرف آغا گل، رینو بہل، ڈاکٹر اختر آزاد کے ہی افسانے پڑھ سکا جو پسند آئے۔ آصف عمران کا افسانہ اپریل کے الحمرا میں پڑھ چکا تھا۔ غزلوں کا انتخاب اچھا ہے:

تم بھی کندن بن سکتے ہو
آگ میں پہلے جلنا سیکھو
(قیصر نجفی)

اب کے کوئی نہ کرے وار ادھورا مجھ پر
اب جو آئے تو کوئی دشمنِ کامل آئے
(ناصرہ زبیری)

ہونا اگر یہی ہے تو بے حساب ہو
وہ کون ہے جو میری طرح سے خراب ہو
(شاہد کمال)

نسیم سحر، شاہد رضوان، شازیہ اکبر کی غزلیں منفرد ہیں۔ ریاض احمد، رعنا کوثر اور نسیم سحر کے اچھے تجزیاتی خط ہیں۔

نوید سروش (میرپور خاص)

گلزار جاوید صاحب، آداب۔

اس بار قرطاسِ اعزاز اردو ادب کی مقبول اور ہر دل عزیز شخصیت ڈاکٹر نگار عظیم صاحبہ کے نام دیکھ کر طبیعت خوش ہوگئی۔ اُن کا اپنے والد پر لکھا خاکہ صرف اُن کا ہی بلکہ ہر بیٹی کا اپنے والد کے لیے محبت کا بیان ہے مگر آخری دو سطروں نے چونکا دیا۔ براہِ راست سے ان کو قریب سے جاننے کا موقع ملا۔ اُن کی محنت اور لگن کا یہ ثبوت ہے جو آج وہ اس مقام پر ہے۔ حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی کہ وہ دہلی میں پہلی خاتون تھیں جنہوں نے سٹوڈیو چلایا۔ ایک اچھی افسانہ نگار، شاعرہ، مصور، فوٹو گرافر کے ساتھ ساتھ وہ ایک اچھی ماں اور بیوی کے فرائض بھی بخوبی نبھاتی رہیں۔ اُن کی شخصیت کو میرا سلام۔ شمع زیدی صاحبہ کے خاکے سے اپنی دوست کے لیے بے پناہ محبت جھلکتی ہے۔ شروعاتی پیرا میں اُن کی شخصیت کا بیان کمال کا ہے۔ باقی مضامین بھی دلچسپ ہیں۔ خوبصورت اور مکمل گوشے کے لیے بہت بہت مبارک۔

آغا گل کا افسانہ ''غم گسار'' لاجواب افسانہ ہے۔ صادقہ صاحبہ کا افسانہ پڑھ کر محسوس ہوا کہ یہ ادھورا ہے بعد میں دیکھا یہ تو ناول کا باب ہے۔ یقیناً ناول بھی دلچسپ ہوگا۔ اسرار صاحب کا بے گھری آج کے دور کا المیہ ہے۔ کہانی کا اختتام اُنہوں نے بہت اچھا کیا۔ ڈاکٹر اختر آزاد، آصف عمران، تابش صاحب، مشتاق احمد اور محی الدین عثمانی کے افسانے بھی قابلِ ستائش ہیں۔

خاکِ شفا اس مرتبہ بھی بہت سے خوبصورت رنگ لے کر آیا ہے۔ سقراط کا فلسفہ، شیکسپیئر اور فرائڈ کے قول، چکبست کی نظم واہ واہ، پشاور کے شعراء کی تفصیل، معیاری اور دلچسپ اشعار کے ساتھ ساتھ اس بار محاورے بھی اس باب کی زینت بنے ہیں۔ ناگ پور کی تفصیل اور مدہن موہن مالیویا، آر ایس ایس کے بارے اچھی جانکاری ناول کا حصہ بنی۔ زبان و بیان کی خوبصورتی کا ذکر اس بار بھی لازمی ہے۔ مصنف نے اب تک اس کا معیار قائم رکھا ہوا ہے۔ یہ ناول الگ ہی انداز اور معیار کا ہوگا۔ اگر قسطوں کے بجائے یہ ناول بنا طویل وقفے کے پڑھا جاتا تو اس کا رنگ ہی مختلف ہوتا۔ اس کے مکمل ہونے کا انتظار رہے گا۔

شورش کاشمیری کی ''عیدی'' پروین شاکر، ولی عالم شاہین، ڈاکٹر ریاض، سروش صاحب کی غزلیں بھی بہت پسند آئیں۔ رضیہ اسماعیل کا اپنی نانی آپا پر اچھا خاکہ ہے۔ نسیم بانو ابھی پڑھنا باقی ہے۔ یقیناً ہر بار کی طرح دیپک کنول نے خوب ریسرچ کر کے لکھا ہوگا۔

فلرز آپ نجانے کدھر کدھر سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ دلچسپ بھی ہوتے ہیں اور معلوماتی بھی۔ پہلی بغاوت کے نیچے آپ کو امرتا پریتم کے نام لکھنا چاہیے تھا جو شاید غلطی سے نہ لکھ سکے۔ آبیل مجھے مار تو بہت دلچسپ قصہ ہے۔ سائیکل، دکانداری، فنی ہالیڈے، عاشق، کس کس پر داد دیں؟

پرماتما آپ کو صحت یاب رکھے اور آپ اسی طرح اپنے ذوق اور شوق سے یہ سلسلہ جاری و ساری رکھیں۔

رینو بہل (چندی گڑھ)

گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

اررے واہ۔۔۔کمال کے ادبی کام کرتے ہیں آپ جاوید صاحب۔ یوں تو چہارسو کا ہر شمارہ ہی کمال و تمام کا حامل ہوتا ہے مگر اس بار آپ نے اردو زبان کے ایک ادبی دستخط کا انتخاب کیا ہے۔ آپ اور نگار عظیم صاحبہ کے لیے بہت بہت مبارک باد اور پُر خلوص دعائیں۔

افشاں ملک (علی گڑھ)

مکرم دوست اور بھائی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا 'نگار عظیم نمبر' موصول ہوا۔ مطالعہ جاری ہے البتہ مطلع ہی میں کچھ سخن گسترانہ آن پڑا ہے، جس کی صراحت ضروری محسوس کر رہا ہوں۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر صاحب کی نو مطبوعہ تصنیف ''نئے نقاد کے نام خطوط'' کی مناسبت سے ایک شذرہ مذکورہ شمارے میں شایع ہوا ہے، جس کے آخر میں لیکھت کا اسم گرامی: جناب اسلم ملک درج ہے۔

اسلم ملک صاحب بہت سینئر لکھنے والے ہیں، یوں اس کج مج تحریر کا ان سے منسوب ہونا ایسا خوش آئند نہ ہوگا! اس عاجز/ راقم نے: ۲۳ مارچ ۲۰۲۳ء کو فیس بک کی وساطت سے اپنی یہ طالب علمانہ سی تحریر پڑھنے والوں کے سامنے پیش کی تھی؛ سو اس ضمن میں رکارڈ کی درستی کے لیے یہ وضاحت ناگزیر خیال کر رہا ہوں! اگر مناسب سمجھیں تو یہ خط ''چہارسو'' کی نئی اشاعت میں شامل کر لیجیے!!

جمیل احمد عدیل (لاہور)

گیت نگاری ایک معروف صنفِ شاعری ہے۔ گیت نگار کا ذہن رنگ تغزل سے فرار حاصل نہیں کرسکتا۔ بہت سے گیت نگار عشقِ رسول کی حرارت سے سرشار ہو کر تاجدارِ ختم نبوتؐ اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ اکرم کنجاہی نے اس کتاب میں بیکل اتساہی، آرزو لکھنوی، بہزاد لکھنوی، ساغر صدیقی، یزدانی جالندھری، شکیل بدایونی، صوفی تبسم، صہبا اختر، طفیل ہوشیارپوری، قتیل شفائی، کلیم عثمانی، مظفر وارثی، ماہر القادری، ناصر کاشمیری، ولی صاحب، شاعر صدیقی، حبیب جالب، حمایت علی شاعر، ظہیر کاشمیری، سرور بارہ بنکوی، فضل احمد کریم فضلی، منیر نیازی اور یونس ہمدم کے فلمی گیتوں میں نعتیہ اشعار لے کر انھیں ہمیشہ کے لیے محفوظ کرلیا ہے۔ زبان زدِ عام اشعار پڑھ کر قاری ماضی کے جھروکوں میں عشقِ رسولؐ سے سرشار کلام سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ 26 شعراء کرام کی شخصیت اور فکر وفن پر تبصرہ کرتے ہوئے اکرم کنجاہی نے اختتام پر اپنا نعتیہ شعر تحریر کرکے سرورِ کائناتؐ سے اپنی محبت کا اظہار کیا ہے۔ نثر کے حوالے سے اکرم کنجاہی نے نہایت سادہ اسلوب اختیار کیا ہے۔ برعظیم پاک وہند کے نامور گیت نگاروں کا نعتیہ کلام اس ایک کتاب میں جمع کردینا ایک بہت بڑا تحقیقی کام ہے۔ شعروادب سے اُن کی وابستگی سے کون انکار کرسکتا ہے۔ بنک میں نوٹوں کی جمع تفریق کرنے والے اکرم کنجاہی نے اشعار کی گنتی میں بھی کمال کردیا ہے۔ وہ خودنمائی کے جزیروں میں بھٹکنے کے بجائے احساس کی بنجر زمینوں کو محبت سے سیراب کررہے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب وتدوین کے پس منظر میں اُن کا عشقِ حقیقی کارفرما ہے۔ اُن کی تحریر میں سادگی اور لطف وبیان کے ساتھ ساتھ جولانی بھی موجود ہے۔

اکرم کنجاہی نے ''دبستانِ فلم کے نعت نگار'' کتاب لکھ کر بہت بڑا علمی وادبی کارنامہ انجام دیا ہے۔ انھوں نے پہلے تو فلموں میں معروف نعتوں پر بحث کی ہے اور اس کے بعد ہر نعت نگار کا تعارف اور اس کی گائی ہوئی فلموں کے نعتوں پر مباحث شامل ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ برعظیم پاک وہند میں فلم کا آغاز اور فلمی گیت نگاری کے آغاز وارتقا پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا ہے کہ آغاز میں گیت نگاری پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی لیکن پھر آغا حشر کاشمیری اور آرزو لکھنوی جیسے لوگ فلم انڈسٹری میں آئے تو انھوں نے گیت نگاری کو عروج بخشا اور اسی کے ساتھ انھوں نے فلموں کے لیے نعتیں بھی کہیں۔ اکرم کنجاہی نے اپنے عہد کے ممتاز شاعر آرزو اکبرآبادی کی نعت نگاری کا جائزہ لیا ہے مزید برآں ان کی معروف نعتوں کو بطور حوالہ پیش کیا۔ یہ کام انتہائی محنت اور عرق ریزی سے کیا گیا ہے۔ فلموں میں گائی جانے والی نعتوں اور ان کے شاعروں کے حوالے سے یہ ایک انتہائی اہم معلوماتی کتاب ہے۔ اسے ہم انسائیکلوپیڈیا بھی کہہ سکتے ہیں۔ کتاب میں فلمی نعت نگاروں کے حالات، ادبی خدمات اور فکر وفن کا بطور تذکرہ شامل ہے۔ اکرم کنجاہی کی کتاب ''دبستانِ فلم کے نعت نگار'' کے حوالے سے جمیل احمد عدیل مزید رقم طراز ہیں:

''کتاب کے مندرجات پڑھتے ہوئے فراخی کا احساس ہوتا ہے۔ اکرم کنجاہی نے ان غیر مسلم شاعروں، گلوکاروں اور موسیقاروں کا بے تعصبی سے ذکر کیا ہے جنھیں فروغ نعت کی سعادت میسر آئی۔ اسی طرح ترقی پسند شعرا کے خراجِ تحسین سے بھی چشم پوشی نہیں کی۔ گویا کتاب میں کسی روایتی مسلک کو تحت الشعور میں بھی فوقیت نہیں دی گئی۔ صرف اور صرف صداقت کی پیام برنعت سے والہانہ شیفتگی اور لگاؤ کو ترجیح بنایا ہے۔''

اکرم کنجاہی نے 26 عاشقانِ رسولؐ کا ایک گلدستہ ترتیب دے کر اس کی مہک سے ترنم کو عطر بیز کیا ہے۔ یہ کتاب ایک طرف دبستانِ فلم کے نعت نگاروں کے تذکرے کو سامنے لاتی ہے تو دوسری طرف فلم کی تاریخ اور ماضی کے جھروکوں میں جھانکتی ہے۔ قاری بڑا متجسس ہوکر اس کتاب کا مطالعہ کرتا ہے۔ بعض ایسی مقبول نعتیں سامنے آتی ہیں جن کے بارے میں پتہ چلتا ہے کہ یہ نعت کس شاعر نے کہی اور کس فلم کی زینت بنی نیز گلوکار کے فنی محاسن کو پیش کردیا ہے۔ یہی نہیں فلم کے نمایاں خدوخال کا ذکر بھی کردیا ہے۔ فلم سے دلچسپی رکھنے والوں کو فلم کے ریلز ہونے کا پتہ بھی چل سکتا ہے۔ فلم کے شوقین حضرات میں تاجدارِ کائناتؐ سے جذبۂ عشق اجاگر کرنے کا یہ خوبصورت انداز ہے۔ بہت سی نعتیں ایسی ہیں جو فلم دیکھتے دیکھتے قاری پر وجد طاری کردیتی ہیں۔ ''دبستانِ فلم کے نعت نگار'' ایک بہت عمدہ کتاب ہے جس میں شعرا کے تذکرے کے ساتھ ان کی فلم کے لیے نعتیہ خدمات کو سراہا گیا ہے۔

اکرم کنجاہی نے ''دبستانِ فلم کے نعت نگار'' میں انھوں نے ایسے 26 شعرا کا تذکرہ اور ان کے مجموعہ کلام میں شامل نعتوں پر مباحث کو شامل کیا ہے جنھوں نے فلموں کے لیے گیت نگاری کی ہو۔ ضروری نہیں کہ ان کی نعتیں فلموں میں شامل ہوں یا نہ ہوں۔ بعض شعرا کی نعتیں فلموں میں شامل بھی ہیں تاہم زیادہ تر شعرا کی تعداد ایسی ہے جنھوں نے فلموں کے لیے شاعری کی ہے۔ نعت کا شامل ہونا ضروری نہیں رکھا گیا۔ اکرم کنجاہی کے اس ادبی کارنامے کے تناظر میں ان تمام فلموں کا جائزہ لیا جاسکتا ہے جس میں نعت یا نعتیہ قوالیاں موجود ہیں۔ مثلاً فلم ''انسانیت'' میں موجود نعت کا بھی ذکر ہونا ازبس ضروری تھا۔ یہ تو ایک ہی مثال ہے بہت سی فلمیں ایسی ہیں جن میں نعت موجود ہے جو فلمی ناظرین کو نہ صرف پرنم کرتی ہیں بل کہ محبوب خداؐ سے والہانہ عقیدت کا جذبہ بھی اجاگر کرتی ہیں۔ نوآموز محققین کے لیے یہ کتاب جادۂ راہ ہے۔ 1947ء سے تاحال جاری ہونے والی فلموں میں نعتوں کو تلاش کیا جاسکتا ہے اور ان نعتوں کا جائزہ بھرپور انداز میں لینے کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر ہارون الرشید

اشاعت: ۲۰۲۳ء، قیمت: ۶۰۰ روپے، ناشر: نعت ریسرچ سنٹر، گلستان جوہر، کراچی

زندگی کے سامنے سامنے
ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی
احساس کی خوشبو
عالمی کلاسیک